حقائق و معارف کا ایک تذکرۂ جاوید

روزنامہ الجمعیۃ

آزاد نمبر

بیادگار

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

بہ آن گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند
ابوالکلام

رجسٹرڈ ڈی نمبر ۱۸۷
ٹیلیفون نمبر ۲۶۳۵۳

حقائق و معارف کا ایک تذکرۂ جمیلہ

روزنامہ الجمعیۃ

آزاد نمبر

بیادگار

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ

ایڈیٹر
محمد عثمان فارقلیط

معاون
مشہود احمد بہار

۴ دسمبر ۱۹۵۸ء مطابق ۲۲ جمادی الاول ۱۳۷۸ھ

قیمت فی کاپی ۲ دو روپے

عنوانات ایک نظر میں

ابواب و مقالات	لکھنے والے

شہنشاہِ علم و دانش ــــــــــ صفحہ ۳۷ تا صفحہ ۱۲۲

تاجدارِ فکر و قلم ــــــــــ صفحہ ۱۲۳ تا صفحہ ۱۴۰

حصۂ نظم کے لکھنے والے

انور صابری	بسمل سعیدی ٹونکی	آلم مظفر نگری	محشر اعظمی	✤ ✤ ✤
نسیم دہلوی	رحمت بلند شہری	حافظ محمد ابراہیم	گلزار دہلوی	یحییٰ اعظمی
عزیز بنارسی	مفتی بشیر احمد بشر	بصر ٹونکی	نضا کوثری	زحمت القادری
ثمر انصاری	حافظ سہارنپوری	خواجہ مقبول احمد	نظیر بنگلوری	✤ ✤ ✤

تاثراتِ غم

یحییٰ اعظمی

ٹھہر اے اضطرابِ دل کہ دردِ دل رقم کرلوں
ذرا اب خامۂ رنگیں کو وقفِ دردو غم کرلوں

کروں تالیف ان سے نسخۂ خونیں عقیدت کا
میں اپنے پارہ ہائے دل کو اب یک جا بہم کرلوں

بہار وگل کے نغمے جن کے تاروں سے نکلتے تھے
اسی سازِ قلم کو اب نواسنجِ الم کرلوں

نوائے دردوغم، سوزوگدازِ نالۂ پیہم
جو ممکن ہو صریرِ کلک میں ان سب کو ضم کرلوں

لہو کے احمریں قطروں سے بھرلوں شیشہ وساغر
شرابِ لالہ گوں سے آج خالی جامِ جم کرلوں

ترستی تھیں جو آنکھیں روئے اقدس کی زیارت کو
انھیں کو آج تھوڑی دیر تک اشکوں سے نم کرلوں

نہ تھم اے دیدۂ گریاں کہ اب جی بھر کے میں رولوں
ہو خوں اے دل کہ آج اچھی طرح اظہارِ غم کرلوں

ٹپک جائیں ہزاروں لعل وگوہر جیب ودامن پر
ہجومِ دردوغم سے سر اگر اک بار خم کرلوں

قیامت تک نہ آئے گا نظر یہ چہرۂ انور
ذرا ٹھہریں کہ آنکھوں میں اسے اب مرتسم کرلوں

منالاؤں امیرِ کاروانِ ملک وملت کو
کسی صورت سے طے گر منزلِ راہِ عدم کرلوں

کرے اب کون اس دردوالم میں سعیِ غم خواری
تری تمثال ہی کو اب شریکِ دردوغم کرلوں

رہیں گر تیرے دیدارِ قدم سے بے نصیب آنکھیں
فروغِ دیدۂ تر اب ترا نقشِ قدم کرلوں

کہاں تک آہ اپنی قسمتِ ناشاد کو روئیں
امامِ دین وملت حضرتِ آزاد کو روئیں

ایک
داعیٔ حق
ایک
مصلحِ دانا
اور
ایک
بے مثال رہنما

حکیم محمد اسمٰعیل پرنٹر اینڈ پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر الجمعیۃ
دہلی [illegible] سے شائع کیا
[illegible] سینٹرل الیکٹرک پریس دہلی میں طبع ہوا۔

آزاد نمبر

ادارہ

(۱)

الجمعیۃ کا آزاد نمبر جو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ
ی یادگار میں نکالا جارہا ہے آپ کے سامنے ہے۔ ہم اس نمبر کو
ر بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اس کا فیصلہ
کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے انتہائی کوشش کے بعد مرحوم کی زندگی
تعلق جو مواد فراہم کیا ہے وہ اس مجموعہ کی صورت میں آپ کے
کر دیا گیا ہے جہاں تک مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور ہمہ جہتی
ں کا تعلق ہے وہ غور و فکر اور تحقیقات کے بعد نفسیات کا
ظیم الشان معلم بن جاتی ہے' وہ علم جو عام طور پر سائکالوجی
دم سے مشہور رہا ہے اور جو انسان کے افکار و اعمال کے
ب اور محرکات کا پتہ لگاتا ہے اگر اُسے ایک طرف رکھ دیجئے
رحوم کی زندگی کو منظر عام پر لانے کے لئے ہمیں نفسیات میں
ے نئے اور مستقل باب کا اضافہ کرنا ہوگا آپ کی تحریریں اور
ریں آپکی اندرونی صلاحیتوں کی عکاسی کرنے سے قطعاً قاصر ہیں ا
تحریروں سے زیادہ بلند آپ کی شخصیت تھی' تحریروں میں
چھ موجود ہے وہ اس آفتاب منور کی چند شعاعیں ہیں جسے
نے آزاد کی شکل میں دیکھا ہے۔ بلاشبہ ہم آپ کی تحریروں
تقریروں کے ذریعہ دریائے علم کے چند قطروں تک رسائی
ل کرسکتے ہیں مگر اس بحر بے کراں کو اپنی آغوش میں نہیں لے
جس کی موجوں کا طول و عرض معلوم کرنا ہم جیسے لوگوں کا کام نہیں
آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں مختلف دوروں میں
رفاقت کا فخر حاصل ہوا جنھوں نے جیلوں میں ساتھ رہکر
کی شخصیت کا مطالعہ کیا یا جنہیں خوش قسمتی سے سوال و جواب
قع میسر آیا اور اُن کی ملاقاتیں ایک عرصہ تک جاری رہیں
نھوں نے کسی مسئلہ پر آپ کی رائے عالی دریافت کی اور
بار بھائی ـــ' سے مبتدا سے لیکر خبر کی آخری سرحدوں
ہم رکاب رہے ، کچھ ایسے بے تکلف بھی ہوں گے جو اُ دو
د دیدان مولانا کے اخلاق اور رشتہ داری کا ناجائز فائدہ اٹھانے
کر مولانا کے علمی تیوروں کو حافظہ کی کتاب میں ضبط نہ کرسکے
ں مولانا کے خیالات کے زیر و بم کو شناخت کرنے کی بہرے سے
بت ہی نہ تھی' خود راقم الحروف کو زندگی میں صرف ایک
مولانا نورالدین بہاری مرحوم کی حیثیت سے آئے اور مرحوم کی

بے تکلفانہ مگر علمی شان کو بے حجابانہ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی' اس رفاقت میں ایک گھنٹہ کے اندر جو کچھ دیکھا اُس کا دھندلا سا نقشہ دماغ کے گوشہ میں باقی رہ گیا ہے' کاش اس نقشہ کو صفحۂ قرطاس پر لانے کا سلیقہ ہوتا اور راقم الحروف اُس کی اہمیت کو بھی محسوس کرتا' کیا بتاؤں کہ ان چند لمحوں میں دماغ پر کیا گذری اور معلومات کے خزانہ میں کس قدر اضافہ ہوا' معلومات کو چھوڑکر بھی جو عظیم و جلیل شخصیت آنکھوں کے سامنے آئی وہ نہ غبار خاطر کی سطروں میں نظر آسکی اور نہ ترجمان القرآن کے ادب پاروں میں' ہم نے اسی سے اندازہ لگایا کہ مولانا کی شخصیت' اُن کے علمی کارناموں سے بالکل الگ چیز ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ آپ کی شخصیت ایک ایسا مجموعہ تھی جو صرف آپ کے قامت "کل" پر ہی راست آسکتی تھی اور آپ کی تحریریں اور علمی شہ پارے اُس کا صرف سایہ' جسے شخصیت کی عکاسی کہنا شاید شخصیت کو محدود سے محدود تر کردینے کے مرادف ہوگا۔

جن خوش قسمت لوگوں نے آپ کی شخصیت کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اوّل تو وہ محسوس ہی نہ کرسکے کہ یہ شخصیت' کتابی رنگ سے اپنا رنگ الگ رکھتی ہے' دوم اُنھوں نے ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اس کے نقش و نگار کو دماغ میں محفوظ کرلیتے اور فرصت کے وقت انہیں الفاظ کا جامہ پہناتے' یہ کام ہے بھی بہت مشکل۔ آزاد کی شخصیت میں اُتر کر اُس کے مزاج کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرلینا اور پھر اس کی نمود کے لئے الفاظ کا انتخاب کرنا خود ایک ایسی شخصیت کو چاہتا ہے جو ذہن اور مجتہدانہ بصیرت کے لحاظ سے ابوالکلام ثانی کا درجہ رکھتا ہو اور ابوالکلام کو ابوالکلام کی نظروں سے دیکھ سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرحوم بھی دوسروں کی طرح انسان ہی تھے' اگر انسانوں کا سمجھنا آسان ہے تو مرحوم کا سمجھنا بھی زیادہ مشکل نہیں لیکن ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر انسان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ شخصیت کا بھی مالک ہو' شخصیت کے اجزا جن عناصر سے ترکیب پاتے ہیں وہ صدیوں میں کسی خاص ملک میں خاص خاص تقاضوں کے تحت پیدا ہوتے ہیں' یہ جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ اس کا تصور انسانیت کے تصور کے ساتھ لازمی ہو اور اس تک ہر کسی کو رسائی بھی حاصل ہوجائے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ بھی دیگر اکابر مفسرین اور متکلمین کی

طرح انسان ہی تھے' مگر دوسرے سب کچھ ہوئے ابن تیمیہ نہ بن سکے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں اضافیت (RELATIVITY) کا کوئی شائبہ باقی نہ تھا۔ بہت سے لوگوں کی شخصیت کسی خاص ماحول کی مخلوق ہوتی ہے' کسی کی شخصیت میں سیاست کو دخل ہوتا ہے' کسی کی شخصیت قوم کے سہارے بنتی ہے' بعض دفعہ اتفاقات بھی شخصیتوں کو جنم دیتے ہیں لیکن مولانا آزاد کی شخصیت میں ان عوامل کو کوئی دخل نہ تھا وہ ایک مجرد شخصیت تھی جو تنہا آئی اور تنہا چلی گئی۔ قوم نے بالخصوص مسلمانوں نے کبھی اس شخصیت کو سنوارنے میں کبھی مدد نہیں کی مگر آزاد ان ہی میں پیدا ہوئے اور قوم کا سہارا لئے بغیر اپنے سانچے میں ڈھلے کر جزو سے "کل" اور فرد سے مجموعہ بنتے چلے گئے۔ مجرد شخصیت کے یہی معنی ہیں کہ کوئی شخص ہر اعتبار سے بے سہارا ہو اور وہ ذہنی عقلی اور فکری کائنات کے لئے خود سہارا بن جائے۔

(۲)

ایک دور وہ تھا جب مرحوم الہلال' البلاغ' لسان الصدق اور پیغام جیسے علمی مجلّوں کے صفحات پر جلوہ گر ہوئے اور اس دور کے علم و ادب کو مالا مال کیا' یہ دور خامہ طویل تھا اور اسی کی یادگاریں ہمارے پاس محفوظ بھی ہیں' دوسرا دور وہ تھا جس میں جوش و جذبات کے بجائے ایک دوسرا ہی رنگ اختیار کیا گیا تھا اور جس کی جھلک ترجمان القرآن اور غبار خاطر میں نظر آسکتی ہے' مگر یہ دور بہت مختصر ہے' یہ فاصلہ دو قدم مار کر بھی طے کیا جاسکتا ہے سوال یہ ہے کہ وہ مختصر کیوں رہا اور چند ادب پاروں کے بعد کیوں ختم ہوا؟ کہنا یہ ہے کہ علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے مولانا کا عہدۂ وزارت افسوسناک حد تک ہادم الادب ثابت ہوا ہے' اس دور میں آپ کوئی علمی کام انجام نہ دے سکے حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی فرض کیجئے اگر آپ وزارت کی ذمہ داریوں کا نہ اُٹھاتے اور اشہب قلم کو دوڑانے کی پوری فرصت اور آزادی نصیب ہوتی تو نہ معلوم آپ علم و ادب کی کون کون سی امانتیں قوم کے حوالے کرجاتے' ارباب کمال اور ادیب خود فیصلہ کریں کہ حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے بعد کائنات ادب پر کیسی اُوس پڑی اور آپ

فضل وکمال کے کیسے قیمتی خزانے اپنے سینے میں رکھ کر تشریف لے گئے، ہم سے پوچھو تو ترجمان القرآن کی تیسری جلد کا ظہور میں نہ آنا ملتِ اسلامیہ کا وہ عظیم نقصان ہے جس کی تلافی حد امکان سے باہر ہے ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور تفسیر سورۂ فاتحہ کو پڑھ کر اہل علم نے آنے والی جلدوں کا کسی حد تک اندازہ کیا، پھر اسی جلد میں نو پاروں کا ترجمہ اور مختصر تشریحی نوٹ سامنے آئے، تفسیری حواشی تو اپنی جگہ شاہکار تھے ہی، آیاتِ کریمہ کے ترجمے نے ارباب علم پر ایک نئی راہ کھول دی اور ترجمہ ہی کے ذریعہ قرآنی مطالب کا سمجھنا آسان ہو گیا، جن حضرات نے قدیم اور جدید تفسیروں اور اُن کے طویل مباحث کا مطالعہ کیا ہے انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ترجمہ کی روانی ہی میں فقہی اور کلامی نکتہ آفرینیوں کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور ترجمہ کے درمیان بریکٹ میں جو الفاظ وصل اور ترتیب کے لئے بڑھائے گئے ہیں خود انھوں نے طویل اور گہرے اختلافات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ جن مفسرین نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک مسئلہ پر صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں اور پھر بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکے خطِ وحدانی کے ذریعہ اُن کا قطعی فیصلہ کر دیا گیا، گویا تفسیری حواشی کو چھوڑ کر خود ترجمہ اتنا سلیس واضح اور مربوط ہے کہ قرآنی مطالب ذہن نشین ہوتے چلے جاتے ہیں اور بریکٹ کے الفاظ میں بڑی بڑی تفسیروں کے مباحث سمو دیئے گئے ہیں۔

تفسیر فاتحۃ الکتاب پر ایک نظر ڈالئے، قرآن کا فطری اسلوب اور طرز بیان سامنے آجائے گا۔ اس تفسیر میں جن مشکل مباحث اور مسائل پر قلم اُٹھایا گیا ہے اُس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ خیالات کا ساتھ دیتے چلے گئے ہیں، مولانا مرحوم کے ضمیر کو یہ شکایت کبھی نہ ہوئی ہوگی کہ جو کچھ اُن کے دل و دماغ میں ہے، الفاظ ان کا ساتھ نہیں دیتے یا الفاظ کے ذریعہ خیالات کی ترجمانی اور عکاسی نہیں ہوتی، نازک سے نازک خیالات کے لئے الفاظ کا انتخاب، پیرایۂ بیان کی افتاد اور اسلوب نگارش کی معنویت اتنی ہمہ گیر ہے کہ الفاظ اور خیالات میں کوئی فرق نہیں رہتا، اکثر مصنف جب الفاظ کے ذریعہ خیالات کی عکاسی کرتے ہیں تو عبارت کا سیاق اُس کی ہنسی اڑاتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا پیراہن خیالات کے لئے اپنی موزونیت کھو بیٹھا ہے اور مافی الضمیر کا کالبد اس میں نہیں سما سکا ہے مگر مرحوم کو یہ خداداد قدرت حاصل تھی کہ خیالات کو الفاظ کے شیشے میں اُتار سکیں اور دماغ کو جس معنویت کا ادراک ہوتا ہے اُسے سیاہی کے ذریعہ کاغذ پر لے آئیں خود پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مولانا کی تحریر میں مولانا ہی کے خیالات دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ مولانا ہی کے دماغ کی تجلیاں ہیں! شاید یہی وجہ ہے کہ خود مولانا نے الہلال اور تذکرہ کے اندازِ نگارش کو خیرباد کہا گر دنیا ہمیشہ اُسے لاجواب اور بے مثال سمجھے گی اور اس کی تازگی کو ہر زمانہ میں محسوس کرے گی اس کے بعد مولانا نے جو شگفتہ انداز اختیار کیا جو عام فہم بھی ہے اور ادب کا شاہکار بھی، وہ بھی رہتی دنیا تک یادگار رہے گا، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس کی شگفتگی اور ادبیت آئندہ کے ہر زمانہ میں آگے ہی آگے نظر آئے گی، طرز نگارش کے لئے یہ دونوں نمونے اس لئے زندہ اور مقبول ہیں کہ وہ خیالات کا حقیقی پیرہن ہیں، جن خیالات نے الہلال کے اندازِ نگارش کو اپنے لئے موزوں سمجھا ان ہی خیالات نے ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر کے طرز نگارش کو اپنا آشیانہ بنایا اور اسی کو اپنی نمود کے لئے منتخب کیا۔

(۳)

ہم یہاں ان مباحث کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے جن کی شاخیں زیر نظر نمبر کے ہر صفحہ پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ناظرین کرام ان حضرات کی مشکلات کا اندازہ لگائیں جنھوں نے مولانا مرحوم کو موضوع بحث بنا کر کچھ لکھا ہے، جس نے کچھ لکھا ہے اُس نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اُس کے خیالات اور الفاظ کا ہدیۂ عقیدت صحیح اور موزوں راہ سے مرحوم کی بارگاہ تک پہونچ جائے اور پیرایہ بیان میں کوئی ایسی سبکی پیدا نہ ہو جو مضمون کی ادبیت میں کسی قسم کا جھول اور ڈھیلا پن پیدا کر دے۔ جن حضرات نے اس نمبر کے لئے مضامین لکھ کر ہمارے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا ہے انھوں نے واقعی بڑی جرأت اور ہمت سے کام لیا ہے اور ان گوشوں پر سیر حاصل بحث کی ہے جن کو اُجاگر کرنا ایک سوانح نویس اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ان ہی مضامین کے بین السطور سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ اگر آزاد مرحوم کے بارے میں کوئی آزاد ادارہ مستقل طور پر کام کرے اور اس کام کے لئے دو چار سال تک اپنی زندگی وقف کر دے تو ایک نیا معیاری ادب اور تازگی بخش علم کلام ایک نئے اسلوب کے ساتھ منظر عام پر آ سکتا ہے جسے آنے والی نسلیں اپنے علم و ادب کا ماخذ بھی قرار دے سکتی ہیں، اور انھیں کام کرنے کا ایک سہارا بھی مل سکتا ہے۔

یہ بات بھی عجوبہ ہے کہ مولانا آزاد مرحوم کی علمی اور ادبی تحریروں نے بے شمار ادیب، ایڈیٹر، مصنف اور نثار پیدا کئے، جس نے مرحوم الہلال کا مطالعہ کیا اس نے ابوالکلام بننے کی کوشش بھی کی اور اپنے انداز تحریر کو الہلال کے انداز پر ڈھالنا چاہا مگر حیرت اس پر ہے کہ ابوالکلام تو کوئی نہ بن سکا، ایڈیٹر اور ادیب ہزاروں پیدا ہو گئے اور اُن میں سے بعض نے تو درجہ امتیاز بھی حاصل کیا ہوا یہ کہ شروع شروع میں لکھنے والوں نے الہلال کا چربہ اُتارنا چاہا، کوئی دو قدم چلا، کسی نے دس قدم طے کئے اور کسی کو بیس قدم چلنے کی توفیق ملی اور یہاں آکر اُن کی ساری ابوالکلامیت ختم ہو گئی مگر اس نقالی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ لکھتے لکھتے خود لکھنے والوں نے ایک نیا رنگ پیدا کیا اور ادب کی ایک نئی شاخ ظہور میں آ گئی، قاعدہ ہے کہ جب انسان مسلسل لکھتا ہے اور کسی جگہ ہار نہ مانے تو قدرت خود اُس کے اندازِ نگارش کو ایک نیا رنگ عطا کرتی ہے اور جب وہ اس انداز میں پختہ ہو جاتا ہے تو اس کا رنگ اُسے ممتاز بنا دیتا ہے، جن حضرات نے مولانا آزاد کے طرز تحریر کو اُڑانا چاہا اُن کی محنت اکارت نہیں گئی وہ ابوالکلام تو نہ بن سکے مگر ایک اچھے انشا پرداز، ایک بلند پایہ ادیب اور ایک ممتاز ایڈیٹر ضرور بن گئے لیکن اگر ان ہی حضرات کو تکلیف دی جائے کہ وہ مرحوم کی ہمہ جہتی شخصیت پر اپنے قلم کو حرکت دیں تو انھیں اس کی تعمیل کے لئے سو بار سوچنا ہوگا اور شاید وہ اس کی جرأت نہ کر سکیں گے کہ دعوے کے ساتھ آزاد کی شخصیت اور اُن کی فکری صلاحیتوں پر کوئی قابل وثوق مواد پیش کر سکیں اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ لکھنے والوں کی راہ میں کیا کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں اور جو اس کی جرأت کرتا ہے وہ کتنا بڑا کام انجام دیتا ہے۔

(۴)

سرسید مرحوم خوش قسمت تھے کہ انھیں حالی جیسا سوانح نگار ملا جس نے حیاتِ جاوید لکھ کر بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو حیات جاوید نہیں بخشی بلکہ خود کو زندہ جاوید بنا دیا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات شبلی لکھنے اور شائع کرنے کا فخر حاصل کیا۔ ان دو کتابوں کا نام ہم نے اس لئے لیا ہے کہ ان کے مصنفوں میں سرسید اور شبلی کے لئے بے پناہ عقیدت تھی مگر جب وہ کتاب لکھنے بیٹھے تو انھوں نے جذبات عقیدت کو دور سے سلام کیا اور تجزیہ و تحلیل کی راہ پر آ لگے؛ بے پناہ عقیدت کے بعد انسان اپنے محبوب کے لئے سب کچھ لکھ سکتا ہے مگر وہ اچھا، بلند پایہ اور معیاری سوانح نگار نہیں بن سکتا، عقیدت کے جوش میں انسان اپنے آپ کو سامنے لے آتا ہے حالانکہ اُس نے دوسروں کو اُن کی اصل شکل میں پیش کرنے کا ذمہ لیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مولانا آزاد کی بائیوگرافی لکھنے کی سعادت ان لوگوں کو حاصل ہو جو قلم پکڑتے ہی جذبات عقیدت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور واقعات کا مقابلہ کرتے ہوئے سیرت نگاری کا فرض انجام دیں، اگر کسی شخص کی سیرت بے پناہ عقیدت کے ساتھ لکھی جائے گی تو اس میں لکھنے والے کا رنگ زیادہ اُجاگر ہوگا، مزہ اس میں ہے کہ حیات آزاد کا لکھنے والا آزاد کے ہر رنگ کو اُبھارے اور اس رنگ میں اپنے رنگ کی کوئی جھلک نہ آنے دے، ہر واقعہ، ہر کلیہ، ہر جزیہ صرف آزاد کی ملکیت ہو اور لکھنے والا صرف اس کی ایک

فہرست تحلیل و تجزیہ کے ساتھ پیش کر دے گویا جو کام آئندہ حیات آزاد کے متعلق ہونے والا ہے ہم نے اس کی نزاکتوں کی طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے، ہمارا مطلب اس خطرہ سے آگاہ کرنا ہے جو ہر سوانح نگار کو اس کی راہ میں پیش آسکتا ہے۔

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، کچھ بڑے ہوئے تو کلکتہ آئے، امرتسر پہونچے، بمبئی میں قیام کیا، رانچی میں نظر بند ہوئے، دہلی کو اپنے قدوم سے شرف بخشا اور آخر میں مرکزی حکومت میں وزارت کی کرسی پر متمکن ہوئے، خوشا وہ شہر جسے مولانا کے قیام سے شرف حاصل ہوا اور مبارک وہ قیام گاہیں جن میں آزاد نے راتیں بسر کیں، امرتسر اور قصور کا ذکر تو اب بے کار ہے مگر کلکتہ، رانچی، بمبئی اور دہلی رہ رہ کر یاد آتے ہیں اور یہ یاد آوری کوئی اتفاقی بات نہیں اور نہ عقیدت سے اس کا کوئی تعلق، ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان شہروں کو مولانا آزاد مرحوم کے نام سے یادگار بنا دینا چاہئے، ان میں مرحوم کی شایان شان ایسی علمی یادگاریں قائم ہوں جو حیات جاوید یا حیات آزاد سے زیادہ کام دے سکیں اور جو ارباب علم و ادب کا مرکز قرار پائیں کلکتہ مرحوم کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہاں کوئی علمی یادگار قائم ہو، جسے صاحب تذکرہ کی شہری زندگی کا نمونہ قرار دیا جا سکے، بمبئی بھی اس لائق ہے کہ وہاں آزاد کے تذکار و یادآوری کی کوئی شاندار بنیاد پڑے کیونکہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آزاد مرحوم نے بمبئی کے قیام میں چوپاٹی پر سمندر کے کنارے عیسائی مشنریوں سے تقریری مناظرے کئے، نصرانیت پر اسلام کی حجت تمام کی ناقوس پر اذان کو غلبہ دلایا، صلیب پر ہلال کو آویزاں کیا اور کلیسا پر مسجد کی اہمیت واضح کی۔ افسوس ہے کہ اس دور کے حالات تاریکی میں ہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ جب پادریوں کو آزاد کی گرفت سے پناہ نہ مل سکی تو انھوں نے گورنر سے فریاد کی اور گورنر نے نصرانی بیڑہ کی حفاظت کے لئے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیا، نہ معلوم اس کے بعد مولانا آزاد کے مقابلہ کی کیا صورت رہی اور کن حالات میں آپ نے بمبئی کو خیرباد کہا، مگر یہ واقعہ بمبئی کے زندہ دل اور علم پرور مسلمانوں کو مولانا آزاد کی یادگار پر توجہ دلاتا ہے، مسلمانان بمبئی کو اس دعوت پر ضرور لبیک کہنی چاہیئے۔

رانچی کے بارے میں دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ وہاں مولانا کے نام پر کوئی بیت الحکمۃ اور دار التصنیف قائم ہو اور اُسے علمی اعتبار سے سدا بہار گلشن کی شکل دیجائے، اب دہلی کا نمبر ہے مولانا کے آخری ایام دیار غالب کی اس سرزمین میں بسر ہوئے ہیں، مولانا مرحوم الہلال کے دوسرے دور میں دریا گنج دہلی میں فروکش ہوئے، وہیں پریس قائم کیا اور کتب خانے کے لئے بھی وہیں جگہ نکالی، راقم الحروف جب کبھی وہاں سے گذرا مرحوم کی قیام گاہ پر ایک نظر ڈال کر عبرت کے ان مول موتی چن لئے، مدتوں سے یہ اتفاق بھی اتفاق کی نذر ہوا اور آزادی کے بعد اس قیام گاہ پر نظر ڈالنے کی نوبت نہ آسکی، تاہم مولانا مرحوم نے وزارت کے بعد نئی دہلی میں قیام فرمایا تا آنکہ وہیں سے جنازہ اُٹھا اور جامع مسجد کے زیر سایہ آخری رسوم ادا کر دی گئیں، دہلی والوں کا فرض ہے کہ وہ دہلی کو مرحوم کی یادگار سے محروم نہ رکھیں گے، ایک طرف ان کا مزار ہو اور دوسری طرف اس آفتاب منور کی کوئی شاندار اور دائمی یادگار قائم کی جائے، اگر دہلی والوں نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا تو یہ اُن کا اپنا ہی نقصان ہوگا، آزاد تو پھر بھی سینوں اور سفینوں میں محفوظ رہیں گے۔

(۵)

آج دنیا میں سب کچھ ہے مگر کیرکٹر (سیرت) نہیں ہے، مگر مولانا آزاد مجسم کیرکٹر تھے، آپ کی سیرت میں اس قدر پختگی تھی کہ اس کی مثال ہندوستان کی کسی شخصیت میں نہیں ملتی، ہمارے دل میں بہت سے لوگوں کی عزت ہے، ہماری گردن بہت سی شخصیتوں کے سامنے احترام کے لئے جھکتی ہے، مگر جس چیز کا نام کیرکٹر ہے وہ صرف آزاد ہی کی ذات میں اُبلتا دیکھا گیا ہے، دشمنوں نے آپکے نظریات سے اختلاف کیا، آپ کے علم و فضل پر ناک بھوں چڑھائی آپ کی خدمات سے آنکھیں بند کیں مگر کسی الد الخصام کو بھی آپ کے کیرکٹر سے انکار کی جرأت نہ ہو سکی، سیاست میں، مذہب میں، سوشل زندگی میں، زندگی کے نہاں و خارجی تعلقات میں کیرکٹر ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے، تحریک خلافت کے بعد بدقسمتی سے جس طریق پر ہندو مسلم سوال اُٹھا اور حوادث کشمیر سے راس کماری تک پیش آئے اس میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کے قدم نہ ڈگمگائے ہوں ہم کس کس کا نام لیں؟ اور نام لینے سے کیا حاصل؟ صرف ایک آزاد کی شخصیت تھی جو ہمالیہ کی طرح اپنے عزیمت پر جمی رہی، آندھیاں چلیں، بارشیں برسیں، بجلیاں کڑکیں زلزلے آئے مگر یہ کوہ پیکر اپنے مقام سے نہ ہل سکا، یہ داستان بہت طویل ہے، مگر اس کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ کیرکٹر کی تربیت کے لئے مولانا آزاد سے بہتر ہندوستان میں کوئی دوسری شخصیت دستیاب نہیں ہو سکتی، اوپر سے لیکر نیچے تک پورے ملک کو سیرت سازی کی ضرورت ہے اور اس معاملہ میں آزاد ہی کو اپنا معلم اور اتالیق بنایا جا سکتا ہے، یہ کام مشترک ہونا چاہئے، حکومت بھی اس پر توجہ دے اور ہندو مسلمان بھی اس کی اہمیت محسوس کریں اور خاص طور پر مسلمان مرحوم کے اس کردار کو انسانی نفسیات کے اُفق پر آفتاب بنا کر چمکائیں، اگر سیرت سازی کا یہ کام انجام پا گیا یا اسے مرکز بحث بنایا گیا تو یہ اتنا بڑا کام ہوگا جسے کیرکٹر کی دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی

(۶)

تو یہ تو یہ مولانا آزاد نے نفاق، موقع پرستی، خوشامد، چاپلوسی، احساس کمتری، مایوسی اور خوف سے کبھی موافقت نہیں کی، وہ خود جماعت تھے اس لئے کسی جماعت میں فٹ نہ بیٹھ سکے، ہاں مسلمانان ہند کی ایک نمائندہ جماعت جمعیۃ علماء ہند تھی جسے آپ کی سربراہی کا شرف ہمیشہ حاصل رہا، وہ کیا چیز تھی جس نے آزاد کو دم واپسیں تک جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رکھا؟ کیا یہ موقع پرستی تھی؟ دکھاوا تھا؟ خوف اور لالچ تھا؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی تو یاد رکھئے کہ جمعیۃ علماء ہند، مولانا آزاد کی سب سے بڑی یادگار ہے، اگر اس جماعت میں کوئی دراڑ ہوتی یا اسکا وجود ملت کے مفاد کے منافی ہوتا تو کیا مرحوم ایک ہفتہ بھی اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہ سکتے تھے؟ کیا وہ اس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت منظور فرماتے؟ جمعیۃ علماء کی تاسیس سے لیکر عمر شریف کے آخری لمحات تک مرحوم جمعیۃ علماء کو اپنے سینہ سے جُدا نہ کر سکے، ورکنگ کمیٹی کے ارکان گواہی دیں گے کہ مرحوم نے اس کے ہر اجلاس کو لبیک کہا اور گلی قاسم جان کے مرکزی دفتر میں آمد و رفت برابر جاری رکھی، کون کہہ سکتا ہے کہ مرحوم نے جمعیۃ علماء سے ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدگی کا تصور کیا؟ اس تعلق خاطر کے بعد ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جو شخص مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے محبت رکھتا ہے، ضروری ہے کہ اسے جمعیۃ علماء سے بھی محبت ہو جمعیۃ علماء کی محبت، مولانا آزاد کی محبت کا بیرومیٹر ہے، آج ہر شخص کو اس پیمانہ سے ناپا جائے گا، اس دورنگی کی اجازت نہ دی جائے گی کہ جمعیۃ علماء سے کدورت ہو اور آزاد مرحوم سے محبت، ایسی محبت جھوٹی ہوگی، آزاد کو جمعیۃ علماء سے محبت تھی، جرأت ہے تو کوئی کہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے؟ اب اگر کوئی آزاد سے عقیدت اور محبت کا دم بھرتا ہے تو اُسے جمعیۃ علماء کا وزن بھی محسوس کرنا ہوگا، صاف لفظوں میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جمعیۃ علماء ہند، مولانا آزاد کی ایک زندہ شاندار اور قابل فخر یادگار ہے، اگر آزاد کی یادگاریں ضروری ہیں تو سب سے پہلے اس یادگار پر توجہ دینی ہوگی جسے آزاد کی سربراہی حاصل ہوئی اور جس کے کارناموں اور کارگزاریوں پر صاحب تذکرہ نے تصدیق کی مہر لگائی، ناممکن ہے کہ آزاد کا نام آئے اور جمعیۃ علمائے ہند کو فراموش کر دیا جائے، آپ نے دیکھا کہ آزاد کو آخر دم تک جمعیۃ علماء سے کیا تعلق رہا؟ پھر کیا یہ تعلق صرف مرحوم کی ذات تک محدود رہنا چاہیئے؟

آزاد کے تعلق سے اُن کے رشتہ داروں کا بھی احترام کیا جاتا رہا ہم ان شہروں کو کبھی نہیں بھلا سکتے جن میں مرحوم کا عارضی یا مستقل قیام رہا، پھر اس ادارہ کو کس طرح بھلایا جا سکتا ہے جو ہمیشہ اُن کی مذہبی قیادت کا مرکز رہا اور جسے مرحوم نے اپنے افکار سے مالا مال کیا؟ مولانا آزاد اگر روح ہیں تو جمعیۃ علماء ہند اُن کا جسد ہے اور آج اس جسد کی حفاظت کرنا ان مسلمانوں کا اولین فرض ہے جو مرحوم کی روح کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور اُن کی کوئی یادگار قائم کرنے کے لئے بے چین ہیں، اگر مرحوم کی زندگی میں جمعیۃ علماء کو اہمیت حاصل رہی تو زندگی کے بعد اُس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

(۷)

خاتمہ کلام پر ہم اُن تمام اربابِ قلم اور مفکرین کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اس نمبر کے نکالنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہماری درخواست پر یا از خود مضامین لکھ کر بھیجے ہمارے لئے یہ تعاون بڑا قیمتی ہے اگر اس نمبر کو قبولیت کا شرف حاصل ہو تو یہ ہمارے مخلصین اور قلمی معاونین کی کاوشوں کا نتیجہ ہوگا اور انشاء اللہ اُن کے شہ پارے اُن کے نام کو ہمیشہ روشن رکھیں گے۔

ناسپاسی ہوگی اگر ہم جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ مولانا انیس الحسن صاحب ہاشمی کا خلوص قلب سے شکریہ ادا نہ کریں اگر موصوف کی سرگرمیاں اس نمبر کے لئے وقف نہ ہو جاتیں تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کہ اس کی اشاعت ہرگز معرض وجود میں نہ آتی، اگرچہ گھر کی بات گھر ہی میں رہنی چاہیئے لیکن اس نمبر کی تیاری جن مرحلوں سے گذری ہے اس کا حال کچھ ہم ہی کو معلوم ہے، یہ مرحلے کبھی طے نہ ہوتے اگر موصوف اپنی انتھک کوششوں کو بروئے کار نہ لاتے۔ ان مرحلوں میں سب سے بڑا مرحلہ کاغذ کی فراہمی کا تھا جو موصوف کی ان تھک مساعی کے بعد ہی طے ہو سکا، جن کاتبوں نے اس نمبر کی کتابت میں جانکاہی کا ثبوت دیا ہے اور اپنی قلم کاریوں سے کتابت کے حسن کو دوبالا کیا ہے وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، امید ہے کہ اُن کا اجر ضائع نہیں ہوگا، الجمعیۃ پریس کے کارکنان نے نمبر کی طباعت کو جس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اس کی داد پڑھنے والے ہی دے سکتے ہیں اور یہ سب حضرات بھی ہمارے سچے شکریہ کے مستحق ہیں۔ خدا تعالیٰ ان سب کی مساعی کو بہتر عمل قرار دے اور یہ سب قوم اور ملک اور ملت کے کام آتے رہیں۔

لوحِ مزارِ تاریخی

کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ

١٩٥٨ء

[illegible] ١٣٧٧ھ

[illegible] ١٩٥٨ء

قبرِ خدادوست

١٣٧٧ھ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند رضی اللہ المہیمن عنہ

سنہ ١٣٧٧ھ

ابرِ سلامتی بر خاکش مدام باد

١٩٥٨ء

صد دریغا اے امام الہند میرِ قافلہ

١٩٥٨ء

اے امام الہند جرأت، تاجدارِ حریت	کائناتِ نیک طینت، رہبرِ ہندوستاں
سمـ ٢٠١٤ بکرمی	سمـ ٢٠١٤ بکرمی
اوجِ ایواں اے دبیرِ عیش دیدہ صد دریغ	بے تکلف خاک میں جا کر ہوا تو آب نہاں
سمـ ٢٠١٤ بکرمی	سمـ ٢٠١٤ بکرمی

ھدیۃ محمد ادریس نسیم دہلوی تاریخ گو کان اللہ لہٗ

سمـ ٢٠١٤ بکرمی

مہد سے لحد تک

امام الہند اپنی زندگی کے آئینہ میں

(مرتبہ انیس الحسن)

شیریں تراز حکایت ما نیست قصۂ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

مولانا آزاد مرحوم کا حسب و نسب شیخ جمال الدین دہلوی تک مشہور و معروف ہے جو مغل تاجدار اکبر کے دور میں ایک نامور عالم و صوفی شمار ہوتے تھے۔

مولانا مرحوم کے والد ماجد "مولانا خیرالدین احمد" بھی اپنے وقت کے جیّد عالم اور شیخ طریقت تھے ۱۸۵۷ء میں برطانوی اقتدار کے جبر و تشدد سے مجبور ہو کر انھوں نے ہجرت کی اور مکہ معظمہ کے دامن امن میں پناہ لی۔ ترکی کے حاکم وقت سلطان عبدالحمید کو مولانا خیرالدین کی ہجرت کا علم ہوا تو قسطنطنیہ بلا بھیجا۔ آپ نے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا اور پھر حجاز واپس آ گئے۔ مدینہ منورہ کے مفتی اکبر الشیخ محمد طاہر کی بھانجی سے آپ کا عقد ازدواج ہوا۔ اور ان ہی کے بطن سے مولانا آزاد رح نومبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے دس سال کی عمر تک مکہ معظمہ ہی میں قیام رہا اور ابتدائی دور طفولیت بیت اللہ الحرام کے سایہ رحمت میں گزرا۔ بحالت مجبوری کے مسلسل اصرار پر ۱۸۹۸ء میں مولانا خیرالدین اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔

مولانا خیرالدین مرحوم کے مریدین و متوسلین کا سلسلہ بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ و بمبئی بلکہ سیلون و افریقہ تک وسیع تھا، وہ قدیم ذوق و فکر کے ایک جلیل القدر عالم اور صوفی بزرگ تھے۔ مغربیت اور مغربی تہذیب سے ان کو نفرت تھی۔ مولانا آزاد کی تمام تر ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت والد مرحوم اور والدہ مرحومہ کے ہاتھوں خالص مشرقی اور اسلامی ماحول میں تکمیل کو پہونچی۔

مولانا خیرالدین مرحوم انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ اس لئے ان کے جیتے جی مولانا آزاد انگریزی تعلیم نہ پا سکے۔ البتہ ان کی وفات کے بعد شوق علم اور ذوق طلب سے مجبور ہو کر انھوں نے کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر محض اپنی ذہانت و مطالعے سے نہ صرف انگریزی زبان سیکھی بلکہ جدید علوم و فنون میں کامل دستگاہ بھی حاصل کی۔

اپنی پیدائش، بچپن، تعلیم و تربیت، افتادِ مزاج، شوق علم اور دوسرے کوائف و خصائل پر خود مولانا مرحوم نے بلا کم و کاست اپنی بعض تحریروں میں جو اشارے کئے ہیں ان سے بہتر کوئی شہادت نہیں ہو سکتی۔ ذیل میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

پیدائش اور وطن

"یہ غریب الدیار عہد ناآشنائے عصر کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا۔ والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری تاریخ کا استخراج کیا تھا۔

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد"

سارا کارِ فیروز بختی؛ جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں، کل فیصل ہونے والا ہے۔ اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے اور جواں بختی وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے اگر وہاں فوز و فیروزی کی جنت نعیم اور فوز عظیم کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی تو پھر وقت بخت ارجمند ہے اور طالع طالع بلند ہے۔

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ مگر وطن مادری سرزمین مقدس حجاز ہے، دارالہجرۃ سید الکونین و شہرستان

نبوت و وحی ہے۔ قبلہ عبادت گزاران عشق و کعبہ نیاز مندان شوق۔

مولد و منشا طفولیت "وادیٔ غیر ذی زرع" عند بیت اللہ المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و کرامۃً متصل باب السلام۔"

خاندانی شرافت و کرامت

"میں نے ان گودوں میں پرورش پائی ہے جن کا فخر و شرف جاہ دنیوی پر نہیں بلکہ فقر و مسکینی پر رہا ہے۔ استغنا اپنا خاندانی ورثہ ہے۔ میں ابھی گودوں میں پرورش ہی پا رہا تھا کہ یہ آواز پانچ وقت میرے کانوں میں آتی تھی (اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین"

عہد طفلی اور علمی ذوق و لگن

"لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں۔ مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں، کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھئے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بنچ بھی بچھی ہوئی ہے، معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں؟ میں جب سیر کے لئے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔

والد مرحوم کے خادم خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے، وہ باہر ٹہلتے رہتے تھے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟"

یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اسی طرح کے کئی جھنڈ تھے، ایک جھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا اور شاید اب بھی ہو، میں نے چن لیا تھا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جانا اور شام تک اس کے اندر گھسا رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے

عالم بے خبری طرفہ بہشتے بود است
حیف صد حیف کہ از دورِ خبردار شدیم

اگرچہ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رُخ ہی نہیں کرتی تھی۔

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ نفس بد خو نہ کند بہ کس نگاہے

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے۔ مگر فرماتے یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دیگا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا ـ ـ ـ"

بچپن ہی سے سحر خیزی کی عادت

"والد مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اٹھنا زندگی میں سعادت کی پہلی

نت نی ہے۔ کم عمری ہی میں والد مرحوم کی یہ مشفقانہ نصیحت زندگی بھر کے لئے ذہن و شعور کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ میری عمر دس گیارہ برس کی ہی ہوگی۔ بچپن کی نیند سر پر سوار رہا کرتی تھی۔ مگر میں اس سے ڈرتا تھا۔ صبح سویرے اٹھتا، شمع دان روشن کرکے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی دن بھر پشیمان سا رہتا۔"

سحر خیزی کے فوائد

"یہ وقت ہمیشہ میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے۔ بالخصوص قید و بند کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں، ایک اور ہی عالم پیدا کردیتی ہیں۔"

"صبح چار بجے کے وقت گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا حال ہی عجیب ہے۔ قیام کی حالت ہو یا سفر کی خوشی کی کلفتیں ہوں، یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں یا دل و دماغ کی افسردگیاں کوئی حالت ہو، لیکن اس وقت کی مسیحائیاں خستگان بستر الم سے کبھی تغافل نہیں کرسکتیں؎

فیضے عجبے یافتنم از صبح ببیند
این بادۂ روشن روے خانہ نہ باشد"

طبیعت کا انوکھا انداز

اور دنیوی رسوم و علائق سے بے گانگی

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا، اس لئے خلقت کا ہجوم و احترام جو آج کل سیاسی عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے عقیدت مندوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے، اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لئے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں بر خود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا نہ چھوٹنے والا روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصے میں بھی آئے ہوں۔ کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لئے خود اپنے کمین میں بیٹھنا آسان نہیں ہے۔

لیکن میں اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جارہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا، میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کیاب جنس ڈھونڈتے ہیں اور ملتی نہیں، مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدرشناس نہ ہو سکا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!"

آپ نے اندازہ فرمایا! مولانا آزاد کی افتاد ذہن و مزاج شروع دن سے مافوق العادت اور بالکل انوکھی رہی۔ بے مثال ذہانت اور قوت حافظہ کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ نے ان کو علمی ذوق و شوق بھی بے پناہ عطا فرمایا تھا۔ ان کے اس ذوق و شوق کے مشاہدے بچپن ہی سے ہونے لگے تھے، صرف چودہ سال کی عمر میں ہی انھوں نے دینیات، عربی و فارسی علوم و فنون کا درس نظامی (درس سالہ نصاب) مکمل کرلیا تھا۔ اور علم و ادب کی بازدید میں ایک طالب کمال کی حیثیت سے نکل گئے تھے۔

ذوق شعر و سخن

اسی عمر میں ان کی خدا داد صلاحیتوں نے ان کو شعر و شاعری کی طرف بھی متوجہ کیا، شعر و شاعری کی طرف ان کا رجحان ہوا۔ اور کچھ عرصہ اس کی جلوہ طرازیاں جاری رہیں۔

نہ صرف اردو بلکہ فارسی نظمیں بھی بہت کم نہیں کہیں۔ مگر شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھا۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر وہ مفکر، ادیب اور خطیب ہونے کے علاوہ ایک زبردست شاعر بھی ہوتے۔ ان کی طبیعت شاعرانہ ضرور تھی۔ اساتذہ کے کلام عربی و فارسی و اردو تک ان کی رسائی بے بدل تھی

اعلیٰ درجہ کے مناسب اشعار ان کی نوک زبان پر تھے۔ مولانا کا محبوب مشغلہ صحافت، خطابت اور سیاست تھا۔ اس لئے شعر و شاعری پس پشت پڑگئی۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ "شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی کی وجہ سے ہوا۔ ان کی بہن میرے یہاں ملازمہ تھیں، اس تعلق سے ان کا آنا جانا ہوا۔ یہ شاعر بھی تھے۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اسی زمانہ میں کلکتہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا، اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ نواب نامی ایک رئیس نے کیا تھا...... تین طرحیں دی گئی تھیں اور تین دن تک مشاعرے ہوتے رہے۔ باہر سے جلال بھی آئے تھے۔ عبدالواحد خاں نے اپنی غزلیں سنائیں۔ مجھ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا...... خود بھی کہنے کا شوق ہوا۔ اس کا شوق اور کاوش بڑھتی گئی، بہت سے اشعار کہے"

اپنی ایک اور تحریر میں فرماتے ہیں "خود میں نے اس عمر میں شعر و شاعری شروع کردی تھی میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا۔ غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنچ بہادر" نکالا کرتے تھے، ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا، اور کلکتہ میں بعض شعراء اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی؎

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعران مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے ہیں۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جاں کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت انھیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کردیا تھا۔ آج بھی جبکہ ۲۶ برس گزر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کررہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب ارمغان فرخ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالہ میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔ اس زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نواب شاہ خاں شوخ رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے، انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے، جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے، چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلائی، یاد نہ ہو شاد نہ ہو۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند شعر لکھ دیئے۔

کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہوا

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔ اس وقت سوچتا ہوں، تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

اس کے بعد یہ خبط اور بڑھا اور خیال ہوا کہ ایک گلدستہ نکالنا چاہئے، چنانچہ نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا، میری عمر اس وقت تیرہ برس سے کسی طرح بھی زیادہ نہ تھی۔ پھر اسی زمانہ میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ مخزن نیا نیا نکلا تھا، اس میں چند تحریریں بھیجیں۔

لکھنؤ سے نوبت رائے نظر، "خدنگ نظر" نکالتے تھے، اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا، انھیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کریں اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لی۔

اسی زمانہ میں مولوی احمد حسین مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین ترسیل ہونے لگے۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں ایک رسالہ خود نکالنا چاہئے۔ چنانچہ لسان الصدق جاری کیا، یہ تمام معاملات ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے فراغت اور شوقِ خطابت

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہوگیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تاکہ جو کتابیں پڑھی جاچکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں اس لئے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کرکے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرادیا ساتھ ہی قندھار کے ایک خان صاحب تھے جن کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔ اس زمانہ میں تقریر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔

سب سے پہلی تقریر

سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۳ء میں کی اس وقت عمر پندرہ سال تک پہونچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

ایک تقریب میں جہاں اور کئی ارباب فضل و کمال رونق افروز تھے۔ مولانا نے آواز دی۔ گلاس میں پانی لانا۔ اس آواز پر کسی ملازم نے نہیں، بلکہ ایک سفید ریش بزرگ نے لبیک کہا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس لے آئے۔ مولانا نے ارتجالاً یہ مصرعہ کہا ؏

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا

اس تقریب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی شریک تھے۔ انھوں نے یہ مصرع سنا تو فوراً گرہ لگائی ؏

میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ رباعی اربابِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کرچکی ہے ؎

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی — اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے نے رنگ بدلا ایسا — میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

مولانا کی ایک غزل کے چند شعر ان کے دورِ شاعری کی یاد آج بھی تازہ کررہے ہیں ؎

کیوں اسیر گیسوئے خم دار قاتل ہوگیا — ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا
کوئی نالاں، کوئی گریاں کوئی بسمل ہوگیا — اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہوگیا
انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں — نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہوگیا
اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے — دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہوگیا
قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں — ہر بگولا دشت کا لیلےٰ کا محمل ہوگیا

یہ بھی قیدی ہوگیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیر دل میں تیرے آزاد شامل ہوگیا

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ مشقِ سخن گوئی لڑکپن کی شوخیوں کا نچوڑ ہے، اگر کہیں شباب کی سرمستیاں بھی شاعری کی نذر ہوجاتیں تو مولانا یقیناً ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے نام و مقام پاتے۔

زندگی میں آخری شعر جو مولانا مرحوم نے قلعۂ احمد نگر کی اسارت میں کہا، یہ ہے!

مجنوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی — سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

عہدِ شباب کی صبحِ اولین

آنکھیں کھلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہوچکی تھی اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ جس طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا، دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح ذیب کے لئے نہیں تو سوز و تپش کی دوپہر ہو، نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ شہرستان امید و تماشاخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدۂ و دل کی کام جوئیوں کے لئے بنا ہے اور گویا گوشہ گوشہ ذرہ ذرہ ہماری جوستائیوں کے لئے چشم براہ ہے جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی، معلوم نہیں اپنی ہی گنبد اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی یا گرفتارانِ طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے خود سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے۔

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے، چند دن شباب نے ہاتھ پکڑا۔ اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھائی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصد دیکھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا، راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا۔

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آبادِ الفت و پرستش نظر آیا جس میں سرمندوں اور برتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مسندِ جبینِ نیاز کا طالب، ہر مورتی دل فروشی و جاں بازی کے لئے وبالِ ہوش۔ ہر جلوہ برقِ تمکین و اختیار، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار۔ الفراق اے صبر و تمکیں! الوداع اے عقل و ہوش۔

جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجیے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل ایک تھا، مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے نظر ایک تھی، مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر او اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یکلخت کور رہو۔ برق نے بھی چشمک کی۔ ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا۔ لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہوجاتی وہ برابر بڑھتی ہی گئی

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا الحاد ہے۔ لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارساز ما بفکر کار ما — فکر ما در کار ما آزار ما

غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا یہ حال تھا، لیکن ادھر کار فرمائے غیب کا فیصلہ کچھ اور ہی ہوچکا تھا۔ ناگہاں جاذبہ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا۔ اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہونچا دیا، آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں، سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی، جو آناً فاناً نمودار ہوئی، چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفہ نے زیادہ طول نہ کھینچا ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کرکے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ، کوئی مقام باقی نہ چھوڑا، نہ مجنوں سے ہم عنانی کا سودا ہے، نہ فرہاد سے مقابلہ کا دعویٰ۔ اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی، اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی، اسی مایوسی سے امید کا دروازہ کھلا۔ جو تاریکی اپنی سیاہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی وہی صبحِ مقصود کے طلعتِ جہاں تاب کا نقاب ثابت ہوئی۔ گو قدم بتکدے کی راہ پر تھے۔ مگر غبارِ مجاز دور ہوا، تو کعبۂ حقیقت سامنے تھا۔ سارا کام پہلے سے ہوچکا تھا، چولہا مدتوں سے گرم تھا، ہوس بازی نے چنگاریوں کا کام دیا تھا، عشق نے شعلے بھڑکائے تھے، صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگ اتار کر دوسری چڑھادی جائے یہ کام امیدوں کی عشق سے نہ ہوسکا تو کیا مضائقہ، عشق کی مایوسیوں نے تو پورا کردیا۔

بلاشبہ یہ لغزش تھی، لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرادے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہونچنا ہے، اگر لغزش دستی ہی رہ نما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزاروں استقامتیں اس پر قربان ہوں۔ لاکھوں ہشیار بادہ اس پر نچھاور۔ اصل یہ ہے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہونچنے کی راہ بعد ہی میں سے ہوکر نکلی ہے یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے لئے سب سے کٹنا۔ اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کردیئے جائیں جو پہلے کھول لئے گئے رہتے ہے۔"

یہ عظیم شخصیت بچپن اور عنفوانِ شباب کی منزلوں اور دلچسپیوں سے بہت تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ خود تحریر فرماتے ہیں!

"چھبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں۔ میں اپنی

دشت نوردیاں ختم کرکے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا ۔ گویا اس معاملہ میں بھی اپنی چال زمانہ سے الٹی رہی لوگ زندگی کے جس مرحلہ میں کمر باندھتے ہیں میں کھول رہا تھا ۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

قدرت نے شروع ہی دن سے ان کی ذات کو غیر معمولی صلاحیتوں اور ظاہری و باطنی محاسن و امتیازات سے نوازا تھا ۔ نہایت وجیہہ حسین اور باوقار صورت، میانہ قد اور جسم گل گلاب کی رنگت۔ نہایت مستقیم؛ معتدل ذوق و مزاج کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل کی رفعتیں، عزم و حوصلہ کی بلندیاں اور ہر شعبۂ زندگی میں نفاست و پاکیزگی کی رعنائیاں بہت فیاضی کے ساتھ ان کو بخشی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن، قدیم و جدید، مشرق و مغرب کے مختلف مفاخر و محاسن، اطوار و عناصر کا ایک حسین سنگم (مجمع البحرین) تھے یا ایک گلدستۂ رعنا جس کی آرائش و مشاطگی خود دست قدرت نے فرمائی تھی ۔ عمر بھر ان کی اس جامعیت و کمال کا سکہ بلا انکار و امتیاز سب کے دماغوں پر جما رہا ۔ وہ ہر مجلس میں صدر نشین رہے، خواہ علماء و اتقیاء کا اجتماع ہو، مشائخ و صوفیاء کی محفل ہو۔ قدیم مشرقی روایات کی حامل کوئی بزم ہو یا جدید سیاست و فلسفہ کا کوئی سمپوزیم اور پالٹیکس اور سائنس جدید کا حلقۂ غور و فکر۔ جدھر گئے آنکھیں ان کے لئے فرش راہ ہوئیں۔ ہر طبقہ اور ہر حلقہ نے ان کو اس طرح اپنایا کہ گویا وہ اسی کے جوہر فرد و متاع عزیز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ بخشش پروردگار کا نتیجہ تھا ورنہ ایک انسانی کسب و بساط ایک ہی زندگی میں اس طرح تمام خوبیوں کو جمع کر لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ۔ وہ خود تحریر فرماتے ہیں!

"عقائد و اعمال، عادات و خصائل، فکر و نظر، طرز و روش کسی بھی بات میں اپنی شکستگی و گمشدگی نہ کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی۔ نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی۔ جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہ عشق سے پایا ہے جتنی رہنمائیاں ملیں اسی مرشد فیض و ہادی طریق سے!

علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے بتائی۔ معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اس کے دست کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کریم کے بھید اسی نے بتائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی۔ دل اس نے بخشا۔

کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا۔ کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں سامیدوں اور امنگوں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے تب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم لے سکے جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں۔

بےشک مولانا شبلی نعمانی کی خدمت میں مجھے برسوں نیاز حاصل رہا ہے اور ارباب فضل و کمال کی صحبت ہر حالت میں فوائد بخش ہے۔ مگر الحمد للہ کہ میں اپنی آراء و معتقدات میں کسی انسانی صحبت سے مستفید نہیں۔ بلکہ صرف اس ہادی حقیقی کی ہدایت بخشیوں سے کامیاب فیضان ہوں، جس کی توفیق کا نور مبین تاریکیوں میں مشعل راہ تھا اور گمراہیوں میں دست ہدایت ہے۔" (الہلال)

کمال کی طلب ۔ تقلید و پسر دی سے بے گانگی

انھیں تقلید اور معیار عام کی پس روی سے ہمیشہ بے گانگی رہی۔ ہر راہ میں ان کی فطرت و سرشت کمال و امتیاز کی متلاشی رہتی تھی۔ یہی نہاد و سرشت تھی جس نے ان کو ہر رنگ اور ہر راہ میں امتیاز و انفرادیت کا جوہر تاباں بخشا۔ ان کی بعض تحریریں وضاحت کے ساتھ ان پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے!

"جس حال میں رہے نقص ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روش عام سے پرہیز جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی اپنی راہ خود ہی نکالی۔ اور دوسروں کے لئے اپنا نقش قدم رہنما چھوڑا۔ رندی اور ہوسناکی کا عالم رہا تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔ لمحوں کے اندر برسوں کے کام انجام پائے اب جس حال و رنگ میں ہیں تو یہاں بھی کمال ہی کی آرزو ہے اور اہتمام کار کیلئے بیتابی اور سارا معاملہ اسی کارساز غیب کے ہاتھ ہے جس نے گو ہر راہ میں ڈالا لیکن اٹکایا کہیں نہیں اور گو ہر وادی میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے سرگردانی ضرور ہوئی لیکن یہ سرگردانی بھی ہدایت یابی سے خالی نہ تھی ۔

اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا ولولے تھے۔ میری عمر ستّو برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن اس وقت بھی طبیعت کی رفتار یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھائیے پوری طرح اٹھائیے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے جائیے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے، جس کوچہ میں قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان بین کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کئے تو وہ بھی پوری طرح کئے۔ گناہ کے کام کئے تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا۔ تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے۔ پارسائی کی راہ ملی تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے، ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم و راہ رکھئے تو راہ کے کاموں سے رکھئے"

تقلید و پس روی سے گریز !

"جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے۔ گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلاشبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان سے باہر تک پہنچے، لیکن یہ بعد کے واقعات ہیں جب کہ طالب علمی کا زمانہ بسر ہو چکا تھا اور میں نے اپنی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالی تھیں۔ میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا۔

فرض کیجئے میرے قدم اسی منزل میں رک گئے ہوتے اور علم و نظر کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈی گئیں ان کی لگن پیدا نہ ہوئی تھی تو میرا کیا حال ہوا ہوتا؟ ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد و ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہئے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ برابر بڑھتی گئی یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقاید و افکار کی وہ تمام بنیادیں، جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں یک دفعہ متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں :

ہیچ گہہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقاید کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کش مکش ہوتی وہ سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیئے تھے۔ تعلیم نے انھیں اور تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انھیں اور زیادہ سہارے دیئے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں۔ مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر ہونی چاہئے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو؟ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا۔ کیوں کہ موروثی اور روایتی عقاید کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جب بنیاد ہل گئی تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی۔ کچھ دنوں تک طبیعت کی درماندگیاں سہارا دیتی رہیں لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا بھی اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال نہیں سکتا۔

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ است

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لئے دلیل راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے

تہی دست کر دیا تھا۔ مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہونچا دیا (غبار خاطر)

" عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے، مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں، زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پوری طرح نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی " (غبار خاطر)

البتہ جو عقیدہ کھویا وہ تقلیدی تھا اور جو عقیدہ اب پایا وہ تحقیقی تھا۔"

خلوت پسندی اور گریز پائی

" دل ہمیشہ خلوت و دوری کا طلبگار رہا۔ تنہائی کسی حال میں ملے اور کسی شکل میں۔ ہمیشہ میں اس کا آرزو مند رہتا ہوں۔ میں نے اس چیز کی کبھی آرزو نہیں کی کہ لوگ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے ۔" ایک اور جگہ ارشاد ہے!

" ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے۔ مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے، جوں ہی مروت کے تقاضوں سے فرصت ملی اور وہ اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی ...... جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے محسن کی جا سکیں

اس افتاد طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال بھی سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کو حقیر تصور کرتا ہوں۔ اس لئے ان کی طرف بڑھتا نہیں حالانکہ خود مجھے اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر میں کہاں کر سکتا ہوں غنی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے ؎

طاقتِ برخاستن از گردِ منت کم نہ ماند
خلق پندارد کہ خوارست دست افتادہ است

فروغ قلب و نظر۔ ذوق امتیاز کی نوازشیں

" طبیعت کی یہی افتاد فکر و عمل کے کسی گوشہ میں کبھی وقت اور رسم کے پیچھے نہ چل سکی اسے وجود کا نقص کہئے لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا کہ جو اول روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر نو کی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس نا وقت کے پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا۔ لوگ کھاتے تو مزا نہیں ملتا ... ہم سب سے حرفی پھل اپنی قیمت ہمیشہ گراں رکھتا۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزا ملے یا نہ ملے، مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔ بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہو۔ مگر میرا معاملہ بالکل انوکھا رہا جس جنس کی مانگ عام ہوئی وہ میری دکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر جہاں خریداروں کی بھیڑ ہو میں نے پنی دوکان لگائی تو وہاں جہاں گاہکوں کا گذر کم سے کم ہو سکے۔ .... مذہب میں، ادب میں، سیاست میں۔ فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی۔ دنیا کے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں، میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداریوں کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں۔

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہے کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا جس نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔ خلائق کے کتنے ہی ہجوم ہوں میں اپنا وقت صاف بچا لے جاتا ہوں۔ میری بزم عیش طرب اس وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے نہ کوئی سننے والا کان! "

یہی وہ مؤثرات و عوامل تھے جنھوں نے ایک انسان کامل " ابوالکلام " کی شخصیت کو مکمل و مرتب کیا اپنی ہمہ گیر صلاحیتوں اور علمی و فکری عروج و کمال کے باوجود انھوں نے اپنی وضع قطع ہمیشہ مشرقی طرز کی رکھی اور ہر راہ سے منہ موڑ کر خدمت دین و ملت کو اپنا شعار بنایا " منصب مولانا " ہی سے انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور آخر دم تک اسی موقف کو اپنا حقیقی شرف و اعزاز سمجھا۔

شروع سے جو لباس (شیروانی، کبھی عمامہ اور کبھی ایرانی وضع کی ٹوپی، سیدھا پاجامہ) انھوں نے اختیار کیا تھا۔ وقت کے ساتھ کبھی اس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوئی۔

سگرٹ کا شوق تھا۔ وہ بھی اعلیٰ قسم کی ۔ چائے کے باب میں ان کی پرواز ذوق و نفاست مشہور ہی ہے۔ ایک زمانہ میں طبیعت کو موسیقی کی لطافتوں اور رباب و ستار کی نغمہ طرازیوں سے بھی وابستگی رہی لیکن بہت جلد اپنے حقیقی موقف کی جانب راجع ہو گئی۔

کم لوگ ہیں جنھیں اس راز کا علم ہو کہ مولانا آزاد کی تمام تر دلچسپیوں کا محور اور قلب و دماغ کی حقیقی توجہات کا مرکز ایک ہی تھا یعنی " قرآن حکیم " ترجمان القرآن کی تمہید میں اس ذوق و انہماک پر اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں!

" کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اور اس کی ایک ایک سورۃ ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں، تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل جدید و قدیم قسم کی تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے لئے یہ تقسیم بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں کے چپہ چپہ کا شناسا ہوں۔

رہا ہوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں مری نظر میں ہیں رندان و پارسا ایک ایک

(ترجمان القرآن)

یہی ذوق و رجحان تھا کہ مولانا نے اپنی زندگی کا نصب العین خدمت دین و ملت کو بنایا اور داعیانہ و مصلحانہ زندگی اختیار کی۔ وہ راہ کے تقاضوں سے بخوبی آشنا تھا اور اس منصب عظیم کی اہلیت سے مالامال! فرماتے ہیں!

مقام دعوت و عزیمت

" دعوت و اعلان حق کا کام کرنے والوں کو اپنے لئے نہیں، مگر اپنے کام کی عزت کی خاطر بادشاہوں کی سی نظر اور کشورستانوں کا سا دماغ رکھنا چاہئے، جو لوگ خدا کے دروازے کے سائل ہیں، دنیا میں کس کی ہستی ہے کہ وہ انھیں اپنے سامنے سائل دیکھ سکے۔ ان کی جیب میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ ہو، لیکن ان کے دل میں وہ خزانہ مخفی ہے جس سے بڑے بڑے مغرور شہنشاہوں کو خرید سکتے ہیں۔ دولت اور ریاست دنیوی اس لئے بنائی گئی ہے۔ تاکہ اپنے آپ کو ان کے آگے ڈال دے اور وہ ٹھکرا کر عزت بخشیں، اگر وہ ایسا کریں تو دولت کے پجاریوں کے لئے یہی سب سے بڑا شرف ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے ختم ہو جائے گا یا چھین لیا جائے گا، پر ان کے پاس جو خزانہ ہے، وہ نہ تو کبھی ختم ہوگا، نہ اس آسمان کے نیچے اسے کوئی چھین سکتا ہے " (الہلال)

استغنا و بے نیازی اس راہ کی شرط اولین ہے، چنانچہ:

"البتہ سوچتا ہوں کہ یہ معاملہ بھی فائدے سے خالی نہ تھا اور یہاں کا کونسا معاملہ فائدے سے خالی ہوتا ہے؟ یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لئے دنیا کی طبیعت للچاتی رہتی ہے اس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہوگیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی فیضی نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضی تھا ـ

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس
گہ گہے پس ماندگانِ راہ منزل می کنند

طبیعت کی اس افتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بے کار ہوگئے لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے کیوں کہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے، میرے لئے بسا اوقات قابل برداشت ہوجاتا ہے میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی ـــ اضطرار و تکلیف کی مجبوری ہوتی ہے۔"

اخلاص: صداقت اس راہ کا دستور کار ہے مولانا کی زندگی اس صلاحیت کا بھی ایک بے مثال نمونہ تھی۔ ایک تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا۔

"تم ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے کہ میں تمھارے سامنے ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنی فریادیں بلند کی ہیں اور ہمیشہ سب کچھ تم کو بتلا دینا چاہا ہے۔ جو میرے دل نے مجھے بتایا۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے کبھی نصیحت کرنے میں خیانت نہ کی اور نہ کسی مادی عقوبت کا خوف میرے دل کو ڈرا سکا۔ یا ذاتی نفع و نفع کا لالچ مجھے رام کر سکا۔ میرے آگے دنیوی عزت کے حصول اور دولت و جاہ سے مالا مال ہونے کی بے شمار راہیں کھلیں۔ مگر خدا نے میرے دل کو ہمیشہ اپنی مقدس انگلیوں میں اس طرح رکھا کہ اس کے جلال و عظمت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی ذاتی فائدے کی خاطر بھی کبھی راہ حق سے رائی بھر انحراف گوارا نہیں کیا۔"

ایک اور موقع بیان کی یہ دعا قابل ذکر ہے۔

"اگر میرے تمام کام ایک تجارتی کاروبار اور ایک دوکان دارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھ سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کردے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لئے بھی کامیابی کی لذت نہ چکھنے دے باغوں کے سرسبز و ثمر دار درختوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مگر جنگل کے خشک درختوں کو جلانا ہی چاہیے جس دل میں خلوص و صداقت کو جگہ نہیں ملی۔ اس کو کامیابی کے لئے کیوں باقی رکھا جائے۔" (الہلال)

"یاد رکھئے کہ دنیا میں صرف سچائی اور خلوص ہی میں زندگی ہے۔ خلوص کبھی ضائع نہیں جاتا، اور سچائی کبھی نہیں مرتی۔ اگر میرے دل میں سچائی کا ایک ذرہ بھی موجود ہے تو میں ایک ایسی طاقت، ایک ایسی زندگی، ایک ایسی غیر فنا ہستی ہوں جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو مٹانے پر قادر نہیں۔ آپ روز دیکھتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ڈوباتا ہے اور اس کو نیچر کا ایک ناممکن التبدیل قانون سمجھتے ہیں یقین فرمائیے کہ میں بھی اس کی قدرت اور فطرت کے ایسے ہی قانون روز دیکھتا ہوں شاید آگ کبھی نہ جلا سکے اور پانی کبھی نہ ڈبا سکے یہ ممکن ہے مگر میرے عقیدے میں یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ایک ہستی خدا سے صلح کرے اور پھر زندگی کے کاروبار میں اسے شکست ہو۔" (الہلال)

جرأتِ حق

(ہندوؤں سے خطاب۔ ہندو سنگٹھن تحریک کے دور میں)

"میں نے ۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے سامنے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہار حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف بھی اپنی صدا بلند کروں جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔"

ایک دوست کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا!

"ہر وقت اسے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو کوئی جرم نہیں۔ لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت ہے۔"

"دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہئے لیکن اترنے کے بعد موجوں کا شکوہ فضول ہے۔"

ایک داعی و مرشد کی زندگی میں عزم و حوصلہ کی پختگی اور قلب کی وسعت اور عقیدہ و ایمان کی استواری شرط لازم ہے، چنانچہ مختلف مواقع پر مولانا مرحوم کی سوانح میں ان صلاحیتوں کو تا بحد کمال پ

کسی بدنصیب نے نازیبا الفاظ میں ان پر تنقید کی۔ ایک مخلص کو طیش آگیا۔ جواب کی استدعا کی تو فرمایا!

"سنہ ۱۹۱۰ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر اس شخص کو جو منافق طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا، نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔ کوئی شخص کتنا ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں اسے برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے، چونکہ اٹھتا ہوں کہ برا ہی کہنا ہے تو سب سے پہلا اس کا مستحق خود اپنا نفس ہے"

لیگ کی سیاسی شورشوں کے دور میں کس کس طرح ان کا دل نہ دکھایا گیا۔ وہ شرمناک مظاہرہ جو علی گڑھ اسٹیشن پر کیا گیا آج تک اس کی تلخی اور تعفن ہمیں یاد ہے، مگر مولانا مرحوم نے اس کے بارے میں بھی تحریر فرمایا تو یہ کہ!

"علی گڑھ اسٹیشن پر چند طلبا کا جو طرز عمل رہا تھا اسے ان کی نادانی پر محمول کیجئے اور انھیں بخش دیجئے۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر نہیں، بلکہ ان نادانوں پر ہے۔ جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔"

صحافتی زندگی

لسان الصدق — "احسن الاخبار" کے زمانے میں مولانا نے "الاصلاح" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس کے ساتھ "دار الاخبار" نامی ایک ریڈنگ روم کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ ریڈنگ روم کے سلسلہ میں کوئی دقت پیش نہ آئی، کیونکہ "احسن الاخبار" کے تبادلے میں بے شمار ملکی اور غیر ملکی اخبار آجاتے تھے۔ جب احسن الاخبار بند ہوا تو یہ اخبار بھی بند ہونے لگے۔ پھر لسان الصدق جاری کیا جس کے مقاصد ترقی اور اصلاح تھے۔ اس پر معاصرین نے شاندار تبصرے لکھے۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا آزاد ایک معمر اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔ حالاں کہ اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی، جب مولانا شبلی نعمانی کی نظامت میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی اور آزاد اس کی مجلس عاملہ کے رکن بنائے گئے، تو انجمن ترقی اردو نے اسے اپنا آرگن بنا لیا اور اس سے لسان الصدق کی خریداری میں خاصہ اضافہ ہوگیا اور امرتسر کا اخبار "وکیل" اور بعض دوسرے اہم اخبارات اس کے مضامین باقاعدہ نقل کرنے لگے۔ چھ ماہ بعد اسے ماہانہ رسالہ بنایا اور کتاب کی شکل میں کم از کم تین جزو کی ضخامت تک پہونچ گیا۔ سال بھر کے بعد مولانا بمبئی گئے تو پرچہ دہلی سے نکلنے لگا۔ ایک حادثے کی خبر سے آگرہ میں قیام کیا۔ تو لسان الصدق بھی دہلی چھپنے لگا۔ پھر بمبئی گئے تو رسالہ بھی وہاں پہونچ گیا اور جب عراق کا سفر درپیش آیا تو پرچہ بند ہوگیا۔ یہ سنہ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے۔

الندوہ — عراق سے واپسی پر بمبئی میں آزاد کی مولانا شبلی نعمانی سے ملاقات ہوئی۔ خط و کتابت تو پانچ سال سے جاری تھی، لیکن ملاقات پہلی مرتبہ ہوئی۔ دو تین ہفتہ کی صحبتوں میں آزاد کے جوہر کھلے اور شبلی انھیں بے حد پسند کرنے لگے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں: "جب چند دنوں میں گفتگو و صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہوگیا، تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔" شبلی حیدرآباد دکن میں ناظم علوم و فنون اور الندوہ کے مدیر تھے اور چاہتے تھے کہ مولانا آزاد الندوہ کی ادارت سنبھال لیں، وہ آزاد کی قابلیت سے اتنے متاثر تھے کہ ایک دفعہ بار بار

قوتِ بیان دیکھ کر کہا کہ تمھارا ذہن دماغ عجائب روزگار میں سے ہے تمھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔ بالآخر مولانا شبلی کے پیہم اصرار پر مولانا آزاد نے الندوہ جیسے علمی میگزین کی ادارت سنبھال لی۔

وکیل | سات آٹھ مہینے الندوہ کی ادارت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد بمبئی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ مولانا کو لکھنؤ سے بمبئی جانا پڑا اور اس طرح مولانا شبلی سے یکجائی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مولانا انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہونے کے لئے لاہور آئے۔ وہیں وکیل امرت سر کے مالک شیخ غلام محمد صاحب نے باصرار تمام آپ کو وکیل کی ادارت سونپ دی۔ وکیل اس وقت تمام اردو اخبارات میں سب سے زیادہ متین و سنجیدہ اور قومی مسائل میں صاحب رائے و نظر اخبار تسلیم کیا جاتا تھا۔

دارالسلطنت | "وکیل" میں ایک سال کام کیا۔ اتنے میں مولانا آزاد کے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ والد مرحوم نے واپسی کے لئے اصرار کیا۔ اس پر آپ کو کلکتہ جانا پڑا وہاں اخبار ہفت روزہ دارالسلطنت کے احیاء کی تجویز ہوئی۔ لیکن مولوی عبداللطیف جو چمڑے کے تاجر تھے، اخبار کی پالیسی میں ناواجب دخل دیتے تھے، اس لئے مولانا جلد ہی اس سے الگ ہوگئے اور اخبار بھی کچھ عرصہ بعد بند ہوگیا۔

الہلال اور البلاغ | یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان کی سیاست ایک نیا رنگ اختیار کر رہی تھی تقسیم بنگال کی تحریک نے حالات میں کافی ہل چل پیدا کر دی تھی۔ مولانا آزاد جو برطانوی اقتدار اور ہندوستان کی غلامی کے باعث خود مسلمانوں کی درماندگی اور مشرقی دنیا کے انحطاط کا پوری دلسوزی کے ساتھ جائزہ لے رہے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ برادران وطن میں قومی شعور ابھر رہا ہے اور ادھر مسلمان اپنی اقتصادی پس ماندگی اور سرسید کی تحریک کے باعث انگریزوں کی طرف وفادارانہ بڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت قوم کو اس غلط راہ سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔ اسی جذبہ کی ترطیب تھی جس نے ۱۹۱۲ء میں الہلال (اور ۱۹۱۳ء میں البلاغ) کی شکل اختیار کی۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں صحیح سیاسی شعور پیدا کرنا اور ان کو ملی، دینی اور معاشرتی اعتبارات سے صحیح انداز فکر کا عادی بنانا تھا۔

اس طرح الہلال ایک نئی تحریک کا نقیب بن کر سامنے آیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا، اردو صحافت میں الہلال نے نیا باب قائم کیا اور جدید ترین اسلوب و معیار سے اردو صحافت کو آشنا کیا۔ مصوّر، ملکی و بیرونی خبریں۔ عالمی مسائل پر بصیرت افروز تبصرے۔ سیاسی احوال و کوائف اور نہایت بیش قیمت علمی، دینی اور سیاسی افکار و مقالات کے سلسلے پہلی بار الہلال کے ذریعہ اردو صحافت میں داخل ہوئے۔ اس کا انداز تحریر اپنے اندر رعد کی کڑک اور برق کی چمک رکھتا تھا اس میں سمندروں کی وسعت اور سکون اور پہاڑوں کا وقار نظر آتا۔ یہ ایک اخبار ہی نہ تھا، بلکہ ایک زلزلہ تھا جس سے انگریز حکمران گھبرا گئے۔ کان پور میں مچھلی بازار کا واقعہ پیش آیا۔ تو الہلال کے ایک ہی آرٹیکل نے ملک میں وہ آگ لگائی کہ حکومت نے کان پور آتے ہوئے مولانا کا داخلہ بند کر دیا، ورنہ شدید خطرہ تھا کہ ملک گیر بغاوت پھیل جاتی بالآخر حکومت نے طرح طرح کے الزامات اور جبر و تشدد کے حربوں سے مولانا کی اس آواز کو دبانے کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں انھیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔

سیاسی زندگی کا آغاز

۱۹۲۰ء میں جب مولانا آزاد رانچی کی نظر بندی سے رہا ہوئے تو اس وقت پورے ہندوستان میں رولٹ ایکٹ کے خلاف زبردست تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا آزاد نے جن کے دل میں آزادی کا جذبہ موجیں مار رہا تھا اور حب الوطنی کی تڑپ تھی نہ رہ گیا اور وہ عملی سیاست کے میدان میں کود پڑے مولانا آزاد ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پہلی مرتبہ گاندھی جی سے ملے تھے۔ یہ ملاقات ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس وفد کی ترتیب کے سلسلے میں تھی جو ترکی کے معاملہ میں وائسرائے ہند سے ملنے جا رہا تھا۔ مولانا آزاد کا نام اس وفد میں شامل تھا۔ لیکن انھوں نے اس وفد کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اس طرح بھیک مانگنے اور درخواستیں گزارنے سے کوئی مقصد حل نہیں ہوگا انھوں نے اس مسئلہ پر مولانا محمد علی۔ شوکت علی اور مولانا عبدالباری مرحوم سے سخت اختلاف کیا، اور اس کے بعد انھوں نے انگریزوں کے خلاف مؤثر تحریک شروع کرنے کے لئے ترک موالات کی تجویز پیش کی۔ یہی تجویز انھوں نے میرٹھ میں خلافت کانفرنس کے سامنے پیش کی اور کلکتہ میں دوسری خلافت کانفرنس میں جو مولانا آزاد کی صدارت میں ہوئی۔ یہ تحریک منظور کر لی گئی۔ مولانا آزاد نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے رات دن ایک کر دیئے۔

تھوڑے عرصہ بعد پرنس آف ویلز کی آمد پر ہندوستان کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا اور انھیں ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ قید سے رہائی کے بعد جب وہ دوبارہ سیاست کے میدان میں آئے تو ہندوستان کے حالات بالکل ہی بدل چکے تھے۔ انگریز ہندو مسلمانوں میں منافرت پھیلانے اور تفرقہ ڈالنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر طرف مایوسی اور بیزاری کا دور دورہ تھا۔ ادھر خود کانگریس میں زبردست اختلافات پیدا ہو چکے تھے ایسے حالات میں مولانا آزاد کو دہلی کے اجلاس میں کانگریس کی صدارت سونپی گئی۔ انھوں نے کانگریس کے دونوں مخالف گروپوں میں سمجھوتہ کرایا اور حصول آزادی کے لئے عام تحریک کے ساتھ ساتھ پارلیمانی تحریک کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۰ء میں جب سائمن کمیشن کے خلاف تحریک شروع کی گئی، تو اس میں بھی مولانا آزاد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ جیلوں کی صعوبتیں جھیلیں، تکالیف اٹھائیں اور ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ باہر تو مولانا آزاد عملی سیاست میں سب سے پیش پیش رہتے اور جب انھیں جیل میں بند کیا جاتا تو انھیں کچھ لکھنے پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ تقریباً گیارہ سال کی قید کے دوران میں انھوں نے "ترجمان القرآن" کو از سر نو ترتیب دیا اور "غبار خاطر" لکھی۔

۱۹۴۰ء میں انھیں کانگریس کی صدارت کے لئے دوبارہ منتخب کیا گیا اور ۱۹۴۶ء تک مسلسل صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۴۶ء میں جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو اس میں مولانا آزاد کو وزیر تعلیم بنایا گیا جب سے اپنے آخر تک وہ وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز رہے۔

روشن منار

(بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر)

"مولانا آزاد انسانی رہنمائی کے لئے ایک روشن منار تھے۔ جو ان کے پاس جاتا تھا اس کو روشنی اور بصیرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ باتیں کم کرتے تھے لیکن ان کی سوجھ بوجھ۔ قوت فیصلہ اور جرأت و خلوص کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا"

زرّیں ——— خدمات

(مسلسل)

عام طور پر مشہور ہے کہ مولانا آزادؒ نے اپنی زندگی ایک بلند پایہ مفکر، ایک ادیب و انشا پرداز، ایک صحافی اور صاحب قلم کی حیثیت سے شروع کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا مقام ایک داعیٔ حق، معلم انسانیت، مصلح دانا اور ایک عظیم رہنما کا منصب تھا۔ اس منصب رفیع کے لئے مشیت ربی نے ان کو علم و فضل، فکر و تدبیر، عزم و ایمان اور بے مثل صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علم و ادب کے جو گل و گلزار قلم آزاد کے سایہ میں کھلے اور سرسبز و شاداب ہوئے، وہ خداداد صلاحیتوں کا ایک حسین عکس ضرور تھے، لیکن ہم لفظ و بیان کے ان دلآویز مرغزاروں میں مولانا آزاد کا حقیقی موقف تلاش نہیں کر سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدائے عمر میں مولانا کی ذات سے عوام کو اسی حیثیت سے واقفیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے متعدد جرائد و رسائل میں ادارت و تحریر کی خدمت بھی انجام دی اور اپنی تحریروں ہی سے وہ مشہور و متعارف ہوئے۔ شروع سے اخیر تک مولانا مرحوم کی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے تو قدرتی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مشیتِ الٰہی نے اس ستودہ صفات ہستی کو کسی خاص مقصد اور مشن کے ساتھ دنیا میں بھیجا تھا۔

چنانچہ بچپن ہی سے ان کے آثار و اطوار ان کے مستقبل کی غمازی کر رہے تھے۔ ان کے انداز و اطوار عام انسانی نہج سے بہت مختلف اور مافوق العادت رہے۔ شروع ہی سے ان کا رجحان طبع علم و فکر کی جانب تھا، اور ان کے قدم تیزی کے ساتھ اس راہ کی طرف بڑھ رہے تھے جو آنے والی زندگی میں ان کی "شاہراہ حیات" بننے والی تھی۔

کس سرعت کے ساتھ وہ درس و تعلیم کی منزل سے گزر گئے۔ قوتِ حافظہ اور شوقِ مطالعہ نے کتنی جلد ان کی موہوبہ صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا! دست قدرت کے سوا آخر وہ کون سی رہنمائی تھی، جو اس تیزی و کمال کے ساتھ ان کی دستگیری کر رہی تھی۔ غور فرمایئے!

بےشک وہ بہت ہی کم عمر میں علم و فضل کی اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ ہو کر قلم و صحافت کے بازار میں نکل گئے تھے۔ متعدد رسائل و جرائد میں انھوں نے کچھ وقفے گزارے۔ لیکن یہ سب سیڑھیاں تھیں جہاں سے ان کے قدم گزرے ضرور، مگر رکے نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حقیقی منصب و مقام رفیع تک پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا آزاد کو شعوری طور پر شاید احساس نہ بھی ہو کہ قدرت ان سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پس پردہ کوئی خاص کشش تھی جو پوری تیزی کے ساتھ ان کے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ کوئی بات تھی کہ وہ دکیل اور الندوہ کی وابستگی سے بھی بہت جلد کبیدہ ہو گئے اور بالآخر کلکتہ پہونچ کر خود الہلال جاری کیا اور اس کی راہ میں ہر خسارہ اور پریشانی کو خندہ پیشانی سے انگیز کیا۔

متعدد مشہور رسائل و صحافت میں کام کرنے کے بعد مولانا کے فضل و کمال کی شہرت و مقبولیت ہر طرف چھا چکی تھی۔ اب اگر مولانا مرحوم کو صرف ایک پیشہ اور وسیلۂ معاش کے طور پر صحافت کی راہ اختیار کرنی ہوتی تو الہلال وقت کا ایک خالص علمی و ادبی جریدہ ہوتا جو بے حد کامیاب ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ پہلے ہی دن سے الہلال کے تیور کچھ اور تھے جو صاف پکار رہے تھے کہ سود و زیاں یا کسب معاش کی کوئی بھی چھاپ بھی اس کے مقاصد پر نہیں پڑ سکی ہے جن ہاتھوں نے یہ دکان سجائی تھی، وہ پہلے ہی یہ اعلان لکھ کر آویزاں کر چکے تھے کہ

مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللہ

حقیقت یہ ہے کہ اسی مرحلہ پر مولانا مرحوم کو اس منصب عظیم کا پورا ادراک و شعور ہو گیا تھا جو قدرت الٰہی نے ان کے سپرد کیا تھا۔ الہلال اس شعور و فہم کا پہلا اعلان تھا اور اصلاح و دعوت الی الحق کی وہ پکار تھی جس نے مولانا مرحوم کے مقصدِ حیات کو بے نقاب کر دیا۔

اس ابتدا سے آپ انتہا تک دیکھ جایئے جو چیز آپ کو سوانح آزاد میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے گی، وہ ان کا مخصوص اندازِ فکر و بیان ہے۔ یقیناً آپ محسوس کریں گے کہ ان کا ہر اندازِ غور و فکر مجاہدانہ و حکیمانہ اور ہر اندازِ بیان و تخاطب داعیانہ، مصلحانہ اور مشفقانہ تھا۔ ان کی ہر تحریر اور ہر خطاب سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ ایک داعیٔ حق، ایک مرشد و مصلح اور ایک مخلص رہنما تھے، جس کی پشت پر ایثار و عمل کی بے پناہ طاقت تھی اور جس کا مخفی تعلق مبدأ رشد و ہدایت سے استوار تھا۔ یہی وہ مقام و موقف ہے جہاں سے مولانا ابوالکلام کی عملی و فکری زندگی شروع ہوئی۔

حیات مابعد میں انھوں نے کس طرح منصب دعوت و اصلاح کا حق ادا کیا اور کن کن راہوں سے گزر کر منزل مقصود تک پہونچے، آیئے! واقعاتِ مابعد میں اس سوال کا جواب تلاش کریں۔

امام الہند کی زندگی اپنے مختلف ادوار میں

امام الہند مولانا آزاد قدس سرہٗ العزیز کی پاکیزہ زندگی اپنے پیغام و عمل کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یہ تین دور اپنے دامن میں نصف صدی سے زیادہ مدت کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

سب سے پہلا دور بیسویں صدی عیسوی کے شروع سے ۱۹۲۳ء تک کا ہے جس کی روح اسلامی دعوت فکر و نظر اور اصلاح و تنظیم ملت ہے۔ الہلال و البلاغ سے اس دعوت حق کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعہ آپ نے ملت اسلامیہ کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت، اپنے دور رفتہ موقف و مقام کی یاد دلائی اور دین مبین کے چہرہ تاباں سے لغزش فکر و ذہن کی تہ بہ تہ نقابیں الٹ کر اس کی سچی شکل و صورت پوری رعنائی و دلآویزی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کی۔ غلط رسوم اور بے محل عقیدتوں کی نظر بندیوں کا پردہ چاک کیا۔ آسودہ غفلت ملت اسلامیہ کو ایمان و عمل کی راہ دکھائی۔ علماء حق کو ان کا حقیقی منصب یاد دلایا۔ اس طرح مذہب حق کے اردگرد صدیوں کی بے راہ روی، غفلت اور بے اعتنائی نے جو ماحول پیدا کر دیا تھا اس کی گرد چھٹی اور اسلام کی فکری و عملی سچائی نکھر کر ایک بار پھر دنیا کے سامنے آئی۔ درحقیقت یہ ایک مجدد وقت کا منصب ہے جو مولانا علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں انجام پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسی مقصد عظیم کی کثرت نے ان کی ہر فکری و عملی صلاحیت کو بےچین رکھا اور ان کی پوری زندگی اسی عشق کے سانچہ میں ڈھل گئی تھی۔

پہلا دور ——— خدمت دین و وطن

حضرت مرحوم نے نہ صرف اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ احیاء ملت کی یہ مہم بپا کی، بلکہ اسی ذیل میں کبھی دار الارشاد (ایک تعلیمی مرکز) قائم کیا۔ کبھی جماعت حزب اللہ کی تنظیم کی، کبھی تبلیغ و اشاعت دین کا ادارہ قائم کیا (جس کے صدر خود مولانا مرحوم اور ناظم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے)

رانچی کی نظر بندی کے ان چار سال تک ایک طرف درس و ارشاد کا سلسلہ قائم رکھا اور دوسری جانب اپنی مفصل و طویل تفسیر البیان کی تسوید کی جس کے مسودے برٹش حکومت کی دارو گیر کی نذر کلکتہ میں جمعہ و عیدین کے عظیم الشان مجموں میں خطبات کا سلسلہ برسوں تک قائم رکھا۔ ترجمان القرآن اور معارف قرآن پر فاتحہ کا طویل و بصیرت افروز مقدمہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ ایک طرف مولانا آزادؒ تنظیم و احیاء ملت کا یہ مبارک دستور انقلاب لا رہے تھے، دوسری جانب ان کی نظر پورے شعور و اضطراب کے ساتھ ان انقلابات کا جائزہ لے رہی تھی، جو پورے عالم اسلام پر گذر رہے تھے۔ خلافت عثمانیہ اور مشرق وسطی میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی افسوسناک شکست نے ان کی ہر راحت و آرام کا تعاقب کیا اور انہیں مسلسل بے چین رکھا۔ اس پورے دور میں ان کی تحریریں اور تقریریں قلب و ذہن کے اسی اضطراب و درد مندی کی صدائیں تھیں

اور یہی پس منظر تھا جس نے مولانا آزادؒ کو تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند اور بالآخر تحریک آزادی ہند کی قیادت گاہ تک پہونچا دیا۔

دوسرا دور

شروع ہی سے مولانا مرحوم کی فراست و دور اندیشی نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ عالم اسلام عرب اور خود ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری، ترقی اور عروج کا مدار اس پر ہے کہ یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب استعماریت کو روکا اور واپس کیا جائے۔ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ خود ہندوستان کی غلامی تھی۔ چنانچہ ناگزیر تھا کہ یہ مرد مومن و مجاہد پوری جرأت حق و عزیمت کے ساتھ خود تحریک آزادی ہند کا بھی داعی بن جائے اور اس راہ میں سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائے۔

کلکتہ میں اپنی سب سے پہلی گرفتاری کے موقع پر ریذیڈنسی مجسٹریٹ کے سامنے مولانا مرحوم نے جو بیان دیا تھا (جو اسی شمارہ میں کسی دوسری جگہ آپ کی نظر سے گزرے گا) وہ مولانا کے دینی، ملی اور سیاسی افکار کا ایک بنیادی اظہار ہے اور اس کی روشنی میں اس پس منظر اور مولانا کے فکر و عمل کی قدم بہ قدم پیشرفت کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

میدانِ سیاست میں

مولانا مرحوم جس خداداد صلاحیت فکر و نظر اور فراست ایمانی سے بہرہ مند تھے، اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان کے کسی عزم، کسی عقیدہ اور کسی فیصلہ پر وقتی جذبات اور ظاہری ہنگاموں کا سایہ بھی پڑ سکتا۔ ان کا ہر فیصلہ ٹھوس حقائق پر مبنی اور سنجیدہ غور و فکر کے عطر میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔

جب وطن عزیز کی تحریک آزادی کا سوال سامنے آیا، تو مولانا مرحوم کی نظر اس کے ان دوررس نتائج و مقاصد پر تھی، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے خود وطن عزیز کے صدیوں کے حالات وقت کے ماحول اور مشرق و مغرب کی اس کش مکش حریت و استعمار کا پورا جائزہ لے کر مستقبل میں آزاد ہندوستان کا ایک ذہنی نقشہ مرتب کیا جو اپنے وقت پر پورا ہونے والا تھا۔

اس نقشہ کا تقاضا تھا کہ تحریک آزادی ہند کو نظریۂ متحدہ قومیت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے کہ مستقبل میں جب وطن عزیز آزادی کی آسائشوں سے بہرہ مند ہو اور تعمیر و ترقی کی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں اس وقت سرزمین ہند پر بسنے والے مختلف فرقوں اور مذاہب کو قومی اور ملکی زندگی میں جو رشتہ اخوت و مساوات باہم مربوط کر سکے اس کی بنیاد دور غلامی و جنگ آزادی ہی میں پڑنی چاہئے۔

بہر حال مولانا مرحوم نے اس میدان میں اپنے اور اپنے متبعین کے لئے ایک راہ عمل متعین کی اور وقت آخر اس پر جس طرح ثابت قدم رہے وہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ یہاں مولانا مرحوم کے ان الفاظ کو نہ بھولئے کہ "سیاسی ہنگاموں کو میں نے نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔"

بہر حال ۱۹۲۳ء میں پہلی بار آپ کو متفقہ طور پر آزادی وطن انڈین نیشنل کانگریس کی علم برداری (صدارت) سونپی گئی۔ یہاں سے آپ کی ملی زندگی اپنے خالص دوسرے دور میں داخل ہو گئی، جہاں فکر و توجہ کا محور سیاست وطن تھی۔ یہ دور اپنے پورے عزم و استغراق کے ساتھ آزادی وطن یعنی ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اور اس دور میں مولانا مرحوم کی خدمات سب سے زیادہ سیاسی میدان میں نمایاں رہیں ان خدمات کا تذکرہ اور تفصیلات خود ایک ضخیم مقالہ کا موضوع ہے۔ اس لئے یہاں تفصیلات میں جائے بغیر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ اس دور میں قدم رکھ کر کیا مولانا مرحوم نے اپنے سابق مقام دعوت و اصلاح، تنظیم و اجتماع، ہدایت و ارشاد کو بالکل فراموش کر دیا اور ایک دینی و ملی مفکر کی جگہ آپ نے ایک خالص سیاسی مدبر و رہنما کی جگہ لے لی تھی۔

مولانا کی دعوت فکر و عمل کو دور سے دیکھنے والے تماشائیوں نے شاید ایسا محسوس ضرور کیا، لیکن حقیقت ہرگز یہ نہ تھی۔ اس کے برعکس، یہ واقعہ ہے کہ دین و ملت کی درد مندیاں، اس پورے دور میں بھی مولانا مرحوم کی متاع عزیز بنی رہیں اور موقع بموقع اس ربط و ذوق کا مشاہدہ بھی ہوا۔ ترجمان القرآن کی دوبارہ تدوین و ترتیب بھی اسی دور (میرٹھ جیل ۱۹۳۲ء) میں مکمل ہوئی

ہاں! یہ ضرور ہوا کہ ایک طرف میدان سیاست کی وسعتیں مولانا مرحوم سے زیادہ وقت اور زیادہ توجہ کی طالب تھیں، پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ اس دور کا بڑا حصہ اسفار قید و بند، نظر بندیوں اور پابندیوں، سیاسی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں میں اس طرح گذرا کہ دماغ کو یکسوئی اور سکون میسر نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیاسی میدان میں مخالف ہواؤں اور اپنوں کے اعراض و انکار کی تیز و تند صداؤں نے فضا کو اس قدر مکدر رکھا کہ مولانا مرحوم سیاست کے علائق و مشاغل کے ساتھ ساتھ خدمت دین و ملت کی جو آرزو مندیاں اپنے سینے میں لئے پھر رہے تھے ان سے کسی طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ خلوت و جلوت کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں چھوڑا گیا تھا، جہاں یہ داعی حق اصلاح و ارشاد کی شمعیں روشن کر سکتا

وہ وقت جبکہ مولانا آزاد پہلے پہل اپنی دعوت اور پیغام کو لے کر نکلے تھے، مسلمانوں کی زندگی میں خالص جمود و غفلت کا دور تھا۔ مولانا ہی کی صداؤں نے ان کو خواب غفلت سے بیدار کیا لیکن یہ دور مسلمانان ہند کی ملی زندگی میں غلط جذبات کی شوراشوری اور فہم و بصیرت سے یکسر محرومی کا دور تھا۔ بالآخر ان کی اس حالت کا مرثیہ ان الفاظ میں مولانا مرحوم کی زبان و دہن تک آیا۔

"۔۔۔ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں

اگر تم وقت کے تغیرات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے یوں بیٹھے رہے تو جس سر زمین پر تمہارے آباؤ اجداد کے قافلے پورے جاہ و وقار کے ساتھ آئے تھے تم وہاں سے قافلے بنا کر نکلو گے۔ اور نحوست و مصیبت تمہارے حال پر آنسو بہا کر تمہیں رخصت کرے گی۔ اس وقت تم ممکن ہے مجھے یاد کرو۔ مگر میں شاید وہاں ہوں۔ جہاں تمہاری صدائیں شاید سن تو سکوں، مگر منہ سے کچھ کہہ نہ سکوں ۔۔ "

تیسرا دور ــــــ تعمیر وطن

اس حقیقت اور پس منظر کو سامنے رکھ کر ہم اس دور میں مولانا مرحوم کی زندگی پر نظر ڈالیں تب ہی حقیقت حال کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں آزادیٔ وطن کی تحریک اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچی اور تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اس کے بعد ساڑھے دس سال حضرت مولانا کی زندگی قائم رہی، وہ مقصد عزیز جس نے مولانا کی عملی زندگی کو سیاسیات اور تحریکِ آزادی سے وابستہ کیا تھا اور جس کی طرف ہم شروع میں اشارہ کر چکے ہیں ایک بار پھر ابھر کر سامنے آیا، نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت کے لئے مولانا کے فکر و دماغ نے کیا کیا منصوبہ ہائے کار بنائے تھے، جن کی تعبیر اس دور میں ہمیں نظر آئی۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ خود ہماری لغزشوں نے وہ تمام نقشے (جو مولانا کے بے مثل ذہن و تدبر نے بنائے تھے) بگاڑ دیئے اور آزادیٔ وطن کے ساتھ ساتھ ایک ایسی ناگفتہ بہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا جس نے مستقبل کی کامیابیوں کو پھر دور سے دور تر کر دیا۔

بہرحال اس طوفانی دور میں بھی کئی برس مولانا مرحوم کی فکری و عملی صلاحیتیں بکھری ہوئی بنیادوں کو استوار کرنے میں صرف ہوگئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان قابلِ قدر خدمات کی تفصیلات یہاں پیش نہ کر سکوں گا جو اس نازک اور صبر آزما دور میں مولانا مرحوم نے وطنِ عزیز کی فلاح و بہبود اور ملتِ اسلامیہ کے ثبات و ترقی کی راہ میں انجام دیں۔ ملی زندگی کا کون سا گوشہ تھا جو زخموں سے چور نہ تھا لیکن ایسے وقت میں بھی اس حکیم دانا نے یہ کہہ کر منہ نہ موڑا کہ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

انقلاب کی ایک ہی چوٹ نے مسلمانوں کی زندگی کو مسل کر رکھ دیا تھا، وہ حالات سے بہت ہراساں بہت ہی پست ہمت، بے حد مایوس و غمگین ہو چکے تھے، عین ایسے وقت میں ایک بار پھر یہی ہمدردِ مسیحا اٹھا اور کبھی دلی کے گلی کوچوں میں گھوم کر اور کبھی لکھنؤ کے میدان میں کھڑے ہو کر اس نے دوائے دردِ دل تقسیم کی اور انھیں کو جو پچھلی چوتھائی صدی میں مسلسل اعراض و انکار، توہین و ایذا کا سرچشمہ بنے رہے تھے، پھر اس نے اپنے سینہ سے لگایا۔ کسی تشنیع و ملامت کی جگہ اپنا دامنِ شفقت ان کے سروں پر پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ ان غلط کاروں کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں اور اس کی دردمندیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔

مختصر یہ کہ امام الہند کی زندگی کا یہ آخری دور ایسی خاموش اور پیہم خدمت میں گزرا جس کا دامن ایک طرف وطنِ عزیز کے مستقبل سے وابستہ تھا اور دوسری جانب ملتِ اسلامیہ کے مفاد و مقصد سے!

اس عظیم وطن کی تعمیر و پیش رفت۔ اس میں علم و تہذیب کی روشنی پھیلانے اور امن و خوشحالی مساوات و رواداری کے چراغ روشن کرنے کے لئے کبھی حکومت کے دائروں میں بیٹھ کر کبھی قومی رہنمائی کی صف میں کھڑے ہو کر انھوں نے کیا کچھ نہ کیا۔ پھر نہ صرف یہ کہ ملک سے باہر بین الاقوامی مسند پر ہندوستان کے لئے باعزت مقام حاصل کرنے میں ان کی فکر و تدبیر ہر دم مشغول کار رہی، بلکہ خاص طور پر اسلامی اور عربی ممالک سے رشتۂ اخوت و محبت کی استواری کے لئے بھی انھوں نے تعلقات و روابط کی وہ داغ بیل ڈالی جس کی قدر و قیمت ہمیں کہیں باہر نکل کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز (اور اس کے عربی و فارسی رسائل) انڈین اسکول آف فارن اسٹڈیز اور نہ جانے کتنی ساہتیہ کلا ڈیپارٹمنٹ و ادارے۔ ملک کے اندر ثانوی اور ابتدائی تعلیم کی درجہ بندیاں۔ یونیورسٹیوں کی اصلاح لازمی ابتدائی تعلیم کی اسکیم اور مسلمانوں میں ذہنی فکر و تعلیم کی تحریک۔ اربابِ علم و فن کی قدر افزائی اور وظائف تحصیل علوم مشرقی کے لئے ہندوستانی طلبہ کی سرپرستی اور امداد یہ سب کچھ چند نقوش ہیں جن کے پس منظر میں ہم مولانا مرحوم کی دیگر خدمات اور دائرۂ فکر و عمل کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ دہرانے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابوالکلام کی زندگی جو دعوتِ حق اور تذکیر سے شروع ہوئی تھی۔ آخری دم تک روشن قائم رہی اور کوئی شک نہیں کہ مولانا مرحوم نے اپنے منصب و مقام کا پورا حق ادا کیا۔

ایثار و عمل کی آزمائش گاہ میں

آج وہ عظیم شخصیت دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ ہمارے لئے اس کا نقشِ قدم ایک مشعلِ راہ ہے۔ اس عظیم شخصیت کی خدمات پوری نصف صدی پر چھائی ہوئی ہیں۔ الفاظ و بیان کے دامن کہاں ان کو سمیٹیں گے۔ حق یہ ہے کہ ابوالکلام کا مسلک ہی "عمل" تھا۔ جس سے سوانحِ آزاد کا کوئی دن اور کوئی وقت خالی نظر نہیں آتا۔

دورِ غلامی اور مغلوں کے زوال کے بعد یہی ایک عظیم شخصیت نظر آتی ہے جس نے بیک وقت ملک و ملت کو غفلت و مرعوبیت کی زندگی سے نکال کر آزادی و سربلندی کی سطح تک پہنچا دیا۔ اس ملک کے در و دیوار نے آزادیٔ کامل کی پکار ابوالکلام کے منہ سے اس وقت سنی تھی۔ جب دوسروں کے تصور بھی اس سے خالی تھے۔ پھر اس راہ میں ابوالکلام نے ایثار و فداکاری کے جو جوہر دکھائے حق یہ ہے کہ کوئی دوسری شخصیت ان کی ہمسر و ہم پلہ نظر نہیں آتی۔

ابوالکلام کو خدا نے فکر و قلم کی وہ صلاحیتیں بخشی تھیں کہ اگر وہ پھٹے ہوئے سرکنڈے کا قلم اور ایک ٹوٹی ہوئی دوات لے کر کسی درخت کے سایہ میں بوریہ بچھا کر بیٹھ جاتا۔ تو بلاشبہ عیش و دولت کے ہجوم وہاں بھی اس کو گھیر لیتے اور علم و ادب کی دنیا اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی۔

اس مقدرت و صلاحیت کے باوجود اس نے منصبِ دعوت و خدمت کو اپنایا اور اپنا سب کچھ اس راہ میں برباد کیا۔ ہر قسم کی صعوبتیں اور کلفتیں برداشت کیں۔ فاقے کئے اور چنے کے دانوں پر اپنا وقت گزارا۔ اس نے اپنے گھر کی۔ اپنے کاروبار کی۔ بیوی بچوں کی، مریدوں اور عقیدت مندوں کی کوئی خوشی نہ دیکھی۔ کوئی قدمبوسی۔ کوئی نعرۂ تقدیر و تکبیر۔ کوئی واہ واہ یا داد و آفرین نہ پائی۔ شاہانہ مزاق و استطاعت رکھتے ہوئے بھی اس کی زندگی عیش و راحت کے خیال سے یکسر خالی اور کسب و دولت کے فکر سے سراسر محروم رہی۔ غور کیجئے! انسانی بساط اس سے بڑھ کر ایثار و عمل کا کون سا معیار اور مثال پیش کر سکتی ہے!

حق یہ ہے کہ علم و فضل، خلوص و صداقت۔ ایثار و اخلاص، صبر و استقلال اور ان تمام اوصافِ ملکوتیہ کے لحاظ سے جن سے ایک کامل انسان کے فضائل ترتیب پاتے ہیں، ان کا وجود ایک آیۃ الٰہی تھا

اولئِک آبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اے مبصّر اے شبِ دیجور کے روشن چراغ!
اے جنیدِ عصرِ حاضر۔ اے مدیرِ البلاغ!
اے مجدّدِ الفِ ثانی "شیخ احمد" کی امید!
"سیّد احمد" کی تمنا۔ حسرتِ قلبِ شہید!
ذات میں فقر و امانت دونوں تا حدِّ کمال
تیری ہستی "مجمع البحرین" کی زندہ مثال!
تیرا سینہ جلوہ گاہِ نیّرِ عرشِ عظیم
تیرا دِل معمورہ "تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّبِّ الرَّحِیْم"

(انیس الحسن)

زندگی کے آخری ایام۔ مختصر علالت اور وصال!

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ——— (قرآن کریم)

اِس عالم ہست و بود میں جو بھی آیا، ایک مقررہ مدت کے لئے مہمان بن کر۔ بقا و دوام صرف ایک ہی ذات کے لئے ہے جو حقیقی سربلندیوں کی مالک اور خالق کائنات ہے۔

چنانچہ وہ عظیم الشان شخصیت بھی جس کے محاسن و کمالات، جس کی جرأت حق اور مجاہدانہ کارناموں نے اس دور آخرالزماں میں قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردی تھی اور جس کے کوہ ثبات عزائم و افکار نے اس عظیم ملک کے گویا در و دیوار ہی بدل کر رکھ دیئے۔ کم و بیش ستر سال کی مصروف و سراپا عمل زندگی اور سعی پیہم سے تھک کر ابدی و سرمدی آغوش رحمت میں مشغول ہونے کے لئے "اجل مقرر" کی منتظر تھی، کوئی شک نہیں کہ اس نے حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ اس طرح خدمت خلق میں گزارا کہ زندگی کا حق ادا کر دیا اور آنے والوں کے لئے ایک روشن مثال قائم کردی۔

گذشتہ اوراق میں آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ یوں تو جس دن سے امام الہند نے ہوش سنبھالا تھا۔ آخر عمر تک وہ مسلسل ایک عظیم مقصد کی خاطر سرگرم عمل رہے۔ لیکن خصوصیت سے زندگی کے آخری دس سال انھوں نے بے اندازہ مصروفیتوں اور ذمہ داریوں میں گزارے۔ وزارت کا منصب برائے نام ایک ذمہ داری تھی، ورنہ حقیقتاً وہ اس عظیم ملک اور اس کے چھتیس کروڑ باشندوں کے تمام بنیادی مسائل و مہمات کا محور بنے ہوئے تھے۔ کاموں کا بے اندازہ بوجھ ان پر تھا۔ ناتوانی کی عمر اور مشاغل کا ایسا ہجوم، رفتہ رفتہ ان کی ظاہری صحت پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ ورنہ جہاں تک ان کے قلب و ذہن کا تعلق ہے ان کا فروغ و سکون اسی دن سے مضمحل ہو چلا تھا جبکہ برسہا برس کی دعوت و تفہیم کے بعد بھی ان کی ہر مضطرب پکار کا جواب اعراض و تغافل سے دیا گیا اور دل دردمند کی ہر پیش کش ناقدری کے ساتھ پامال کردی گئی۔ اسی دل مضطرب کی ایک آہ تھی جو ہم نے ان الفاظ میں سنی تھی!

"۔۔۔ سچ پوچھو تو میں اب ایک جمود ہوں اور ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاردی۔ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے! تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو میں سچ کہتا ہوں کہ اس پورے ملک میں میں بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔۔۔"

پھر آخری صدمہ جو اس عظیم الشان نے قوم و وطن کی راہ میں برداشت کیا، وہ اپنی لخت جگر رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی کا سانحہ تھا۔ گو کہ اس سانحہ کا تذکرہ و تاثر اس اولوالعزم شخصیت کی زبان و قلم پر زیادہ ظاہر نہیں ہوا، لیکن وہ دل کی گہرائیوں میں کس طرح پیوستہ ہو گیا تھا اس کا اندازہ صرف ایک تحریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے اس حادثۂ جانکاہ کی خبر سن کر قلعۂ احمد نگر میں قلمبند فرمائی تھی ۔۔۔ اور جو اس مقالہ کے ختم پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

بہرحال زندگی کی آخری تقریب ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں منعقدہ کل ہند اردو کانفرنس (جس کا افتتاح وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا) تھی، جس میں "اردو زبان" کا یہ مجدد بوقت شریک ہوا اور اپنی جرأت حق و کمال خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا آخری پیغام سنا گیا۔ "اردو کو ہندوستان کے آئین میں جو پوزیشن دی گئی ہے اسے گورنمنٹ بھی تسلیم کرے اور ملک بھی مانے۔۔۔"

---

۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح تھی کہ عالم قدس میں اس علم بردار وراثت انبیاء و مصلحین کی آمد آمد کے غلغلے بلند ہونے شروع ہوئے اور ان کی صدائیں روح آزاد تک پہونچنے لگیں۔ مولانا مرحوم حسب معمول صبح سویرے اٹھے اور غسل خانہ میں گئے، اسی وقت سے سفر آخرت کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بظاہر مولانا کے جسم پر فالج کا اثر ہوا اور آناً فاناً اس خبر نے پورے ملک کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا۔ مسلسل تین دن مرض کی شدت نے مولانا مرحوم کو بے ہوش رکھا۔ درمیان میں ایک دو بار حواس میں کچھ لہر سی آئی، کسی قریبی ... ہوئے کو پہچانا۔ اسی اثنا میں پنڈت نہرو قریب آئے تو ان کو "خدا حافظ" کہا۔ یعنی شعور ذہنی سفر آخرت کے لئے مستعد ہو چکا تھا۔

ایک اور موقع پر معالجین کے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "مجھے پنجرہ میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑیئے" قفس عنصری سے آزاد ہونے کے لئے روح مضطرب تھی اور اپنے اللہ پر ایمان و اعتماد کی قوتیں بے چین!

دنیا کی رسم و ریت کے مطابق علاج و معالجہ کی تمام کوششیں پوری کی گئیں، مولانا کے معالج ... ڈاکٹر بی، سی رائے کلکتہ سے دہلی پہونچے۔ دہلی کے بھی بہترین طبی دماغ انسانی تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے۔ مگر مشیت الٰہی ان سب پر غالب رہی ——— بقول نازؔ انصاری صاحب

یہ تین دن پورے ملک و قوم نے جس کرب و اضطراب میں گزارے اس کا اندازہ بھی دشوار ہے، صدیوں میں کہیں ایسے ہمہ گیر حوادث پیش آتے ہیں

بلا مبالغہ ۔ حکومت کے اعلیٰ ترین ارکان سے لے کر آخری طبقہ تک صدر جمہوریہ، وزیراعظم، وزراء، عمائدین، عوام و خواص سب کے دماغ ایک ہی فکر کا شکار تھے اور سب کے چہرے اداس ۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایسا عزیز ترین سرمایہ ان کے ہاتھوں سے چھینا جا رہا ہے کہ پھر کسی قیمت پر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

پھر ان کے خاص رفقار کار (خواہ وہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور جواہر لال نہرو ہوں یا مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا آصف علی) ان کے اضطراب و فکر کا کیا ٹھکانا۔ چوبیس گھنٹوں میں ... بار یہ سب پھیرے کرتے تھے اور ہر بار فکر و غم کی ایک نئی تپش ساتھ لے کر جاتے تھے۔ مگر

فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ؕ

وہ ساعت جو مقرر تھی تیزی کے ساتھ قریب آ رہی تھی، یہاں تک کہ سحر خیزی کے عادی امام الہند آزادؒ ۲۲ فروری کو سوا دو بجے شب حیات مستعار کی نیند سے ہمیشہ کے لئے بیدار ہو گئے۔ اور ... سیادت کی وہ شمع فروزاں جس نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۸ء تک مسلسل ہندوستان کی وسعتوں کو نور ... صداقت سے معمور رکھا، بالآخر گل ہو گئی۔

اک ترے جانے سے مے خانہ میں کیا باقی نہیں
زندگی کی بزم باقی ہے ۔ مگر ۔ ساقی نہیں

تجہیز و تکفین اور آخری جلوس

۲۲ فروری کا سورج افق ہند پر طلوع ہوا تو اس کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے آنسو تھے جنھیں تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہو۔ پورا ملک ایک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ زندگی کے تمام کاروبار معطل نظر آتے تھے، تجہیز و تکفین اور پریڈ گراؤنڈ میں قبر و تدفین کے تمام انتظامات پنڈت نہرو ...

مولانا حفظ الرحمٰن اور بخشی غلام محمد نے خود مکمل کرائے۔ ایک بجے دوپہر تک نہ صرف دہلی اور قرب و جوار کے لاکھوں انسانوں نے اپنے "محبوب رہنما کے قدموں پر عقیدت و اقرار کے آنسو نچھاور کئے۔ بلکہ ملک کے کونے کونے سے عمائدین و رفقائے آزاد کی کثیر تعداد ہوا کے پَروں پر اُڑ کر دہلی پہونچی اور شریک ماتم رہی"۔

الغرض اس ملک اور اس کے باشندوں نے غم و اندوہ کی شدت کچھ اس طرح محسوس کی کہ شاید ایسے عظیم حادثہ سے کبھی وہ دوچار نہیں ہوئے تھے۔ ایک بجے دوپہر میت اٹھائی گئی جو لاکھوں مسلم و غیر مسلم، مرد و زن، بوڑھوں اور جوانوں کے سروں سے گزرتی ہوئی ۳ بجے پریڈ گراؤنڈ پہونچی ——— سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند نے نماز جنازہ پڑھائی اور امام الہند کا جسدِ خاکی آغوشِ رحمت کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک طرف جامع شاہجہانی کے سربلند منارے اور دوسری جانب قلعۂ حمرا کی برجیاں پکار رہی تھیں۔

نوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت
قدس اللہ سرہٗ و نور ضریحہٗ و رحمہٗ رحمۃً واسعۃً

"دہلی"

مولانا آزاد کا جدّی وطن اور آخری آرامِ گاہ

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کو مسٹر آصف علی مرحوم سے سنہ ۲۳ء ہی سے خاص تعلق ہوگیا تھا۔ سنہ ۲۳ء سے پہلے مولانا مرحوم جب بھی دہلی تشریف لاتے زیادہ تر مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ہاں شریف منزل بلیماران میں یا کبھی ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی واقع دریا گنج میں قیام فرماتے تھے لیکن سنہ ۲۳ء میں آپ کو مسٹر آصف علی مرحوم سے کچھ ایسا تعلق خاطر ہوا کہ اس کے بعد گویا آصف صاحب ہی دہلی میں حضرت مولانا کے میزبان مستقل ہو گئے۔ آصف صاحب کا مکان کوچہ چیلان میں تھا۔ وہیں مولانا قیام فرماتے تھے۔ سنہ ۴۶ء میں سینٹرل اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے آصف علی صاحب کچھ عرصہ ونڈسر پلیس نیو دہلی بھی رہے۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا کا قیام بھی وہیں ہوا۔ تقسیم ہند اور وزارت تعلیمات کا چارج لینے کے بعد مولانا مرحوم کو خود سرکاری بنگلہ مل گیا تھا۔ سب سے پہلے ۲.۲ پرتھوی راج روڈ پھر ۱۹ اکبر روڈ اور پھر سب سے آخر میں ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ نیو دہلی آپ کی رہائش رہی۔ اور بالآخر اسی بنگلہ سے آپ اپنی ابدی و سرمدی آرام گاہ پریڈ گراؤنڈ زیر جامع مسجد دہلی منتقل ہوئے۔

سرزمین دہلی جس کی آغوش میں نہ جانے کتنے سلاطین و حکمراں، قائدین و مجاہدین، علماء و اتقیاء، مشائخ و صوفیاء نے آنکھیں کھولیں، پرورش پائی اور بالآخر اسی کے دامن شفقت میں ہمیشہ کے لئے آسودۂ خواب ہو گئے۔

آخری زمانہ میں جبکہ انسانی محاسن و کمالات کی ایک جامع شخصیت عالم ظہور میں آنے والی تھی شاید قدرت کا فیصلہ یہی تھا کہ اس کا خمیر بھی دہلی ہی کی خاک سے اٹھے اور بالآخر اسی کے دامن میں آسودۂ رحمت ہو۔ سرزمین دہلی مولانا مرحوم و مغفور کا جدی وطن بھی تھی اور ان کی آخری منزل مقام بھی!

ایک وسیع میدان میں جس کی ایک جانب دنیوی سطوت و اقتدار کی عبرت سرا "قلعہ حمراء" اپنی زبانِ حال سے فسانۂ روزگار سنا رہا ہے اور دوسری جانب دینی عظمت اور روحانی فیوض و انوار کی مہبط یہ جامع شاہجہانی "اپنے سربلند میناروں پر صداقت و ایمان کی سدا بہار شمعیں لئے کھڑی ہے۔ ان دونوں تاریخی عمارتوں کے وسطیا ——— پریڈ میدان کے قلب میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ کو ابدی و سرمدی آغوشِ رحمت نصیب ہوا۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ مولانا کی ذات ان دونوں ہی عمارتوں کے شکوہ و عظمت کی ایک انسانی تصویر تھی!

اپنے انتقال سے ایک ہفتہ قبل (۱۵ فروری ۵۸ء) اسی دن (سنیچر) اور اسی وقت (۳ بجے دوپہر) ٹھیک اسی میدان میں آپ نے اردو کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اپنی آخری تقریر ارشاد فرمائی تھی۔

ابوالکلام آزاد

(خواجہ مقبول احمد ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی)

شبنم بھی تھا وہ پھول بھی شعلہ بھی آگ بھی
میداں میں برق و رعد تو محفل میں راگ بھی
باطل کے حق میں نیش بھی نشتر بھی ناگ بھی
بے شبہ تھا عروسِ وطن کا سہاگ بھی

آزاد بن کے ملک کو آزاد کر گیا
فتح و ظفر سلام کو آئیں جدھر گیا

وہ عرصۂ سیاست و مذہب کا شہسوار
اہلِ نظر کے واسطے اک دُرِّ شاہوار
قوم و وطن کی لاج تو تہذیب کا وقار
امید کی ضیائے جبیں جس کی زرنگار

خاور کو جس پہ فخر ہے قرآں کو ناز ہے
آغوشِ قبر میں وہ دلِ پاکباز ہے

کیا کیا ہوئے نہ صبر و تحمل کے امتحاں
کیا کیا نہ قید و بند کی جھیلی تھیں سختیاں
کی ایک بار اُف نہ مگر کھول کر زباں
خرمن پہ دل کے ٹوٹ پڑیں گرچہ بجلیاں

کھو کر رفیقِ زیست بھی ثابت قدم رہا
خود جبر کا بھی سر پئے تسلیم خم رہا

انسانیت کی راہ سے کانٹے ہٹائے کون؟
دیر و حرم کو ایک ہی جادہ پہ لائے کون؟
بھٹکے ہوؤں کو رمزِ محبت سکھائے کون؟
رازِ درونِ میکدہ ہر دم بتائے کون؟

محفل اداس ہے رُخِ زیبا نہیں رہا
نرگس کو غم ہے دیدۂ بینا نہیں رہا

(حافظ محمد اسحاق حافظ سہارن پوری)

وہ امامِ ہند جانِ انقلاب
آج دنیا میں نہیں جس کا جواب
ہوگیا ہے آہ اے حافظ غروب
آسمانِ علم کا وہ آفتاب

ثبت ہے عظمت پہ تیری مُہرِ توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تربت، فلک رفعت مزار

انیس الحسن

یوسف اور زلیخا

مولانا آزادؔ کی گھریلو زندگی اور نجی کے حالات سے خواص بھی بہت ہی کم واقف ہو سکے۔ ان کی افتادِ طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ انکی خلوتوں تک کسی کا گذر بہت دشوار تھا

تاہم بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس نیک نفس، مسکین مزاج، شریف و پاکباز، پیکرِ صبر و رضا، پردہ نشین بی بی "زلیخا" (بیگم آزاد) کے تذکرہ سے اوراق خالی رہیں، جو گھریلو زندگی میں صحیح معنیٰ میں مولانا مرحوم کی رفیقۂ حیات تھی اور جس نے عُسر و یُسر، تنگی و فراخی، آسائش و کلفت راحت و مصیبت ہر حال میں خوش رہ کر اپنے رفیقِ حیات "یوسفِ ہندی" کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ جس نے برسوں ہجر و جدائی، مالی مشکلات اور گھریلو پریشانیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ مگر کبھی حرفِ شکایت سے زبان و دہن کو آشنا نہ ہونے دیا۔ یقیناً اس پیکرِ صبر و ایثار نے زندگی کی یہ تمام کلفتیں محض قوم و وطن کی پاداش میں اٹھائیں۔ اور ہماری تاریخ کے صفحات ہمیشہ اس نیک نہاد خاتون کے ذکر و احسان سے گرانبار رہیں گے۔

مولانا خیرالدین مرحوم و مغفور نے اپنے چہیتے بیٹے "ابوالکلام" کے لئے جو نہ صرف اپنے ظاہری حسن جمال کے لحاظ سے بلکہ محاسن اخلاق و اوصاف، علو ہمت اولوالعزمی، استقامت و راستبازی کے اعتبار سے بھی ہندوستان کا "یوسف صدیق" تھا۔ ان کی نوعمری ہی میں "زلیخا" تلاش کرلی تھی۔ ان کے متوسلین خصوصی میں آفتاب الدین نامی ایک بزرگ تھے۔ زلیخا ان کی بیٹی تھیں، جو کم سنی ہی میں اپنے یوسف کے دامن ازدواج سے وابستہ ہوئی تھیں۔ یہ ایک شریف مشرقی گھرانے کی پردہ نشین خاتون تھی۔ وفا شعاری اور شوہر کی سچی رفاقت و غمگساری اس کا کردار تھا۔ ہم نے دوسرے لیڈروں کی طرح کبھی "بیگم آزاد" کے نام سے اس کو کسی بزم و اجتماع میں دیکھا نہ سنا۔ حد یہ ہے کہ "آزاد" کی زندگی نصف صدی تک اس ملک میں صحافت، ادب، سیاست اور مذہب کا عنوان بنی رہی لیکن "بیگم آزاد" کی کوئی پرچھائیں کبھی پیکر الفاظ و اوراق میں بھی نہیں دیکھی گئی۔

آج کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم و مغفور کے سیاسی عزائم اور دینی و علمی کاوشوں میں یہ وفا شعار بیوی کس درجہ رفیق و مددگار ہوئی ہوگی جس نے مہینوں اپنے شوہر کے پاس بیٹھ کر گرمی کے زمانے میں کئی کئی گھنٹے ہاتھ سے پنکھا جھلا جب کہ وہ ترجمان القرآن کی ترتیب تدوین فرماتے تھے۔

خود مولانا مرحوم نے اپنی تحریر میں اعتراف کیا ہے کہ "وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی۔ اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار، اس نے نہ صرف پوری زندگی میرے حالات کا ساتھ دیا، بلکہ پوری ہمت و استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کئے۔"

دنیا سے وہ رخصت ہوئی تو ایسے حال میں کہ اس کا محبوب شوہر محض قوم اور وطن کی خاطر اس سے بہت دور اسارت و نظربندی میں اپنا وقت گذار رہا تھا۔ مولانا مرحوم کی زبان یا قلم سے ہم نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔ ہاں — صرف ایک بار اس کی یاد خلشِ دل کی ایک تصویر بن کر زبانِ قلم تک آئی ہے۔ جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ مولانا مرحوم کو مرحومہ سے کیسا تعلق خاطر تھا اور اس کی یاد نے مولانا کے دل و دماغ پر کتنے گہرے نقوش باقی چھوڑے ہیں

اگلے صفحہ پر ہم مولانا کا وہ مکتوب پیش کر رہے ہیں، جس کا لفظ لفظ نقشِ محبت اور فقرہ فقرہ تصویرِ غم ہے۔

۱۹۔ اپریل ۱۹۴۳ء کو زلیخا مرحومہ کی وفات ہوئی۔ اس سانحہ کا تاثر بے اختیار ایک مکتوب کی شکل میں مولانا مرحوم کے قلم تک آگیا ہے۔ قلعہ احمد نگر کی نظربندی ہی میں یہ مکتوب مولانا نے تحریر فرمایا تھا۔

۱۹۴۵ء میں رہائی کے بعد جب مولانا آزادؔ سب سے پہلے کلکتہ پہونچے ہیں اور اپنی زلیخا کی قبر پر حاضر ہوئے۔ چھتیس سالہ زندگی کی رفاقت ان کی آنکھوں میں تصویر کی طرح یکبارگی ابھر کر آئی۔ ہاتھ بے اختیار سوالی بن کر غفور الرحیم کی جانب اٹھ گئے۔ زبان پر سوالِ مغفرت تھا۔ اور آنکھیں اعترافِ حق و رفاقت سے معمور!

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ پوری زندگی میں صرف یہی ایک موقع تھا جب کہ امام الہند کی آنکھیں اشک بدامن دیکھی گئیں!

قلعہ احمد نگر

۱۱۔ اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از نشتر آں می سوختیم آخر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم!

صدیق مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آیا روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا، پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں۔ یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے مہر بتاں
چگونہ حرف زنم دل کجا دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا، مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا۔ تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا۔ مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا[1]۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے تھے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی اعتماد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ

میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی، میں نے کہا، اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں ہماری یہ آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی، کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کے افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا۔ بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد ایک عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷۔ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا۔ اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی، اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات بلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط عزیزی کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی۔ تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے، نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے۔ اس لئے ابتدا سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جا سکتا ہے۔ نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا۔ اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر

[1] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمد نگر جیسا فوجی قلعہ لڑائی کے ماتحت لے لیا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہئے، وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے، خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے، بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہونچ سکتا ہے

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (CODE) میں لکھا گیا تھا، سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا، معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اسکا ذکر کر دیتا تھا

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی، وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا، پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا، اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی، سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے، میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقہ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا۔ لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چار وقت کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں۔ اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا، ٹھیک وقت پر کمرے سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا، بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے، لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی، اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا، جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں ۱۲ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے، جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی، لیکن بعد میں فوراً چونک اٹھتا، میرے صوفہ کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا، تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھانے کا ایک پارٹ تھیں جو دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے کیں صورت بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فانّ ما تحذرین، قد وقع!

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی، وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جونہی انھیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں

غافل نیم ز راہ دلے آہ چارہ نیست   زیں دہر ناں کہ بر دل آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے، نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا   رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال اتبکی کل قبر رأیتہ   لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا   فدعنی فہذا کلہ قبر مالک

اب قلم روکتا ہوں، اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اٹھتے

سو را خدا کے واسطے کر قصہ مختصر   اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبار خاطر سے)

مولانا آزادؒ کے متعلق :

کچھ یادداشتیں

مرتبہ :۔ عبد السلام ہاشمی مرادآبادی

اسفار

عمرِ عزیز کے اولین سال حجاز مقدس میں گذار کر اپنے والد ماجد کے ہمراہ مولانا آزادؒ ہندوستان تشریف لائے اور کلکتہ میں قیام فرما ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں آپ نے مشرق وسطیٰ کا پہلا سفر کیا جس میں عراق۔ شام۔ فلسطین اور مصر وغیرہ میں کئی ماہ گذارے

دوسرا سفر آپ نے آزادیٔ ہند کے بعد وزیر تعلیم کی حیثیت میں کیا۔ اس سفر میں آپ ایران۔ ترکی۔ فرانس۔ انگلستان اور جرمنی تشریف لے گئے تھے۔ انڈیا آفس کی عظیم الشان لٹریری امانت اور بعض اہم تاریخی دستاویزات کی واپسی کے بارے میں آپنے برطانوی حکومت کے ارباب اقتدار سے اسی سفر میں گفتگو فرمائی تھی۔

اردو صحافت کے وہ گلدستے

جنھیں مولانا آزادؒ کے قلم اعجاز رقم نے چار چاند لگائے

مخزن لاہور۔ وکیل امرتسر۔ الندوہ لکھنؤ۔ خدنگ نظر لکھنؤ
دار السلطنت کلکتہ۔ احسن الاخبار کلکتہ۔ نیرنگ عالم
لسان الصدق ۱۹۰۳ء میں اور پھر الہلال و البلاغ ۱۹۱۲ء میں
خود مولانا مرحوم نے جاری فرمائے

مولانا آزاد اور انڈین نیشنل کانگریس

۱۹۲۰ء سے مولانا علیہ الرحمۃ اپنے سیاسی عزائم و افکار کے مطابق انڈین نیشنل کانگریس کو اپنا چکے تھے۔ کم عمری تھے کہ ۱۹۲۳ء میں پہلی بار آپ کو آل انڈیا کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ آپ کو قومی قیادت کا یہ اعزاز حاصل ہوا اور بالآخر جنگ آزادی کی سب سے اہم اور آخری منزل آپ ہی کی سپہ سالاری میں طے ہوئی۔ برطانوی حکومت سے انتقال اختیارات کی طویل گفتگو اور عملی تشکیل ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں عمل میں آئی۔

اسیری و نظر بندی کے ۱۶ سال

رانچی ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۰ء

مولانا ڈیگورولا میں نظر بند رہے اس مدت کا خاص شغل درس قرآن اور تدوین تفسیر و تذکرہ تھا۔

علی پور جیل کلکتہ ———— ۱۹۲۱ء
نینی جیل الہ آباد ———— (دوبار)
میرٹھ سنٹرل جیل (جہاں ترجمان القرآن جلد ۲ مکمل فرمائی) ۲ دوبار
گونڈہ جیل ———— (")
مرادآباد جیل ———— (مختصر وقفہ)
دہلی ڈسٹرکٹ جیل ———— ۱۹۳۲ء
قلعہ احمد نگر ———— ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء

(غبار خاطر، کاروان خیال قلعہ احمد نگر ہی کی یادگار ہیں)

الیکشن

دستور ساز اسمبلی کے رکن رہنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جب دستور ہند کے تحت پہلی ہند پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو مولانا آزادؒ رامپور (یوپی) سے دار العوام (لوک سبھا) کے لئے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ پارلیمنٹ کے لئے دوسرا الیکشن آپنے ۱۹۵۷ء میں ضلع گوڑگانوہ کی مرکزی سیٹ پر لڑا تھا اس میں بھی مولانا کو نہایت شاندار کامیابی ہوئی تھی پہلے الیکشن کے موقعہ پر مولانا صرف دوبار تین تین روز کے لئے رامپور تشریف لے گئے تھے لیکن اپنے دوسرے الیکشن میں انھوں نے ایک گھنٹہ کے لئے بھی اپنے حلقۂ انتخاب کا دورہ نہیں کیا

عزیز و اقارب

والد ماجد! مولانا خیر الدین رح - والدہ ماجدہ! مدینہ منورہ کے مفتی اکبر الشیخ محمد طاہر کی صاحبزادی تھیں - مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابو النصر نصیر الدین غلام یٰسین تھے جن کے بیٹے مسٹر نور الدین ہیں - تین بہنیں تھیں :- محمود بیگم (آرزو بیگم) فاطمہ بیگم (آبرو بیگم) تیسری بہن کا نام معلوم نہ ہوسکا -

علمی یادگاریں

مولانا مرحوم کی تالیف صحیح معنیٰ میں صرف ترجمان القرآن ہی کو کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنی اصل تفسیر جو برہان و بصائر کے نام سے مرتب فرمائی تھی اس کے تمام مسودے سی آئی ڈی کی تلاشیوں میں ضائع ہو گئے۔ موجودہ ترجمان القرآن اسی طویل تفسیر کے مطالب و مفاہیم کا خلاصہ ہے۔ دوسرے درجہ میں تذکرہ - یوں متعدد خطبات۔ مقالات۔ مکاتیب اور تراجم و مضامین کتابی شکلوں میں شائع ہوچکے ہیں جن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں :-

مسلمان عورت	شہید اعظم	خون شہادت کے دو قطرے	سرمد شہید	انانیت موت کے دروازہ پر	
مسلمان اور کانگریس	انڈین نیشنل کانگریس	اتحاد اسلامی	لیلۃ القدر	ولادت باسعادت	خطبہ احیاء ملت
مقام دعوت	الحرب فی القرآن	اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان	افسانہ ہجر و وصال	حجت ابراہیمی	حقیقت الصلوٰۃ
حقیقت الصوم	حقیقت الزکوٰۃ	حقیقت الحج	غبار خاطر	کاروان خیال	——

میرے الفاظ و معانی میں

علامہ انور صابری

میری زندگی کا گہرا مطالعہ وہی کر سکتا ہے جس نے میرے چہرہ کے خطوط کو بغور پڑھا ہوا دران قدرتی لکیروں میں فطرت کے جس قدر عنوانات عطا پنہاں ہیں اُن کو سمجھنے کی پوری کوشش بھی کی ہو۔

میرا چھریرہ بدن اُن کروڑوں بندگانِ خدا کی زندگیوں کا بے زبان ترجمان ہے جو سکونِ حیات سے محرومی کا مرثیہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں۔

میری پلکوں آنکھوں میں فلکِ کج رفتار کی وہ سب گردشیں سمٹ کر آگئی ہیں جن سے مجھے عمر بھر کھیلنا تھا۔

میری نظریں مشاہدۂ قدرت کی زمین ہیں۔ اور اُن کی دُوربین قوتِ نگاہ ملنے والے ہر انسان کی کتابِ عارض میں وہ حقیقتیں تلاش کر لیتی ہے جن سے وہ خود بھی واقف نہیں ہوتا۔

آپ میرے ہونٹوں کے مشیت زاد تبسم پر نہ جائیے، وہ نجانے کتنی نمناک تلخیوں کا رازدار ہے۔ میں اس لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ اپنے آنسوؤں میں دُنیا کو بہالے جاؤں۔ میری ہنسی ان تمام غموں کی آئینہ دار ہے جو انسان کو انسان کے ہاتھوں پیش آتے ہیں۔

میں بولتا ہوں تو آپ میرے ہونٹوں سے برسے ہوئے کانٹوں کو دلوں میں چبھونے کی طرف مائل نہیں ہوتے بلکہ اُن کی رنگینی کے دامن میں پھول تلاش کرتے ہیں۔

میرے رُخساروں کی جھرّیاں تقدیرِ عالم کی پیشانی پہ اُبھرتی ہوئی شکنیں ہیں۔ میرے ماتھے پر کبھی کبھی آپ کو بساطِ شبنم کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ میری حرارتِ قلب و جگر اور سوزشِ نفس کا ہی ایک پرتو ہے پر تو بھی وہ جسے لالہ زاروں کی آتشِ گل کا نکھار کہا جا سکتا ہے

یہ میری اُنگلیاں جنھیں اربابِ کائنات کے ہر پردہ کو چھونے کی عادت ہے۔ بار بار زندگی نواز تاروں سے جنگیت تراشتی ہیں۔ لوگ انہیں سنتے ہیں، سر دُھنتے ہیں لیکن آہ! اس کے ساتھ اُن کے تاثر کو بھولتے بھی جاتے ہیں

میرے ہاتھ میں دوسروں کو مفہومِ دل بتانے کا آتار چڑھاؤ بالکل فطرتی ہے اور وہ مختلف "پست و بلند" حرکتوں سے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ ترتیب دیتے رہتے ہیں، اس تاریخ کا ہر ورق عبرت و موعظت کا ایک نیا عنوان دکھاتا ہے

میری متانت و سنجیدگی چند طبعی مجبوریوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ میں مخاطب سے نقوشِ جبیں سے اس کی رفعت و منتہائے فکر کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں اور جب یہ محسوس کر لیتا ہوں کہ میں اپنی بات سمجھا نہیں سکا۔ تو میرا گریز کلام وہ رُخ اختیار کر لیتا ہے جس نے "آہوئے گریز پا" کے حسین اندازِ خرام کو ممکن ہے درسِ رمیدگی دیا ہو۔ — کبھی کبھی میں اپنے آپ کوئی داستانِ دل چھیڑ کر خود اپنی طرف روئے سخن موڑ لیتا ہوں آپ اسے میری دیوانگی سے تعبیر کیجئے یا اپنے تغافلِ آزاد ناشناس کا خطاب دیجئے۔ یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ کون ذی ہوش تھا اور کون وارفتۂ عقل و خرد!

اگر آپ ہر اُس آدمی سے مرعوب ہوتے ہیں جس کے جسم پہ امیرانہ لباس ہو اور دسترخوان پر شاہانہ غذائیں۔ تو میں نے تکلف سے بری حُسنِ ذاتی کو اُن ذہنی زنجیروں کا پابند نہیں کیا۔ اور سر سے لے کر پاؤں تک اُسی تمدّن کو اپنایا جسے میرے ابنائے وطن و ملت کی میراثِ عزیز کہا جا سکے۔

میں دمِ رفتار ہر قدم سنبھال کر اُٹھاتا ہوں
تیز گاموں کی وہ ٹھوکریں مجھے یاد ہیں جن میں
لاعلاج چوٹیں کرب انگیزیوں سے
اپنا رشتۂ محبت استوار کرتی
رہتی ہیں۔

مجھے آپ پریشان خاطر انسان نہ سمجھیں میری اپنی ذاتی کوئی پریشانی نہیں ہاں! آپ کی پریشانی کبھی کبھی میری آستینوں کا دامن ضرور تر کر دیتی ہے اگرچہ "نا سرِ مژگاں مچل کر نہیں آتی۔

آپ جب درمند تصویروں کا البم لے کر میرے سامنے آتے ہیں تو میرا جذبۂ اخوّت و مودت آپ کے تغافل و گریز کے تمام قصے فراموش کر کے وہی راہ اختیار کرتا ہے جسے میں اُن تمام عظیم انسانوں کی شاہراہ سمجھتا ہوں جنھوں نے "خدمتِ خلق" کے انمول عناصر کو سیاست و اخلاق کا گہوارہ بنانے میں مجھے مدد دی۔

شاید اب آپ سمجھ گئے ہوں گے! میں ہوں! "ابوالکلام"

خدا کی بخششوں سے گراں بار و فیروز بخت "ابوالکلام"

اور آپ کے اعراض و تغافل کا شکوہ گذار! "ابوالکلام"

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں ڈیڑھ سال

از کاتب ترجمان القرآن منشی عبدالقیوم خاں صاحب خطاط (مراد آباد)

مولانا ابوالکلام آزاد کی عظیم الشان اور جامع کمالات شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے جس علم و استعداد اور اہلیت کی ضرورت ہے اس سے یہ نقال کاتب یکسر عاری ہے اور جس انشاء نویس قلم کی زبان درکار ہے وہ خامۂ بیجد رقم کو کہاں حاصل؟ ملک کے صاحب علم و اہل قلم حضرات اور شعراء نے بہت کچھ تحریر فرمایا اور آئندہ بھی برابر لکھا جاتا رہے گا۔ اس وقت ایک حکم کی تعمیل میں قلم سے کام لینے کی ناکام کوشش کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ لیکن حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ مجھے اکتوبر ۱۹۳۲ء سے مارچ ۱۹۳۴ء تک ڈیڑھ سال مولانا کی خدمت میں حاضر رہنے کا اتفاق ہوا۔ پس اسی زمانہ کے کچھ مشاہدات پیش کر سکوں گا۔

مولانا کی عظمت کے پیش نظر میرے قلب میں اکثر یہ آرزو ابھرتی تھی کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا فخر حاصل ہوتا تو اچھا تھا۔ لیکن اس کی کوئی شکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں جب ترجمان القرآن کی جلد اول شائع ہو کر سامنے آئی تو اس کی کتابت کی ترتیب کچھ موزوں اور مناسب نظر نہ آئی (بحیثیت ایک کاتب کے یہ بجھ بھی کیا سکتا تھا؟) ہر صفحہ پر متن کی چند سطروں کے تحت جو ترجمہ مسطور تھا وہ متن کے مطابق نہیں چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خیال ہوا کہ اگر میں اس خدمت کو انجام دیتا تو یہ نقص رونما نہ ہوتا۔ متن اور ترجمہ کو خود ہی لکھتا اور مطابقت کو ملحوظ رکھتا۔

اس جلد کی کتابت اس طرح ہوئی کہ تفسیر سورۂ بقرہ کی کتابت کے بعد نسخ نویس کاتب نے ہر صفحہ کی چند سطروں میں آیات قرآن مجید لکھ کر کاپیاں لکھنے کے لئے ایک دوسرے کاتب کو دیدیں۔ اس نے خالی چھوڑی ہوئی سطروں میں مسلسل ترجمہ لکھ ڈالا۔ اس طرح متن اور ترجمہ میں مطابقت برقرار نہ رہی۔ ترجمہ متن کو چھوڑ کر آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ سورہ کے ختم پر کئی صفحے ترجمہ کے آخر میں لکھنے پڑے۔ سورہ بقرہ جب اس طرح تمام ہوئی تو اب ایک دوسری صورت اختیار کی گئی یعنی ہر صفحہ کی ابتدائی چند سطر متن کے لئے چھوڑ کر پہلے ترجمہ لکھا گیا اور ترجمہ کے مطابق متن کو لکھنے کے لئے کہیں گنجان اور کہیں کشادہ تحریر کرنا پڑا۔ یوں خط نسخ کی موزونیت اور ہمرنگی باقی نہیں رہی۔

کتابت کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے مولانا سے درخواست کی کہ اگر دوسری جلد کی کتابت کی خدمت مجھ سے لی جائے تو میں اس کام کو مناسب طریق پر انجام دے سکوں گا۔ ساتھ ہی اپنے خط نسخ و نستعلیق کا نمونہ بھی منسلک کر دیا۔ میری درخواست کو شرف قبول حاصل ہوا لیکن کام کئی سال تک شروع نہ ہو سکا۔ بالآخر مارچ ۱۹۳۲ء میں یاد فرمایا اور لکھا کہ ہم اپریل کو دہلی پہنچ رہا ہوں آکر ملو تاکہ بالمواجہ گفتگو ہو جائے۔ دہلی پہنچ کر خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو ہو کر بات طے ہو گئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۲ء کو کلکتہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

شاہرہ اُجرت کتابت فی صفحہ جو طے ہوئی تھی۔ نیز میں نے اقرار کیا تھا کہ ہر ماہ نقد یا مقبوضہ ہی لے لیا کروں گا آخر میں حساب ہو جائے گا۔ کتابت جس انداز خاص اور پابندی کے ساتھ شروع ہوئی تو میں تین صفحے یومیہ کی شرط کو پورا نہ کر سکا۔ میں نے عرض کیا کہ اب میں بجائے فی صفحہ کے تنخواہ لوں گا۔ مولانا نے کچھ تامل کے بعد اسے مان لیا۔

کتابت کے لئے اول چار پانچ اوراق مسودہ کے ملے اور پھر ایک ایک دو دو صفحے تازہ تحریر شدہ آتے رہے۔ پہلا جزء جب لکھ کر پیش کیا تو دیکھ کر فرمایا کہ میں تو خیال کرتا تھا کہ متن اور ترجمہ کو مطابق لانا دشوار ہوگا مگر تم نے اسے خوب نبھا لیا اچھا کیا۔

زمانہ قیام میں یہ حقیقت روشن ہوئی کہ حصول حریت و آزادی کے لئے مولانا جس دشت پُرخار کو طے فرما رہے ہیں اس میں ایک ایسی تنگ و تاریک اور طویل وادی بھی پیش آ گئی ہے جس کو قرضوں کے سنگہائے گراں نے دشوار بنا رکھا ہے۔ باوجود ان تمام مشکلات و موانع کے مولانا بڑی باتدبیری جرأت اور غیر متزلزل استقلال کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔

ان دنوں جس کوٹھی میں مولانا قیام فرما تھے۔ اس کا کرایہ دو سو روپیہ ماہوار تھا۔ بالائی منزل میں خود مولانا رہتے تھے اور زیریں منزل عمری بے (ایک ترک) کو ساٹھ روپے ماہوار پر دی رکھی تھی جس میں ان کی ایک کشمیری بیوی معہ اپنے دو نوجوان لڑکوں کے رہتی تھی اور خود عمری بے اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اکثر باہر رہتے تھے (یہ عربی اور انگریزی زبان سے خوب واقف تھے۔ امر یکہ بھی ہو آئے تھے مولانا سے عربی زبان میں بڑی روانی کے ساتھ دہلی زبان کی طرح گفتگو کرتے ہوئے دیکھا) ان سے جو کرایہ ماہوار وصول ہوتا تھا وہ ذاتی ضرورتوں میں کام آجاتا تھا اور کوٹھی کا کرایہ ادا نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس زمانہ میں آمدنی کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا اور قرض کا بار مزید براں۔ غرض بڑی ہی عسرت کا دور تھا

سامان خوراک آٹا، دال، چاول، گھی، تیل اور مسالہ روزانہ ایک دوکان سے قرض آتا تھا اور ماہوار اس کا حساب ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایک بنگالی معتقد اپنے گاؤں کے تالاب کی چھوٹی چھوٹی زندہ مچھلیاں لے آتا تھا جن کو کوٹھی کے مختصر سے حوض میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ دو تین روز کام میں آتی تھیں ایک اور معتقد اکثر گوشت پہونچا تا تھا اور کبھی مرغ۔

اندرون خانہ کوئی خاص خادمہ نہ تھی باہر صرف ایک بنگالی خادم سید علی نامی تھا جو بازار کے معمولی کام کرتا۔ صبح کو باورچی خانہ میں چائے کا پانی جوش دیکر اور دودھ گرم کر کے اوپر بھیج دیتا دال چاول بھی تیار کر دیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک بہاری بیوہ عورت جو اکثر مولانا کی خوشدامن کے پاس آیا کرتی تھی نیچے باورچی خانہ میں آکر رہنے اور کھانا تیار کرنے لگی تھی۔ کھانا بہت معمولی ہوتا تھا۔ ترکاری میں عموماً تیل استعمال ہوتا تھا۔ میں بطور مہمان کے تھا۔ چائے بھی عام ہوتی تھی صبح و شام ایک ایک پیالی میرے لئے بھی مقرر تھی۔ صرف ایک بار صبح کو مولانا کے ساتھ بھی چائے پینے کا اتفاق ہوا۔ چائے کے ساتھ بنگالی قسم کے صرف خشک پاپے تھے۔ مولانا خود بھی اپنے لئے علی الصباح چائے تیار کر لیتے تھے کیونکہ آخر شب میں بیدار ہونے کے عادی تھے اور اپنے ہاتھ سے تیار کی ہوئی چائے کبھی مجھے بھی بھیج دیتے تھے۔

ان دنوں مولانا کے متعلقین حسب ذیل تھے:۔

مولانا کی بیگم۔ بیگم صاحبہ کی چھوٹی بہن (ان کی شادی نہیں ہوئی تھی) خورشید امن نورالدین (مولانا کے بھتیجے) مولانا کی بڑی ہمشیر جو ایک علیحدہ مکان میں رہتی تھیں ان کے کفیل بھی مولانا ہی تھے۔

سورۂ کہف کے آخر میں ایک طویل نوٹ ذوالقرنین پر تحریر فرمایا ہے۔ اس کی کتابت کرتے ہوئے میں نے جب یہ جملہ لکھنے کے لئے پڑھا: "ذوالقرنین کے قدم بحر اسود کے جنوبی ساحل پر جا کر رک گئے اور اس نے سورج کو بحر اسود کے گدلے پانی میں غروب ہوتے ہوئے دیکھا" یہ میری سمجھ میں نہ آیا اور کاپی پر نہیں لکھا اور مولانا کو کہلا بھیجا کہ مجھے کچھ دریافت کرنا ہے جب آپ تشریف لائیں گے عرض کروں گا۔ حسب معمول بعد عصر تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ جب کوئی شخص جنوبی ساحل پر کھڑا ہو تو اس کا رخ شمال کی جانب ہوگا اور غروب کا منظر دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا منہ مغرب کی طرف ہو۔ کچھ سوچ کر فرمایا "اچھا اسے واپس کر دو" پھر اس جملہ کی بجائے دوسری

عبارت لکھ کر بھیجدی۔

جس وقت جلد دوم کی آخری سورت "المومنون" کی کتابت سے فارغ ہوا اُس وقت سورۂ "نور" کے ترجمہ کا مسودہ بھی مجھے مل چکا تھا، لیکن چونکہ کتاب کا حجم کافی ہو چکا تھا اس لئے اس کو آئندہ جلد کے لئے رہنے دیا گیا۔ کتاب جب چھپ کر تیار ہو گئی تو ان چھ ہزار جلدوں کو شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لاہور کو دیدیا گیا۔ شیخ صاحب لاہور سے اور مولانا کے ایک معتمد مستری محمد صدیق مرحوم بجنور آ گئے۔ میں مدینہ پریس میں موجود تھا۔ مستری صاحب نے شیخ صاحب سے روپیہ وصول کر کے پریس کا بل اور میرا مطالبہ پورا کر دیا اور بقیہ روپیہ مولانا کو بھیج دیا۔ اس طرح جو کچھ وصول ہوا اس کا بڑا حصہ قرضوں میں ادا ہو کر شاید ایک قلیل ہی رقم پس انداز ہوئی ہو گی۔

میں مرادآباد میں مقیم تھا کہ اوائل ۱۹۳۵ء میں سورہ نور کا وہی ترجمہ قرآن مجید کی ایک جلد کے ساتھ موصول ہوا پیکٹ وصول کر کے تو میں سمجھا تھا کہ اس دفعہ تو مولانا نے تیسری جلد کا پُرا مسودہ ہی ارسال فرما دیا ہے لیکن جب کھولا تو دیکھا کہ وہی ایک سورت کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ایک مجلد قرآن مجید۔! اس طرح اب تیسری جلد شروع کی گئی اور جب میں نے مزید مسودہ طلب کیا تو اب مولانا کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ تھا۔ کتابت شدہ بیس صفحات میرے پاس عرصہ تک پڑے رہے۔ شاید ایک سال بعد واپس کئے گئے۔

جلد اول کو شائع ہوئے جب چودہ پندرہ سال گذر چکے تو وہ قریب قریب تمام ختم ہو گئی بازار میں تلاش کرنے سے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ اس وقت اس کا ہدیہ ۲۵ تک پہنچ چکا تھا ۱۹۴۶ء کے شروع میں معلوم ہوا کہ مولانا نے بزمانہ قید۔ قلعہ احمد نگر تفسیر سورۂ بقرہ میں مزید اضافہ فرمایا ہے اور ترجمہ پر بھی نظر ثانی کی ہے۔ اخبار زمزم لاہور والے اس جلد کو حاصل کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض سے ایک بار پھر کلکتہ پہونچا اور نور الدین صاحب سے مل کر گفتگو کی۔ اس دفعہ یہاں علم میں آیا کہ اب کوٹھی کی وہ زیریں منزل ایک دوسرے شخص کے پاس دو سو روپے ماہوار پر ہے اور ان دونوں سے مولانا کی عدم موجودگی میں گھر کا خرچ چل رہا ہے اور قرض کا بار بڑھ رہا ہے۔

ترجمان القرآن جلد اول کی دوبارہ کتابت میرے ہی سپرد ہوئی جس کو میں نے دوسری جلد کے طرز پر لکھا اور پہلے اڈیشن کی خامیوں کو دور کر دیا۔ دوران کتابت میں نظر آیا کہ ایک آیت کا ترجمہ ہی چھوٹ گیا ہے۔ میں نے مولانا کو مطلع کیا۔ مجھے لکھا:۔ "خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے اس فروگذاشت کو محسوس کر لیا۔ آیت کا ترجمہ لکھ کر بھیج رہا ہوں"۔

ہر چہار شنبہ کو پندرہ بیس اشخاص جو عموماً بنگالی یا بہاری معلوم ہوتے تھے شہر سے آتے تھے۔ یہ مولانا کے مرید تھے۔ ان کے لئے ملاقاتی کمرہ میں دری کا فرش کر دیا جاتا تھا اور خود مولانا کرسی پر تشریف فرما ہوتے اور اُن کی جانب متوجہ ہوتے۔ کبھی کبھی کوئی جدید شخص بھی حلقۂ مریدین میں داخل ہوتا۔ مولانا سلسلہ قادریہ کے شیخ ہیں غالباً اپنے والد مولانا خیر الدینؒ ہی سے اجازت بیعت و خلافت پائی ہو گی۔

اپنے قیام کے ابتدائی ایام میں میں نے دیکھا کہ مولانا نماز کے لئے قریب کی مسجد میں تشریف نہیں لاتے۔ کچھ دنوں کے بعد فجر اور مغرب کی نماز میں آنا شروع کیا تو مسجد کے امام نے امامت مولانا کو سپرد کر دی۔ پھر جمعہ میں بھی تشریف لائے اور نماز جمعہ پڑھانے لگے۔ خطبۂ اول کسی خاص عنوان پر اردو میں کافی طویل ہوتا تھا اور خطبۂ ثانی عربی میں مختصر پڑھتا تھا۔

مولانا کے ایک معتقد ناصر سیف صدیقی مرحوم تھے۔ میرے ساتھ بھی بڑے اخلاص سے پیش آنے لگے تھے۔ وہ کلکتہ شہر کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ بڑی خوبی اور قابلیت کے شخص تھے۔ مولانا کے خطبہ کو اس قدر توجہ سے سنتے تھے کہ پھر کسی وقت فرصت میں کبھی اُسے قلم بند کر کے اخبار مدینہ کو بغرض اشاعت بھیج دیتے تھے۔

اشکِ غم بیادِ پیشوائے اعظم

(از محمد یوسف تمنّا انصاری۔ ناظم جمعیۃ علماء بکاری۔ "دگیا")

آں امام الہند ذی جاہ و جلال
صاحب التفسیر ذو الفضل و کمال
پیشوائے اعظم قوم و وطن
ہستئ او بے نظیر و بے مثال
منصبِ تعلیم زاں ذاتِ بزرگ
یافت تا دہ سال فیضِ لازوال
بارہا آمد بزیر قید و بند
کس ندید از روئے او رنج و ملال
رائے صائب داشت در ہر مسئلہ
عاقل و طباع بود از خورد سال
مرد میدانِ سیاست بوالکلام
شصت و نہ در عمر آں را شد وصال
تیرہ و تاریک شد ہندوستاں
شد غروب آں نیرِ اوجِ کمال
آہ رخصت شد مدیر البلاغ
آہ رخصت شد مدیر الہلال
فکر کردم چوں برائے یادگار
اے تمنّا باحزن و غم تاریخ سال
ناگہاں ہاتف بگفت از روئے وصل
آہ رخصت شد مدیر الہلال
۱۹ ۶ ۵۸

امام الہند کی گھریلو زندگی میں
ایک میزبان کے مشاہدات

(مسز ارونا آصف علی میئر دہلی کارپوریشن)

آیا وہ میرے لئے صرف لیڈروں کی انجمن کے ایک فرد تھے جنھیں کسی سیاسی تنظیم کا حلقہ اپنے چھوٹے حلقہ کا کرتا دھرتا سمجھتا ہے۔ ان باتوں پر میں کچھ لکھنے کی جرأت نہیں کروں گی بہر حال میں انھیں صرف ان عظیم ترین لوگوں میں سے ایک عظیم ترین شخص کی حیثیت ہی سے نہیں جانتی ہوں جنھوں نے جنگ آزادی کی رہنمائی کی۔ بلکہ ایسے شخص کی حیثیت سے بھی جانتی ہوں جن کے قریب اپنے شوہر کے قریبی مضبوط تعلق کے سبب رہنے کا موقع ملا۔ بعض حالات میں ان کے احباب کو ایسے مواقع ملے۔ جیسے خود ان کے اپنے خاندان کے ارکان کو نہیں ملتے تھے

میرا خیال ہے کہ مولانا صاحب کے ساتھ میرے شوہر کا تعلق ۱۹۲۳ء میں اس وقت شروع ہوا جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس کی صدارت کرنے آئے تھے۔ لیکن جس تعلق نے انھیں یکجا رکھا تھا اس کے بہت سارے پہلو تھے۔ ان میں سیاسی عقائد مغل دور کی ثقافتی روایات ادبی اور سماجی دونوں کی بہترین اقدار کے ساتھ غیر جذباتی تعلق کی یکسانیت اور اس بات پر کامل یقین کہ آزادی پسند اقدار۔ اسلامی تعلیمات کی روح کے ساتھ کامل ہم آہنگی کی حامل ہیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ مولانا صاحب نے آصف صاحب کو دوست کی حیثیت سے قبول کیا۔ اور دہلی کے اکثر دوروں کے دوران اس وقت تک جب وہ مرکزی کابینہ میں شامل ہوئے ان کی میزبانی قبول کی، وہ ہم لوگوں کے ساتھ بے تکلفی محسوس کرتے تھے اس لئے نہیں کہ ہم ان کو ایک خوش حال خاندان کا آرام فراہم کرتے تھے بلکہ جس چیز نے انھیں راغب کیا شاید وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنے کا موقع تھا جس کے ساتھ وہ ذہن کو مہمیز دینے والی گفتگو کر سکیں جو ان کی واحد تفریح تھی اور جس کی وہ آرام سے زیادہ قدر کرتے تھے

عجیب رویہ

ایک واقعہ جو میرے ذہن میں آتا ہے وہ ایسے رویہ کی نشان دہی کرتا ہے جو ان کا حصہ تھا۔ اکثر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۱ء کے دوران طویل برسوں میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو مئی اور جون کے مہینوں میں جلسے منعقد کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مولانا صاحب پر دہلی کی شدید گرمی گراں تھی، انھیں دوسروں سے زیادہ تکلیف ہوئی اور ایک بار کوچہ چیلان میں اپنے گھر کی حبس فضا کی لازمی تکالیف سے محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اپنے شوہر کو یہ مشورہ دیا کہ مولانا صاحب سے برلا ہاؤس میں قیام کرنے پر اصرار کیا جائے جہاں ان کے کچھ دوسرے ساتھی اکثر قیام کیا کرتے تھے۔ آصف صاحب کو بالکل یقین نہیں تھا کہ ہم لوگوں کا یہ مشورہ دینا مناسب ہے۔ لیکن آخر ش وہ رضا مند ہو گئے۔ برلا ہاؤس کو بھی اطلاع دی گئی کہ مولانا صاحب وہاں ٹھہریں گے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے یقین تھا کہ مولانا مرحوم اس مشورے کا خیر مقدم کریں گے اس لئے کہ ناقابل برداشت گرمی کا اثر ان کی صحت پر بھی ہوگا خصوصاً اس لئے بھی کہ ہم لوگ ظاہری اسباب کے تحت اس کی شدت کو کم کرنے پر قادر نہیں تھے۔ لیکن میری غلطی تھی، مولانا صاحب نے اپنی خصوصی عادت کے تحت اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ جب وہ پہونچے تو ہمارے کار میں داخل ہوئے اور میری پریشانی کے با وجود کوچہ چیلان کی طرف چلنے کو کہا۔ ہم لوگوں نے سپر ڈال دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اس کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس دن ذاتی قدروں کے مطلب نے میرے لئے ایک نئی خصوصیت حاصل کی۔

صاحب خانہ کی حیثیت میں

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک محب وطن اسکالر اور مدبر کی حیثیت سے بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور بلا شبہ زیادہ کہا اور لکھا جائے گا۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ شاید ہی ان کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے کوئی ایک صاحب خانہ کی حیثیت سے ان کے متعلق لکھ سکے گا یا کوئی خاندانی سوانح نگار ان کے بچپن، اوائل عمر اور جوانی کی بابت ہمیں واقف کر سکے گا، اس لئے کہ غیر معمولی طور پر وہ اپنے متعلق خاموش تھے اور اس سے زیادہ اپنے خاندان کے متعلق بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کے اپنے لوگوں کے متعلق ان کا کیا خیال تھا۔ لیکن تاخیر سے ان میں سے کچھ لوگوں کو جاننے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان تمام لوگوں کے مشفق اور دور اندیش کارندے تھے جن کا انحصار ان پر تھا ان کا دل انھوں نے صرف اس وقت توڑا، جب انھوں نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنی نظر بندی کے دوران پیرول قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ ان کی اہلیہ بستر مرگ پر تھیں۔

اپنے ذاتی عادات کے تحت مولانا آزاد گھریلو نظم و ضبط کا ایک کافی سخت قانون رکھتے تھے ان چیزوں کے متعلق جن سے زندگی زندہ رہنے کے لائق بنتی ہے ان کا طریقہ کار کبھی تارک الدنیا شخص کا نہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ فضول خرچی اور نمایش سے متنفر تھے۔ اپنی جان پہچان کے ابتدائی ایام میں میں نے اخلاق کے تحت ان کے احتجاج کو رسمی سمجھا۔ تب میں نے دیکھا کہ مجھے فضول خرچی سے باز رکھنے میں اصرار کو ناکام دیکھ کر جہاں تک ان کا تعلق تھا انھوں نے باقی کو نظر انداز کر کے اپنا کھانا دو غذاؤں تک محدود کرنا شروع کر دیا۔

پھر قاعدے کے مطابق سادہ ہندوستانی طریق زندگی میں ہم لوگ کسی حد تک پابندی وقت کی قیمتوں سے نا آشنا ہیں۔ لیکن جب مولانا صاحب صبح میں ساڑھے چار بجے اپنی چائے اور گیارہ بجے کھانا طلب کرتے، ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ وقت چار بج کر تیس منٹ، یا سوا گیارہ ہو جائے مجھے یاد ہے کہ ایک بار کسی جگہ کوئی غلطی ہو گئی اور کھانا معمول سے نصف گھنٹہ بعد لایا گیا تو مولانا صاحب کھانا کھائے بغیر چلے گئے۔ قدرتی طور پر یہی آخری موقع تھا کہ اس طرح کا تساہل ہوا، پہلے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پابندی وقت بذات خود ان کے لئے ایک مقصد ہے۔ لیکن فوراً ہی بعد میں نے جان لیا کہ وہ اتنی سختی کے ساتھ اپنے وقت پر نظر کیوں رکھتے تھے۔ دن کی ابتدائی ساعتیں ان کے لئے بڑی قیمتی ہوتی تھیں۔ اس لئے کہ وہ انھیں مطالعہ اور تحریر میں گزارتے تھے اور اس لئے وہ باقی دن اس طور پر گزارنا چاہتے تھے کہ ہر صبح ان کا چاق و چوبند ہو کر اٹھنا ممکن ہو سکے۔ ان کی عظمت کے حامل ایک سیاسی لیڈر کو تمام لوگوں سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ مولانا صاحب کو عظیم شنسینوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑتا تھا لیکن وہ صرف ان لوگوں کی معیت میں کھلتے تھے جو کم و بیش اردو اور فارسی ادب، زمانہ وسطیٰ اور جدید تاریخ و دینیات کے بیش بہا خزانوں سے واقف ہوتے تھے۔ اس لئے انھیں بے تکلف کرنا کبھی بھی بہت آسان نہیں ہوتا تھا اکثر ان کے میزبان کا مفاد ہوتا تھا کہ وہ گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ قدرتی طور پر وہ ایسے ذہنوں کے سامعین پسند کرتے تھے جو اس گفتگو میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو وہ کہنا چاہتے تھے اور اگر کبھی ہم لوگ اس طرح کے چند لوگوں کو مدعو کرتے تو آصف تھا کے کہنے کے مطابق مولانا صاحب کی گفتگو کی خوبی ان کے ہنر پر سبقت لے جاتی، جہاں تک میرا تعلق ہے ایک بہت ہی پریشان اور ناواقف مشاہد کی حیثیت سے دور بیٹھی میں صرف یہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ دوسرے جو حوالہ دیتے تھے ان میں سے ہر ایک کے لئے مجتمع لوگوں کے تفنن طبع کے لئے وہ کئی زیادہ حوالے پیش کر دیتے تھے۔

وہ طویل سیاحت کو پسند کرتے تھے۔ خصوصاً دہلی کے قریب کے تاریخی مقامات کی سیاحت کو جاتے۔ بڑے بڑے مقبروں کے علاوہ ہم لوگ ان کے گرد پھیلے ہوئے کھنڈرات میں گھومتے اور وہ ان کہانیوں کا تذکرہ کرتے جو ایک خاص پل، مسجد یا مکان کے متعلق مشہور ہوں اور ان کے ساتھی ان کی یادداشت اور ان کے مفصل مشاہدے کی صلاحیت پر حیرت کا اظہار کرتے۔

قومی تعمیر

مولانا آزاد

یہی عمارت کے محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے
دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں پھر اس کی محرابیں اور
اطراف و جوانب بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ حیات و
ممات اور تنازع البقائے اقوام کی سرکش کشمکش میں فرصت
و مہلت کا سکون و اطمینان نہیں۔ یہاں
ہر قدم اور ہر لمحہ کام کے

چاہیئے اور ایک ہی وقت میں عمارت کے ہر حصے کی
تعمیر کیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے [illegible]
پشت کی دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں
جو کھو گیا پھر ہیں ملتا اور جو وقت
غفلت میں کٹ گیا پھر اس کی
تلافی کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئیگا۔

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

نقیب حریت و انقلاب

مولانا آزاد

قوموں کی حقیقی عظمت

قوموں اور ملکوں کی
عزت اگر زیادہ خون بہانے
اور انسانی گلوں کے ساتھ
پاؤں باندھنے میں ہوتی تو درندوں
کے بھٹ انسانی عبادت گاہوں سے
زیادہ مقدس ہوتے مگر اس کے

شرف و تقدیس کا معیار
الٰہی اوصاف اور ملکوتی اخلاق
ہیں اگرچہ چند سے بھی اس سے
میسر آجاتیں تو وہ [illegible] سے
قیمتی ہیں [illegible] افضل ہزار سال
سے زیادہ ہیں

اقلیت و اکثریت کی بحث پر حضرت مولانا آزاد کا ایک فیصلہ کن بیان

کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کرتے ہیں؟

(خود ہی جواب تحریر فرماتے ہیں)

ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے انہیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔

اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ ایک طرف خود مسلمانوں پر ان کی حیثیت مشتبہ کر دی اور دوسری طرف دنیا کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

درحقیقت برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ بھی تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئی ہیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام قاعدہ کے مطابق انسانی افراد کی ہر وہ تعداد جو دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے۔ اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب رہنا چاہئے۔ بلکہ مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقت ور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔

اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد دوسرے سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بجائے خود کم ہو اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے ——— پھر تعداد کے ساتھ نوعیت کو بھی دیکھنا پڑتا ہے ——— فرض کیجئے کہ ایک ملک میں دو گروہ ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ اور دوسرے کی دو کروڑ ——— ظاہر ہے کہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہے مگر سیاسی اعتبار سے یہ نسبتی فرق کافی نہ ہوگا کہ ہم ایک کروڑ کو اقلیت فرض کرکے اس کی کمزوری کا اعتراف کر لیں۔ بلکہ اس کا فیصلہ دوسرے عوامل اور صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکے گا۔

اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے اس کی نسبت 'اقلیت' کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صاف دھوکہ دینا ہے۔"

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

حدیثِ زنداں

خود امام الہند ابوالکلام آزادؒ کے الفاظ میں

مرتبہ علامہ انور صابری صاحب

"زندانِ فرنگ" ہماری منزل نہیں راستہ کا پڑاؤ ہے، اس سے گذر کر ہی ہم وہاں پہونچیں گے جہاں پہونچنے کی آرزو ہم نے آغازِ سفر میں کی تھی، راہِ سفر بے حد دشوار ہے۔ قدم قدم پر مشکلات ملیں گی۔ صبر آزما مراحل ہمارا استقبال کریں گے، کبھی کبھی ساتھیوں کی کم ہمتی سوالیہ نشان بن کر سامنے آئے گی، کبھی ناشناسانِ مزاج، رفیقانِ راہ کی زُود رَنجیاں، اور حوادث و آلام سے گھبرا کر گریز پائیاں الجھنوں میں مبتلا کریں گی مگر ہمارا ارادۂ سفر گرد و پیش کے حالات سے اُکتا کر ترکِ سفر کا کُفرِ عمل برداشت نہ کرے گا"۔

"جیل خانہ کا دروازہ ہمارے لئے اس لئے نہیں کھُلا تھا کہ ہمیں "قید و بند" کا آئینی سکون دے کر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ وہ پھر کھلے گا یا کھولا جائے گا ممکن ہے یہ سلسلۂ بست و کُشاد کچھ عرصہ تک برابر جاری رہے۔ اور "آمد و رفت" کا معاملہ ہمیں اُس وقت تک کرنا پڑے جب تک کلیدِ درِ زنداں ہماری تحویل میں نہ آ جائے"۔

"ہمیں یہاں آکر باہر کے آسائش و آرام کو بھول جانا چاہیئے۔ اور ہر اُس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو جانا چاہیئے جو ہمیں ضرور پیش آئے گی"۔

"تاریخِ عالم کے ہر صفحہ کو اُلٹ کر دیکھئے مظلوم و محکوم انسانوں کے گریۂ مصائب پر ہنسنے والی نگاہِ استبداد صرف اس لئے ہنستی ہے کہ اُسے بھی رونا ہے"۔

"اب جبر و تشدد اور برداشت میں آخری مقابلہ ہے فتح اُس کی ہوگی جو زیادہ طاقت ور ہوگا۔ اور زیادہ دیر تک میدان میں رک سکے گا اگر جبر و تشدد کی طاقت زیادہ ہے تو جیت اُس کی ہوگی اور اگر ہم میں برداشت کی طاقت زیادہ ہے تو ہماری فتح کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی"۔

"اگر واقعی تشدد کا یہ آخری وار ہے تو ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سفر کی آخری منزل آگئی ہے"۔

"ہم نے ایمان کا اعلان کیا ہے، خدا پرستی کا دعویٰ کیا ہے، سرفروشی و جاں نثاری کا لمو لگایا ہے۔ ہم نے قربانی و جاں بازی کا ہزاروں، لاکھوں مرتبہ نام لیا ہے ہم نے حق پرستی کے عہد کئے ہیں اور ملک سے عشق و محبت کا پیمانِ وفا باندھا ہے، ہم نے نامرادی اور بزدلی کی ہمیشہ حقارت کی۔ ہم نے حق سے مُنہ موڑنے اور خدا کو پیٹھ دکھانے پر لعنتیں بھیجیں، ہم اُن پر ہنسے جو تکلیفوں اور مشکلوں سے گھبرا گئے، ہم نے اُن کی بدبختی و محرومی سے پناہ مانگی جو وقت پر اپنے دعووں میں پورے نہ اُترے۔ یہ سب کچھ ہم نے اپنی مرضی اور طلب سے کیا خدا اور اس کے فرشتے ہماری زبانوں اور ہمارے دلوں پر گواہ ہیں، پھر اگر آج آزمائش کی گھڑی آگئی ہے اور وہ منزل سامنے ہے جس کے لئے ہم اس قدر دعوے کر چکے ہیں تو کیا ہم عین وقت پر اپنے تمام دعوے بھلا دیں گے! اور اس سے لیں گے، کیا ہمارا دعویٰ دھوکہ ثابت ہوگا اور ہمارا اعلان محض فریب کا تماشہ ہوگا کیا ہم نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا، اور ہم نے اپنے ایمان اور حق کے لئے جو کچھ سمجھا وہ دھوکا تھا۔

"دنیا ہم کو تک رہی ہے، تاریخ کے صفحات ہمارے انتظار میں ہیں، ہزاروں۔ لاکھوں شہیدانِ ظلم کی نگاہیں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ سمرنا اور ایشیائے کوچک کی خون آلود سرزمین سے ہمارے لئے صدائیں اٹھ رہی ہیں ہندوستان کی پامال سرزمین کا ایک ایک ذرّہ ہماری کھوج میں ہے۔ کیا ہمارا وجود ان سب کے لئے مایوسی کا پیام ہوگا۔ کیا ہماری نامرادی و بدبختی کی سرگذشتیں لکھی جائیں گی۔ کیا ہم تاریخ کو صرف اپنی منحوس ناکامی کی کہانی دے سکتے ہیں۔ کیا آنے والی نسلوں کی زبانوں پر ہمارے لئے صرف نفرتیں اور لعنتیں ہی ہو سکتی ہیں۔

"یہی وقت ہے جو ہمیشہ کے لئے ہماری فتح و شکست کا فیصلہ لکھ دیگا۔ آؤ اپنی قسمت کی تعمیر کریں اپنی عزت و اقبال کو ڈوبنے سے بچائیں، اپنی فتح کو شکست کے لئے نہ چھوڑیں، ہندوستان کی آزادی اور نجات کی اُمید کو تاراج نہ کریں جو پھر صدیوں تک واپس نہ مل سکے"۔

"فرمایئے یہ خلوتِ اطمینان و سکون ہمیں باہر نصیب تھی؟ عبادت میں طمانیت میسر ہے نسیمِ سحر کے نرم خرام جھونکے۔ جامدِ دُنیا کو سُلاتے ہیں اور اربابِ عمل کی روح کو فطرت کی معصوم انگڑائیوں کی طرح آہستہ آہستہ بیدار کرتے ہیں"۔

"اوقات کی مکمل پابندیاں یہاں سے زیادہ کہاں مل سکیں گی۔ میدانِ جنگ کے تھکے ہوئے سپاہی یہاں سستا لیں گے اور آرام یافتہ دل و دماغ کو ان روشنیوں سے آشنا کریں گے جن سے مستقبل کے گہرے اندھیروں میں چلنا آسان ہو جائے"۔

"آپ یقین رکھئے جن عدالتوں میں ہمارے مقدمات جاری ہیں ان کا ڈھانچہ عدل و انصاف کی بنیادوں پر تعمیر نہیں کیا گیا۔ ان سے انصاف کی توقع موت سے زندگی کی آرزو کے مرادف ہے"۔

"مشترکہ مقصد کیلئے انفرادی جد و جہد کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے، اجتماعی مفاد اجتماعی سعی و کوشش کا طالب ہے۔ نیتوں میں للّٰہیت، عمل میں اخلاص اور جذبوں میں صبر و تسلی کی گود کا پالا ہوا جوش ہو تو ہمارا مشترکہ جہادِ حریت نامراد و ناکام ہو ہی نہیں سکتا"۔ "اگر اس امتحان گاہِ آزادی میں ہم نے "استقامت" کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور خطاؤں کے لالچ یا لیڈری کے سبز باغ، اور اعزاز و جاہ کی ایمان فروشانہ ہوس سے بے نیاز ہو کر قربانی و جانبازی کی راہ میں قدم اٹھا کر اس طرح جم گئے کہ نہ تو کوئی طمع ہلا سکے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکے سمندر کی طرح پُرجوش، پہاڑ کی طرح مضبوط اور غیر متزلزل تو کامیابی و فتح جُز و مراد کا سر چشمہ ایمان کا خلاصہ۔ عمل کی رُوح اور خدا کی رحمت کا وسیلہ صرف یہی ہے"۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند

ایک غیر معمولی شخصیت

اگرچہ مولانا آزاد اپنی تحریروں اور سیاسی سرگرمیوں کے باعث رانچی (بہار) میں نظر بند رہے پھر بھی ۱۹۲۰ء سے پہلے جبکہ خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس نے شانہ بشانہ کام شروع کیا اور انگریزوں کی حکومت سے عدم تعاون کا پروگرام اختیار کیا اس وقت مجھے پہلی بار مولانا سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہونے والے کانگریس کے ہنگامی اجلاس اور اس کے بعد دسمبر میں ہونے والے عام سالانہ اجلاس کے درمیانی عرصے میں گاندھی جی نے علی برادران اور مولانا آزاد کے ساتھ ایک سے زیادہ مرتبہ بہار کا دورہ کیا۔ اس وقت مجھے مولانا سے قربت حاصل ہوئی اور میں نے انہیں ایک ایسے سحر طراز مقرر کی حیثیت سے دیکھا جس کی آواز دلوں کی گہرائی میں اتر کر عوام کے خوابیدہ جذبات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتی تھی۔ اس وقت سے لیکر زندگی کے آخری لمحات تک میرے ان کے تعلقات بہت گہرے اور خوشگوار رہے۔ اس وقت ڈیڑھ برس کے اندر انھوں نے اپنی تقریروں سے ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی جیسے ہر چہار جانب سے آزادی کا طوفان امنڈ آیا ہو۔ اسلئے یہ کوئی حیرت انگیز اور غیر متوقع بات نہ تھی کہ انگریزی حکومت نے اپنے اختیارات اور جابرانہ پالیسی کے تحت بالآخر انہیں گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔

۱۹۲۲ء کے شروع میں گاندھی جی کے جیل جانے کے بعد فوراً ہی کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختلاف کی جڑ عدم تعاون کی تحریک تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ کانگریس کو لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینا چاہئے یا نہیں۔ کلکتہ کے ہنگامی اجلاس میں انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا اور ناگپور و احمد آباد کے اجلاس میں بھی اس فیصلے کی تصدیق کی گئی۔ گیا کانگریس میں انتخابات میں شرکت اور بائیکاٹ دونوں کے حامیوں کی طاقت کی آزمائش ہوئی۔ بائیکاٹ کے حامی پھر جیت گئے۔ لیکن دونوں فریق کانگریس کے ممتاز افراد تھے جو اس رسہ کشی اور اختلاف سے بیحد کبیدہ خاطر تھے اور چاہتے تھے کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں دہلی میں پھر کانگریس کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا جس کے صدر مولانا آزاد منتخب ہوئے جو ۳۵ برس کی عمر میں کانگریس کے صدر ہوئے۔ فارسی کی ایک کہاوت ہے "بزرگی بعقل است نہ بسال —— دولت بدل است نہ بمال" یعنی بزرگی عقل سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ سن و سال سے اور تونگری دل سے ہوتی ہے نہ کہ زر و مال سے۔ ہماری تاریخ میں اگر اس کہاوت کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی تو اس وقت جب مولانا آزاد صرف تین سال کانگریس کی خدمت کرنے کے بعد اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ قومی بیداری کی اس قلیل مدت میں وہ محض اپنی صرف دو خطابات جلا بخش غیر معمولی ذہانت دانشمندی معاملہ فہمی اور متضاد عناصر کو یکجا کرکے رکھنے کی قوت اور مختلف خیال گروہوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کی بے نظیر صلاحیت کے باعث اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر گہرا اثر ڈال چکے تھے۔

تحریک آزادی کی طویل مدت میں ان کی حب الوطنی ایثار قربانی اور جذبۂ خدمت کے صلہ میں بار بار جیل جانا پڑا۔ اس جد وجہد میں انھوں نے اپنا بیشتر وقت دوسرے ساتھیوں کی طرح جیل ہی میں گزارا۔

دہلی میں مولانا کی صدارت میں کانگریس کا جو ہنگامی اجلاس ہوا اس میں کانگریس کے دونوں گروپوں کے درمیان اصولوں سے دستبردار ہوئے بغیر کوئی مفاہمت ہو گئی۔ یہ مولانا آزاد کا کمال تھا کہ دونوں گروپوں کے نمائندوں اور لیڈروں نے ان کا پورا احترام کیا اور دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہوئے باہمی مفاہمت کا راستہ تلاش کر لیا گیا۔ یہ پایا گیا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کونسلوں میں جاکر ملک کی خدمت زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکیں گے وہ کانگریس کا نام استعمال کئے بغیر انتخاب لڑ سکتے ہیں۔ جو لوگ کونسلوں میں جائیں گے وہ کانگریس کے نام پر اس کے نظام کے ماتحت رہ کر کام کریں گے اور انتخاب نہیں لڑیں گے۔ نظریاتی اور عملی اختلافات کے درمیان ایک ایسی راہ نکالنے میں مولانا کو کس قدر کمال حاصل تھا اس کا قریب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قومی اتحاد پر مولانا کو جو غیر متزلزل اعتقاد تھا وہ اسی سے ظاہر ہو گا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہر جماعت اپنے اصولوں اور عقائد پر قائم رہتے ہوئے خواہ وہ سیاسی ہوں خواہ مذہبی ملک کے اتحاد میں رکاوٹ کے بجائے معاون بن سکتی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد

یہی وجہ تھی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ ہم مذہبوں کی تنگ نظری تنقید کے باوجود وہ غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ خدا بھی انہیں سے مدد کرے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ ملک کے ہر طبقے میں ان کو یکساں طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے ان سے مشورہ کیا جاتا تھا وہ ہمیشہ بے خوف بلا جھجک غیر جانب دارانہ اور مخلص مشورہ دیتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہونے پر انھوں نے ہماری تحریک میں معاملہ فہمی غیر معمولی سوجھ بوجھ فہم و فراست اور حب الوطنی کا ثبوت پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ وارانہ کشیدگی نقطۂ عروج پر پہونچ گئی تھی اور نتیجے میں ایک آزاد مسلم مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا مطالبہ کیا جانے لگا تھا۔ انگلینڈ اور ہندوستان کے درمیان اہم سیاسی گفت و شنید کے وقت مولانا آزاد ہی کانگریس کے صدر تھے۔ اس حیثیت سے وہ برطانوی نمائندوں کے ساتھ انتقال اختیارات کی بات چیت میں ہماری نمائندگی کرتے تھے۔

لوگ اکثر ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیکر اپنا سارا وقت ادبی نثر نگاری کے مطالعہ و تحقیق میں صرف کرتے تو ہندوستانی ثقافت و علوم کو اتنے ہی کم اہم نہ ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مولانا آزاد بھی اپنا سب وقت عربی و فارسی مطالعے میں صرف کرتے تو اس کا نتیجہ بھی اتنا ہی اہم ہوتا جتنا کہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا ہوا۔

وزیر تعلیم کے عہدہ پر

آزادی کے بعد قدرتی طور پر انہیں تعلیم کا محکمہ سپرد کیا گیا۔ فنون لطیفہ ثقافتی اور سائنسی تحقیقات کے شعبے بھی انہیں کے ماتحت تھے۔ آرٹ ادب ثقافت اور سائنسی تحقیق

کی حوصلہ افزائی اور روزافزوں ترقی اکادیموں تجربہ گاہوں اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لئے مختلف کمیٹیوں سے ظاہر ہے۔

مولانا آزاد ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے نمائندے تھے۔ ہندوستانی تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام اچھی قدروں کو بلا جھجک قبول کر لیتی ہے۔ آرٹ اخلاق اور روحانیت کے نقطۂ نظر سے جو چیز بھی معیاری اور خوبصورت ہو ہمیشہ اسے وہ اپناتی رہی ہے۔

مولانا آزاد کے آخری سفر کے موقعہ پر عوام نے جس بے پایاں محبت اور عقیدت کا مظاہرہ کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ عوام کو ان کی رہنمائی اور قیادت پر کتنا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اور عوام کے دلوں میں ان کے لئے کتنا اونچا مقام تھا۔ مولانا اپنا مادی جسم چھوڑ کر جا چکے ہیں لیکن ان کی روح ہماری اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ بھگوان کرے ہم اس عظیم وراثت کے مستحق ثابت ہوں۔

اگست ۱۹۴۸ء میں
جمعیۃ کے زیرِ اہتمام منعقدہ
"یومِ آزادی"
اُردو پارک میں
حضرت مولانا آزادؒ نے فرمایا!

"میرے پاس مسلمانوں کے خطوط آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اگرچہ ہم حکومتِ ہند کے وفادار ہیں اور بار بار اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں پھر بھی ہم پر شک کیا جاتا ہے۔

میرا جواب صرف ایک ہے تم ایک منٹ کے لئے اس سوچ میں مت پڑو کہ دوسرا تمہارے متعلق کیا خیال رکھتا ہے۔ بلکہ اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ اگر دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے تو تمہیں کسی کے کہنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ اپنے معاملہ کو صاف رکھو۔ بار بار صفائی پیش کر کے اپنی وفاداری کی قیمت نہ گھٹاؤ"

ماتمِ آزاد

فرحت القادری
معروف گنج "گیا"

یہ کس کے غم میں صبح کی افشاں بکھر گئی
یہ شام کس کے سوگ میں ظلمت سے بھر گئی
مہر و مہ و نجوم کو آخر یہ کیا ہوا
آخر یہ ماہ و سال کی رونق کدھر گئی

رُوحِ حیاتِ جانِ تکلم نہیں رہا
بحرِ جبیں پہ اب وہ طلاطم نہیں رہا
نباضِ وقت، ماہرِ فطرت خموش ہے
رمز آشنائے چشمکِ انجم نہیں رہا

دریا میں موج، موج میں طغیانیاں نہیں
دِل میں اُمنگ، اُمنگ میں جولانیاں نہیں
تو دیپ ایک لمحۂ غم نے بجھا دئیے
وہ کیف وہ سُرور وہ سرشاریاں نہیں

سُورج خموش، چاند ستارے خموش ہیں
آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں نظارے خموش ہیں
اب کس کو جا کے حالِ غمِ دل سُنائیں ہم
اپنے پرائے سارے کے سارے خموش ہیں

یہ کون راہیٔ عدم آباد ہوگیا
ہر خاص و عام مائلِ فریاد ہوگیا
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"
قیدِ حیات سے بھی وہ آزاد ہوگیا

مولانا آزاد پنڈت نہرو کی نظر میں

کئی سال پہلے پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے (ادارہ)

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر یہ مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب وہ ہستی ایسی سیاسی رفیق ہو کہ قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں ساتھی رہی ہو، یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قلم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تقریباً تیس سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی لیکن مولانا کی علمیت، قومی کاموں میں عزم و ثبات اور جنگِ عظیم کے دوران میں اُن کی نظربندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا اور ان سے ملنے کے لئے بیتاب تھا۔ عمر کے اعتبار سے اُن کا ابھی عالمِ شباب تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح اُن کی جگہ بزرگانِ کانگریس کے درمیان ناگزیر تھی۔ چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کانگریس کے اندرونی معاملات سے اتنا گہرا ربط و ضبط نہیں تھا۔ اس لئے اس وقت انہیں دور سے ملاحظہ کرنے کا موقع ملتا رہا، لیکن اس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشستوں میں مجھے ان کو بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایامِ قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے اندر مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کانگریس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز اور عزائم کی تراش و خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروفِ کار رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر، اُن کے آزاد مشورے غیر معمولی طور پر قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ ان رایوں اور مشوروں کے پس پردہ [illegible] فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی [illegible] روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا سیاسیات سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست داں تھے، آپ ایک عام سیاست داں [illegible] جوشیلے اور پرجوش [illegible] اور جلسے سننے کے قابل ہو جاتے۔ آپ کی افتادِ طبیعت [illegible] اس کے خلاف تھی۔ [illegible] ان کے پہلو میں ایک بہت زیادہ [illegible] کے شور و شغب [illegible] سے بہت گھبراتے تھے۔ [illegible] عوام میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں [illegible] علم و فضل تھی، حالات نے [illegible] حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے ہیں۔ جو انقلابِ فرانس سے کچھ عرصے پہلے موجود تھے۔ تاریخِ اقوامِ ماضیہ میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلل، باضابطہ اور سلجھا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اگر اس وقت خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز تھا جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کر سکتا۔ ہم نے یہ اعجاز پرور آواز پبلک میں بہت کم سنی اور بدقسمتی سے انھوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی تھیں۔

مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو زبان وہ لکھتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ پُرمعنی الفاظ سے مملو ہوتی تھی — عنفوانِ شباب ہی میں انھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا، عربی ممالک اور مصر سے خراجِ تحسین وصول کر لیا تھا۔ جو محض ان کے قلم کی بدولت تھا۔ اور اب تک یہ حالت تھی کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح، ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر انھوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنا بریں صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ محض حالات کا تقاضہ تھا کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لینے کے لئے مجبور ہو گئے اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انھوں نے یہ سب کچھ کس طرح بوجہِ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم جنھیں ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل رہی، تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمت کشِ انتظار کیوں ہوں! وہ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ تھے۔ قطع نظر اس کے کہ کبھی ہم نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا۔ بالاتفاق ہم ہمیشہ یہ ملحوظِ خاطر رکھتے رہے کہ اُن کی رائے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو۔ اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔

بڑے بڑے آدمی پیدا ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن مولانا جس خاص نوعیت کی عظمت کے مالک تھے وہ بھارت یا کسی اور جگہ نظر نہ آسکے گی۔ مولانا آزاد

نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت کی جبکہ انھوں نے یہ کہا کہ اسلامی ممالک امپیریلزم کے نتیجہ سے تبھی بچائے جاسکتے ہیں جب بھارت آزاد ہوگا۔ مولانا ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت کا دل پسند مجموعہ تھے ۔ مولانا پرانے زمانہ کی عظمتیں، خصلتیں مثلاً رواداری، شفقت مُروّت تحمل مزاجی بدرجہ اتم رکھتے تھے۔

آج انسان چاند تک پہونچنے کا متمنی ہے، لیکن ہم میں تحمل مزاجی، مروّت اور رواداری کا زبردست فقدان ہے۔ مولانا اُس کلچر کے نمائندہ تھے جو مختلف کلچروں کے آپس میں سموئے جانے سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ مولانا آزاد روشن فہم و فراست کے مالک تھے اور مسائل کی تہ تک پہونچنے کی حیران کُن صلاحیت رکھتے تھے ۔ ایسے دوست، رفیقِ کار ساتھی، لیڈر اور معلّم کی دفات یقیناً گہرا خلا پیدا کردیتی ہے۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ مولانا ہم سے جُدا ہوگئے ہیں، لیکن اُن کا پیغام زندہ ہے اور یہ ماضی کی طرح ہمیں روشنی دیتا رہے گا ۔

بختِ خفتہ

آہ ! تمہاری غفلتوں پر اگر آسمان روئے اور زمین ماتم کرے، عرفانِ ہوائیں فغاں سنج ہوں اور سمندروں سے مچھلیاں ماتم کرنے کیلئے اچھل پڑیں جب بھی اس ماتم ختم نہ ہوگا کیونکہ تمہارا ماتم تمام دُنیا کا ماتم ہے۔ اور چراغ کے بجھنے پر رونا چراغ کا رونا نہیں ہے بلکہ گھر کی تاریکی کا ماتم ہے ۔ تم دوسروں کی بیداری کے ترانے سن کر ترانہ سنج مدح و ثنا ہوتے ہو مگر اپنے بختِ خُفتہ و طالعِ گم گشتہ کو نہیں ڈھونڈتے کہ وہ کہاں گم ہوگیا ہے ۔ فاہ ثُم آہ !

درازیِ شب و بیداریِ من ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تا کجا خُفت ست

(ابوالکلام آزادؒ)

وزیر برقیات و آبپاشی حکومت ہند کے تاثرات

آنریبل حافظ محمّد ابراہیم صاحب

یادِ ابوالکلام

ابوالکلام - فراست کی منزلوں کا امام
فروغ بخشِ وطن ، رُوحِ کائناتِ وطن

وہ جس کے فکر کی گہرائیوں میں پنہاں تھے
رموزِ عظمتِ مستقبلِ حیاتِ وطن

وہ جس کی قوتِ جُہد وعمل نے بخشی تھی
ہمیں ادائے شجاعت پئے نجاتِ وطن

ثباتِ عقل وخرد پر تھا منحصر جس کے
نظامِ ولولۂ جادۂ ثباتِ وطن

نہیں وہ ہم میں تو یہ واقعہ ہے "ابراہیم"
اُبھرتی ہیں نئی ہر روز مشکلاتِ وطن

معرکہ حق و باطل کی ایک لازوال داستان

تاریخ حق پرستی کا ایک روشن ورق

عدالت کے کٹہرے میں اعلاء کلمۃ الحق کا ایک یادگار مظاہرہ

ذیل میں ہم حضرت امام الہند قدس سرہ العزیز کا وہ ولولہ انگیز بیان پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو موصوف نے ۱۱ جنوری ۱۹۲۲ء کو پریذیڈنسی جیل علی پور کلکتہ میں جسٹریٹ کے سامنے دیا تھا۔ یہ وہ بیان ہے جسے جرم و سزا کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اس کا ایک ایک جملہ جس طرح تعلیمات اسلام کے عطر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اس سے جرأت حق اور جذبہ حریت، اولوالعزمی و بے باکی، حق پرستی و حق شعاری کی جو جھلک آرہی ہے، وہ ابوالکلام آزادؒ ہی کا حصہ تھا۔ یقیناً حضرت مولانا آزادؒ کا یہ بیان پیغمبر اسلام ﷺ کے مقدس ارشاد کی عملی تصویر ہے افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر (سب سے بہتر و بیش قیمت جہاد کسی جابر و سخت گیر حکمران کے سامنے سچائی کا اظہار ہے) (ادارہ)

عدالت گاہ!

ہمارے اس دور کے حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی دونوں کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لئے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ متوسط (مڈل ایجز) کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے، ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے، لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے، جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟

ایک عجیب مگر عظیم الشان جگہ

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کئے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فداکار حقیقت گلیلو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لئے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا، کیونکہ میرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے، جو نیکی و محبت کا آسمانی پیغام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں؟ ہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے برے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کئے جاتے ہیں؟ اتنی بڑی ہستی کے لئے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں۔

مقام شکر!

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تلمیح پر جب میں غور کرتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لئے قابل رشک ہوں، ان کو اپنی خوابگاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے؟ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لئے دعائیں مانگتے۔

میں بیان کیوں دیتا ہوں؟

بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں بیان دوں، لیکن ۶ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا، تو میں نے دیکھا۔ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملہ میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے، حالاں کہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے۔

اقرار!

یقیناً میں نے کہا ہے، اور میرا اقرار صاف اور واضح ہے کہ موجودہ حکومت محض ایک ناجائز حکومت ہے، وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے، وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے، وہ انسانوں کے لئے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چوپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں، وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لئے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں وہ ایک بت کی طرح یونین جیک کو سلام نہیں کرتے، وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے تمام وعدوں کو توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی۔

میرے لئے حکومت کے اچھے اور برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے، پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے، میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز تصور کرتا ہوں اگر وہ عام ناانصافیاں ظہور میں نہ بھی آتیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا کیوں کہ اس کی ہستی ہی سب سے بڑی ناانصافی ہے اور اس کی برائی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہے۔

"اصلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو حق نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حق بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیے

بعینہ ایسا ہے جب کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائداد اور قرضدار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکا تو قرضدار کو یہی کرنا پڑے گا کہ قسط کی صورت میں وصول کرے۔ لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہے۔ اس سے ایک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انہی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بیشمار تقریروں میں۔ اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے وقت میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں، تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں گا۔

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں، یہی ہیں۔ ایسی ملفوظ صدا جو اس سے کم ہو، میرے علم میں نہیں۔

میں یقیناً کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آ سکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا یہ اعتقاد کیوں ہے؟

میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟ اس کے وجوہ و دلائل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ مسٹر گاندھی کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس و محسوسات کے لئے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو"۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لئے بھی ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اس لئے ہے کہ میں انسان ہوں۔

حجاج "اور" ریڈنگ"!

ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ (جن کی اطاعت ازروئے شرع ہم پر واجب ہے) ایسا سلوک رہا ہے۔ تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی ازروئے قانون قائم شدہ گورنمنٹ ہمارے لئے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو "ازروئے اسلام واجب الاطاعت ہے"؟ کیا انگلستان کی بادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت، عبدالملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لئے زیادہ مقدس ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی و غیر مسلم" اور "قومی و مسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں جب بھی ہم سے صرف یہی امید کی جا سکتی ہے کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لئے کہہ چکے ہیں وہی "چیمسفورڈ" اور "ریڈنگ" کی گورنمنٹوں کے لئے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا "خدا سے ڈرو کیونکہ تمہارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے"۔ یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ نہ کبھی اپنے قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لئے ہمیں بتلایا گیا تھا، نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلہ میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگذر کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ وہ اسلام کو زیانیہ کے لئے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اسلام نے حکمرانوں کے مقابلہ میں دو طرح کے طرز عمل کا حکم دیا ہے کیوں کہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں، ایک ظالم اجنبی قبضہ و تسلط کا ہے ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ پہلے کے لئے اعلاء کلمۃ الحق کے لئے تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لئے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف" اور "اعلان حق" جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا، دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہئیں اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتحمندی ہے، چنانچہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں، اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی، اور اپنوں کے مقابلہ میں بھی صبر و استقامت بھی دکھلائی۔ پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی جنگی جد و جہد کوئی مثال نہیں رکھتی، اسی طرح دوسری صورت میں ان کی "شہری جد و جہد" بھی عظیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے۔ حالاں کہ مقابلہ ان کا پہلی قسم سے ہے۔ ان کے لئے "جنگی جد و جہد" کا وقت آ گیا تھا، لیکن انھوں نے نان وائلینس اور عدم تشدد کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے۔ یعنی صرف وہی کریں گے جو انہیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلہ میں کرنا چاہیے۔ بلا شبہ اس طرز عمل میں ہندوستان کی ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انہیں اپنوں کے مقابلہ میں کرنی تھی۔

انقلاب حال

میں سچ کہتا ہوں، مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لئے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات بہر حال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لئے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جا سکتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لئے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے: وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر فرمانروا کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا، اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی، وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمران ظالم ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے، جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴۔الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو۔

میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب کی حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیئے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لئے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لئے کوئی فتنہ نہیں۔ جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں۔

یا آزادی یا موت!

لیکن انسانوں کی بدعملی سے تعلیم کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

بغاوت!

مجھ پر بغاوت کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا "بغاوت" آزادی کی اس جد و جہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں

مقامِ آزاد

(از فضا کوثری ۔ کولار ۔ ضلع میسور)

ترے بلند عزائم ! ہمالیہ ہمدوش
رہیں خیال کی پہنائیاں سوا محدود
ترے شعور کو شامل ہے بجلیوں کی لپک
رہیں اصول کی جولانیاں سوا محدود
ترے بیان ہیں عہدِ وفا کی تابشیں
ترے رموزِ سیاست فضا کے تارے ہیں
ترے سکوت میں فکر و عمل کے شہ پارے
ترے کلام میں کچھ رمز کچھ اشارے ہیں
ہر امتیازِ من و تو پہ کر کے تنقیدیں
ہر امتیازِ من و تو مٹا دیا تو نے
پڑھا کے فلسفۂ اتحادِ انسانی
چراغِ علم کی لَو کو بڑھا دیا تو نے
نمودِ صبحِ وطن کے کھلے اُجالوں میں
مزاجِ وقت سنوارا ہے کس قدر تو نے
نئے خیال تمدن میں ہر سلیقے سے
رُخِ حیات نکھارا ہے کس قدر تو نے
جہانِ تیرہ و تاریک بارمان گیا
کہ تیرے دل کا تھا ہر ذرہ نور سے معمور
تری خرد کی تھی پرواز آسماں پیما
دیارِ ہوش کی منزل سے دُور کوسوں دُور
جو جاں نثارِ وطن تھے انھیں اخوت دی
جو بے خرد تھے انھیں ذوقِ آگہی بخشا
خیالِ لیستیٔ باطل سے روشناس کیا
دلِ فسردہ کو احساسِ زندگی بخشا

وطن کے ذہن میں چمکے گی تیری یاد مدام
ترے عمل پہ تری روح پر ہزار سلام

ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں، لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام حب الوطنی بھی ہے، جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے۔ لیکن آج ڈی ویلرا اور گریفتھ کے لئے برطانیہ عظمیٰ کون سا لقب تجویز کرتی ہے؟

اسی آئرلینڈ کے ایمٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا: ہمارا کام ہمیشہ ابتداء میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔

فاقض ما انت قاض

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دیدے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے، کسی ایک پرزے سے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان انہی کے قیمتی صداقت گار ڈی بیونو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے کٹہرے کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:۔

"زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے۔ اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ وہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

تاریخ کا فیصلہ

تاریخ کی زبان کوئی بند نہیں کر سکتا اور وہ جو سبق دیتی ہے وہ صرف ایک قسم کا ہے۔ دنیا میں بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جنھیں انسان جانتا ہے اور ماننے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ تاہم ان کی صداؤں کو سننا پسند نہیں کرتا، چاہتا ہے کہ لوگوں کی زبان سے ان کو نہ سنے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ وہ ان سب حقیقتوں کی آواز سننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور زبان سے اٹھی ہوئی صدائیں نہیں، بلکہ واقعات کے ہجوم سے پیدا شدہ طاقتیں اس کے کانوں کو کھول کر، بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کی طرح سب کچھ سنا دیتی ہیں

(ابوالکلام آزادؒ)

حقیقت تأثرات کے پردہ میں

از ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار

آدمی اپنی زندگی بنانے کے لئے کہیں کہیں سے روشنی حاصل کرتا ہے بچپن میں میں بھی اپنی زندگی کے دِیے کو سُلگانا چاہتا تھا اور اَوروں کی طرح رُوئی کی بتیاں اپنی زندگی کے تیل میں ڈال کر سوچتا تھا کہ کہاں جاؤں ؟ میں آج اقرار کرتا ہوں کہ کافی سوچ اور تلاش کے بعد میں نے اِس دِیے کی پہلی بتی مولانا کی زندگی کے دیے سے جلائی اس وقت میری حیثیت طالب علم کی تھی جس وقت اس بتی میں آگ لگی میں نے اور جگہوں سے بھی آگ لی لیکن پہلی آگ ان ہی سے لی تھی — کبھی کبھی اُن سے ملتا تھا۔ جب ملتا تھا روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ گلا سال بھر سے کم ہوا ایک بات میں اُن سے رنج ہوا اور میں اُن سے کھچا اور اپنی کم ظرفی سے اس کھچاوٹ کو ظاہر بھی کر دیا لیکن اُس کو وقار نے محبت کی ایسی بوچھار کی جس سے میں شرمندہ ہوا۔ اُن ہی دنوں انھوں نے مجھے بلایا۔ جس وقت میں اُن کے پاس پہونچا ہوں میرا یہ حال تھا کہ شرم و ندامت سے گڑا جا رہا تھا مگر وہ تھے کہ محبت و کرم سے اُبلتے جا رہے تھے۔ مولانا کی ادب پر نظر تھی وہ کتابوں کے عاشق تھے سیاست کی خاطر انھوں نے علم کو نہ چھوڑا۔ آخر وقت تک وہ اس سے وابستہ رہے لیکن وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریاں اور وطن کے فرائض بھی جانتے تھے اُنہیں علم کی لگن تھی ان کا یہ مشن آخر وقت تک قائم رہا۔ گزشتہ دسمبر میں بھی جب میں اُن سے مِلا تو انہوں نے بعض کتابوں کے مطالعہ کے لئے پٹنہ آنے کا ارادہ ظاہر کیا افسوس کہ انھیں اس کا موقع نہ مل سکا لیکن وہ لگن آخر وقت تک باقی رہی، وہ ایسے عالم نہ تھے جو اپنے سماجی کاموں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اُن کی ساری زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی انھوں نے ثابت کر دیا کہ علم گورکھ دھندا نہیں ہے جس سے دھوکا دیا جائے وہ ایسی چیز ہے جس سے روشنی ملتی ہے۔ اور جو زندگی کے دوسرے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔

ہم نے کیا کچھ ان کا دل نہ دکھایا لیکن اس وقار کے پُتلے نے کبھی کسی کے خلاف ایک جملہ نہ کہا۔ سب گذر جاتا تھا وہ اس کی کبھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ لیکن کلمۂ حق کہنے میں انھوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔ مولانا کم آمیز تھے لیکن کمرہ میں بیٹھ کر سب کے ساتھی تھے جو بات ہم کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے اس کے کہنے کی جرأت مولانا ہی میں تھی، صدر جمہوریہ ہند نے صحیح کہا کہ وہ قلم جس سے موتی بکھرتے تھے بجلیاں چمکتی تھیں اور وہ ہونٹ جس سے پھول برستے تھے اور چنگاریاں بھی نکلتی تھیں سچ کو روشن کرنے اور باطل کو دبانے کے لئے وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن مشعل باقی ہے ہمیں چاہئے کہ اس سے روشنی لیں

بستی بنا کھیل نہیں ہے ؛ بستے بستے بستی ہے۔

ہمیں بڑا کام کرنا ہے بڑے بڑے لوگ گزر گئے کہتے ہیں ایک وقت ہوتا ہے جب آسمان پر زیادہ ستارے نکل آتے ہیں، ہمارے ملک کے آسمان پر بھی قومی ستارے بہت سے نمودار ہو گئے تھے اب ان کا جانا برحق ہے البتہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی سے اس نقصان کو پورا کرنے کی کوشش کریں اور سچائی، علم اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے طریقہ پر عمل کریں جو حضرت مولانا آزاد رحمۃ اللہ کا عمل تھا۔ حضرت مولانا نے ایک بڑی خدمت یہ کی کہ انھوں نے ہر مذہب کے آدمی کو بتایا کہ مذہب کی دونوں حیثیتیں ہیں ایک تفریق اور نفرت کی مگر وہ جھوٹی اور غلط حیثیت ہے۔ اور دوسری حیثیت ہے لوگوں کو ملانے اور ان کو ایک لڑی میں پرونے کی۔ ہم میں بڑا مرض یہی ہے کہ ہمارے نزدیک فکر و تخیل کی کچھ چھوٹی چھوٹی وفاداریاں ہیں جن کے ہم پابند ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ ہم ان چھوٹی وفاداریوں کو توڑ دیں، لیکن تمام انسانیت کے مقابلہ میں انھیں اہمیت نہ دیں۔ تب ہی ایک شخص سچا مسلمان سچا ہندو، سچا پارسی بن سکتا ہے۔

ہمیں مولانا کی زندگی سے یہی سبق ملتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ آج اس کی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما بنائیں۔

موعظت و ذکریٰ

"اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اُس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کرسکتی تھی۔ مزدوروں نے ہل جوتا۔ کاشتکار نے بیج ڈالا۔ نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی کی اور ان میں سے ہر فریق دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں........ مگر........ وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو —— اگر قدرتِ الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ بیج بار آور ہوتا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا۔"

الہلال

فروری

۱۹۱۳ء

دورِ حاضر کی عظیم شخصیت

از مسٹر ہمایوں کبیر منسٹر سول ایوی ایشن - حکومتِ ہند

مسٹر ہمایوں کبیر کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہلِ علم اور اسکالرز میں ہے۔ خوش قسمتی سے اُن کو پچھلے بیس برسوں میں حضرت امام الہند سے خاص وابستگی اور قربت حاصل رہی ہے۔ ہم ذیل میں کبیر صاحب کے قلم سے مولانا علیہ الرحمۃ کی عظیم شخصیت کا ایک فاضلانہ تجزیہ پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے الجمعیۃ کے لئے سپردِ قلم کیا ہے - (ادارہ)

کم و بیش پچاس سال ہوگئے جبکہ مولانا آزادؔ پہلی بار اُفقِ ہند پر پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ پھر بھی آج تک اُن کے قدردان ہوں یا نکتہ چیں۔ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اُن کی شخصیت تدبیر و سیاست میں زیادہ ممتاز تھی یا علم و ادب میں!

وہ ابھی نوجوان ہی تھے کہ الہلال والبلاغ کی آتش بیانی نے پورے شمالی ہند کی نگاہیں اپنی جانب پھیر لیں اور شعر و سخن کے میدان میں بھی نگاہوں اور دماغوں کی کشش حاصل کرلی تھی۔ مگر سب سے بڑھ کر اُن کا دینی اور سیاسی مطالعہ تھا جس نے اُن کی شخصیت کو امتیازی کمال بخشا۔

جہاں تک مولانا کے ادب و انشا کا تعلق ہے یقیناً وہ اُردو زبان کے سرمایہ اور تاریخ میں ایک بے مثال تخلیق تھی۔ فکر و خیال کی بلندی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کی بے نظیر آرائش، عقلیت و شعریت کی عجیب ہم آہنگی، چست استعاروں اور تشبیہوں کا امتزاج اردو ادب میں پہلی بار اس شان کے ساتھ مولانا ہی کے قلم سے آیا۔ الہلال اور ترجمان القرآن نے اردو صحافت و ادبیات کو ایک بالکل اچھوتے انداز سے آشنا کیا۔ فہم و بیان کی یہ یکتائی شاید مولانا کے سوا شاید ہی کہیں نظر آسکے۔

تاہم مولانا مرحوم کی ادبیانہ عظمت و بلند پروازی کے ساتھ ساتھ حقائق و حالات کا گہرا ادراک بھی تھا جس نے یکایک مسلمانانِ ہند کی توجہات کو مولانا کی ذاتِ گرامی پر مرکوز کردیا تھا۔ تحریکِ ۱۸۵۷ء کی شکست اور برٹش اقتدار کے عروج نے مسلمانوں کو ایک ایسے دوراہے پر پہنچا دیا تھا جہاں وہ افسردگی اور احساسِ کمتری کا بُری طرح شکار تھے۔ سرسید مرحوم نے اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمان ملکی سیاست سے دست کش رہیں اور حکمراں طاقت سے اُن کے تعلقات و روابط گہرے اور استوار ہوں۔ رفتہ رفتہ اس کوشش کے عملی معنی یہ سمجھے گئے کہ سیاسیات سے نفرت و گریز بلکہ رقابت کی حد تک پہنچا جائے۔ یہ سرسید کی پالیسی بجائے خود کبھی غلط تھی، پھر وقت کے حالات نے اس کو خود مسلمانوں اور پورے ملک کے لئے ایک شدید خطرہ بنا دیا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ ہر ملک کے ساتھ قومی تقاضوں سے زیادہ مانوس اور وابستہ ہوتا جارہا تھا مسلمانوں کا سیاست سے دور رہنا اتنی بڑی سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج کا اندازہ بھی دشوار ہے۔ سرسید کے گہرے تعلقات تھے اس کے باوجود اُن کی یہ تحریک اُن کے جانشینوں کے ہاتھوں آگے پہنچتے پہنچتے اینٹی پالیٹکس کے بجائے 'اینٹی ہندو' شکل اختیار کر گئی۔

جس وقت مولانا مرحوم اُفقِ ہند پر نمودار ہوتے ہیں اس وقت مسلمانانِ ہند کی مروجہ پالیسی کے دو ہی پہلو تھے! حکومتِ وقت کی حمایت! کانگریس کی مخالفت! اس وقت مسلمانوں میں جو نیم سیاسی ذہن و دماغ تھے بھی اُن کی بھاری اکثریت' سرسید مرحوم کی اس پالیسی کے سوا کوئی دوسرا طریقہ کار سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ یعنی" حکومت کا ہاتھ بٹانا اور ہندوؤں سے دور رہو"

اسی فضا میں اچانک مولانا مرحوم قیادت کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور جس قوت و بے باکی کے ساتھ انھوں نے ایک طرف برطانوی اقتدار کو چیلنج کیا اور دوسری جانب مسلمانوں کو محاذِ سیاست کی طرف دعوت دی' اس ناگہانی صدا نے پہلے پہل وقت کے مسلم رہنماؤں کو ایک شدید جھٹکہ دیا اور برہم کردیا۔ جس وقت مولانا نے یہ اعلان کیا کہ

"ہندوستان کی مکمل آزادی نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانانِ عالم کے مفاد کے لئے ضروری ہے"

تو مزعوم مسلمان لیڈر سراسیمگی کے عالم میں کچھ سمجھنے ہی سے قاصر رہے۔ اُن کی نظر میں مولانا کا یہ موقف ایک حد درجہ کی بدعت تھی۔

اس عالم میں الہلال کی صدا مسلمانانِ ہند کے لئے نشاۃ ثانیہ کا ایک پیغام تھی مولانا مرحوم نے عمرِ عزیز کے کم و بیش پچاس سال قوم پروری' آزادی، جمہوریت ترقی و پیش رفت کی علمبرداری میں گذارے۔

مولانا آزاد ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنے ساتھ مذہبی تقدس کی شان رکھتا تھا اُن کی پرورش اور تربیت' خاندانی رسوم و روایات کے مطابق ہوئی تھی۔

فلسفہ دینیات کے فاضل اور اسلامی فکر و نظر کے باکمال ترجمان ہوتے ہوئے اُن کا سیاسی مشن اور اصلاح و دعوت کا یہ موقف بعض عقیدت مندوں کے لئے کچھ انوکھا سا تھا حالانکہ اس میں ندرت و استعجاب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہاں۔ انھیں لوگوں کے لئے یہ موقف کچھ اجنبی ہوسکتا تھا جو اسلام کی حقیقی تعلیم کو فراموش کرچکے تھے اور اسلام کا صرف وہ تصور اُن کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا جو برٹش دورِ حکومت نے "انڈین محمڈن" کے نام سے پیدا کیا تھا۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کی دعوت پر سب سے پہلے جو طبقہ آگے بڑھا وہ قدامت پسند اور مشرقیت کے حامل علما ہی کا طبقہ تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے رفقاء ہی تھا مولانا آزاد کو کچھ آشنا، راز و ہم مزاج مل سکے۔

گہرے دینی مطالعہ اور اسلام کے بنیادی نظریات۔ حریت' جمہوریت' فکر و نظر کے بہتے ہوئے دھارے نے اس نوجوان عالم (مولانا آزاد) کو اس وقت کی بے وقعت سیاست۔ معاشرہ۔ جاگیردارانہ سسٹم اور ذہنی تملق و افلاس کا شدید معاند و نکتہ چیں بنادیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ

سیاست و صحافت بنا دیا۔ انگریزانہ خوشامدی ذہنیت اور اپنی پستی کی ذلتوں کے خلاف پوری تندی و تیزی سے صف آرا ہوگئے اور یہی پس منظر تھا جو اُن کو خاندان کی خانقاہی اور گوشہ نشینی کی زندگی سے سیاست کی گرم بازاریوں میں کھینچ لایا۔

یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ شانہ روز سیاسی مصروفیتیں اور سرگرمیاں بھی مولانا علیہ الرحمۃ کی عالمانہ سربلندی و امتیاز پر کبھی حاوی نہ ہو سکیں۔ اس لئے کہ علمی فضیلت جاودانی زندگی کی پائیدار اور سدا بہار قدروں میں سے ہے جبکہ سیاست وقت اور ہنگامہ کا ایک تقاضہ ہوتی ہے اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد ہمیشہ ایک ڈپلومیٹ اور سیاس سے کہیں زیادہ ایک مدبر اور صاحب فکر و نظر تھے۔ اُن کی سیاسی زندگی میں بھی یہ وصف ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

اُن کا ذہنی توازن و متانت اور بے لاگ فیصلہ کی سچائی اور نکھار۔ اپنے اندر احساس و شعور کی شاعرانہ نزاکتیں رکھتے ہوئے بھی اُنھوں نے کبھی اپنے کسی سیاسی معاملہ پر جذبات کی پرچھائیں نہ پڑنے دی۔ اُن کی کوئی پسند یا ناپسندیدگی کبھی جذبات سے متاثر نہ ہوتی تھی۔ حالات و واقعات کی کسی بھی نوعیت کو وہ جس مثبت اور ایجابی انداز نظر سے جانچتے تھے۔ وہ دوست و دشمن سب ہی کے لئے حیرت کا باعث ہوتا تھا اُن کی نظر میں جو دوررسی اور صاف بینی تھی وہ اسی ذہنی متانت و توازن کا نتیجہ تھی۔ ایک انسان جب تک کسی معاملہ کو خالص عقل و دلیل کی راہ سے جانچتا ہے اُس میں غلطی شاذ و نادر ہی راہ پاتی ہے۔ سیاست ہو یا کوئی دوسرا موضوع، غلط روی اُسی وقت نمایاں ہوتی ہے جب تنگ نظری ذہنی توازن پر غلبہ پا جاتی ہے اور صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں کو جانچنے پرکھنے سے رکاوٹ بنتی ہے

ذہنی سنجیدگی اور قوتِ فیصلہ کے نکھار نے مولانا آزاد کے سیاسی فیصلوں کو کبھی وہ رنگ نہ آنے دیا جو شخصی اور نجی فیصلوں کے عام رنگ سے بہت زیادہ روشن و پاک و صاف تھا جس سے دوست سرنگوں ہوتے تو دشمن بھی لاجواب۔ مولانا کا یہی وصف اس پس منظر کو بھی واضح کرتا ہے کہ کس طرح تلخ ترین الزامات میں بھی غیظ و غضب کا کوئی لفظ یا غیر شریفانہ الزام دہی کا کوئی جملہ اُن کے ہونٹوں سے کبھی نہ نکل سکا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے معاملہ میں بھی جنھوں نے مولانا کی توہین و تذلیل اور گزند رسانی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ تصادم و ٹکراؤ کی ان صورتوں میں بھی مولانا جس قدر ثابت قدم اور غیر متزلزل نظر آتے تھے اس کی مثال کسی دوسرے کیرکٹر میں ملنی دشوار ہے۔ دل و دماغ کی اس سلیقہ مندی اور نظم و استقلال نے مولانا مرحوم کو ایسی عظیم شخصیت بنا دیا تھا جس کا عزم و حوصلہ ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراج تسلیم و تحسین حاصل کر لیتا تھا۔

مولانا کی شخصیت جس امتیاز، انفرادیت اور علیحدگی پسندی کی حامل تھی، اُس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ مختلف افسانے اُن کے متعلق گھڑ دیئے جاتے تھے منجملہ اُن کے ایک بنیاد کہانی ازہر یونیورسٹی میں اُن کی تعلیم کی بھی مشہور ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی تمام تر تعلیم گھر پر ہوئی اور وہ ازہر محض ایک وزیٹر کے طور پر گئے تھے جبکہ اُن کی تعلیم تکمیل کو پہونچ چکی تھی۔

انھوں نے اوائل عمر ہی میں علم و مطالعہ کی ... اس مرکزی نقطہ اس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں اپنے اپنے ماہنامہ اور عمر رسیدہ معاصر مولانا کی تحریریں لسان الصدق میں چھپتی رہیں۔ معاصر موصوف نے بعض مسائل و نکات پر تبادلۂ خیال کے لئے مولانا سے ملاقات کی خواہش کی۔ نو عمر مولانا آزاد جب اس عمر رسیدہ عالم کے پاس پہونچے تو انھوں نے بڑی شفقت سے اُن کا خیر مقدم کیا اور پوچھا کہ "آپ کے والد صاحب خود کیوں تشریف نہیں لائے کہ آپ کو بھیجنا پڑا۔

یہ واقعہ بھی مولانا کی سوانح میں مشہور ہے کہ ایک تقریب میں جو مولانا ہی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی جب مولانا پہونچے تو اُن کو دروازہ میں داخل نہ ہونے دیا گیا اس لئے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ علوم و معارف کا وہ شہسوار جس کی شہرت چار سو ہے، یہ نوجوان ہو سکتا ہے۔

"دور بینی اور مآل اندیشی" ایک ایسا وصف ہے جو انسانوں کو مختلف شکلوں میں اپنے مفید نتائج اور بخششوں سے نوازتا ہے۔ کسی کو اس کی بدولت ظاہری قوت نصیب ہوتی ہے تو کسی کو فکر و فہم کی گہرائی۔ کسی کو اس سے رسوخ و نفوذ حاصل ہوتا ہے تو کسی کو ہر دلعزیزی اور شہرت دوام مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے یہ تمام ثمرات و نتائج کسی ایک ہی انسان کو نصیب ہوں۔ مولانا آزاد مرحوم خوش نصیب تھے کہ دور بینی کی صلاحیت اور مآل اندیشی کے جوہر نے اُن کو وہ تمام خلعتیں یکجائی عطا کیں جن کی آرزو کوئی انسان کر سکتا ہے وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ اُن کا تنوع اور بوقلمونی عام انسانی ادراک و فہم کے لئے باعثِ صد حیرت و استعجاب تھا۔

ان تمام حیرت انگیز اوصاف و کمالات کے اجتماع نے مولانا کی ذات کو قدرتی طور پر "انفرادیت" کی وہ شان بخشی تھی کہ وہ ذہنی اور وجدانی طور پر خود کو ہمیشہ یکہ و تنہا محسوس کرتے تھے اور جو اُن سے ملتا تھا وہ بھی اُن کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں احساس تنہائی و انفرادیت کو منفرد محسوس کرتا تھا۔ خلق و تواضع کے بے مثال جوہر بے پناہ ہمدردی اور بیشمار رعنائیاں رکھتے ہوئے بھی اُن کی عمر ایک ایسے ذہنی ماحول میں گذری جہاں کوئی رفیق ہمسر کوئی ہمراز و شناسا نظر نہ آتا تھا۔ اپنے فکر و تخیل کی دنیا ہی اُن کی دنیا تھی اور فکر و انہماک ہی نے اُن کو وہ قوت بخشی تھی جس سے وہ تمام عمر کشمکش روزگار کی الجھنوں کا مقابلہ کر سکے۔ دلسوزی و غمخواری کے شدید احساسات کے ساتھ ساتھ اُن میں جرأت و حوصلہ، تحمل و برداشت اور بنی نوع انسان کی فطری صلاحیتوں سے وابستہ "امید" کے وہ انمول جواہر بھی تھے جن کے سہارے وہ غمہائے روزگار کو عمر بھر جھیلتے رہے۔ خدائے برحق پر اعتماد و اعتقاد کی قوت ان میں بے اندازہ تھی۔ اسوہ حسنہ اور اعتقاد و یقین کی دولت ہی مولانا مرحوم کی وراثت ہے جو وہ آنے والی نسلوں کے لئے باقی چھوڑ گئے ہیں۔

رحمہ اللہ و شکر مساعیہ

"ابوالکلام کی شخصیت ان بلند شخصیتوں میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا۔

دورِ جدید میں اگر مذہب کو کسی نے سیاست سے صحیح طور پر ملا دیا ہے اور علماء کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کیا تو وہ تنہا مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی

مولانا ابوالکلام کا دماغ ان معجزات میں سے تھا جو کارکنان قضا و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں"

" سجاد حیدر "

میں لکھوں تو کیا لکھوں

"میرے بھائی! حکایتِ غمِ دل تلخ بھی ہے اور ناقابلِ اظہار بھی! جو کان میری آواز سے آشنا نہ ہو سکے وہ میرے درخورِ التفات کب سمجھ سکتے ہیں! کہوں تو کس سے کہوں اور کیا کہوں!"

یہ جگر خراش آوازِ حیات جس شخص کی زبان سے نکلی اس کے بارے میں آج مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ لکھوں تو کیا لکھوں!

امام الہند حضرت مولانا آزادؒ کی زندگی باعتبارِ عمل صاف اور واضح ہونے کے باوجود اتنی جامع اور مکمل ہے کہ اُس کے ہر ایک گوشے پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑے سے بڑا سوانح نگار کو اپنے عجزِ نگارش کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

اُن کے علمی کمالات لامحدود، اُن کی فکری صلاحیتوں کا دائرہ وسعتِ نگاہ سے کہیں آگے — اُن کا تبحرِ احساس و تفکر بے پایاں، اُن کی ادبی بلندیاں سرحدِ ادراک سے دُور!

اُن کو اُن کی نگاہ کے سوا نہ کسی نے دیکھا اور نہ اُن کے خیال کے مطابق کوئی اُنہیں سمجھ سکا۔

میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا کے قریبی حلقوں میں میرا شمار رہا ہے اور اُن کی چشمِ التفات تا زندگی مجھے اپنا سمجھتی رہی لیکن اس سے بڑھ کر بدبختی نہیں ہوگی کہ قریب رہ کر بھی عرفانِ ابوالکلام کے معاملے میں دوری کا گلہ باقی ہے جب کبھی اُن کی بارگاہِ علم و فضل میں حاضری کا موقع ملا اُن کی شخصیت کا تأثر دل و دماغ پر طاری ہو گیا اپنی اہلیت کے مطابق اُن کے ارشادات سُنے قوتِ حافظہ نے انھیں محفوظ رکھنا چاہا لیکن تواترِ کیف، بحث و قبول کے معاملے میں محویت اور حیرت کے عالم میں پہنچا دیتا تھا خود کچھ عرض کرنے کی ہمت ہوئی بھی تو نزاکتِ مزاج کے احساس میں دب کر رہ گئی۔ جب بھی ملا۔ زندگی بصیرت اور دانش و آگہی کے نئے خاکے ذہن میں مرتب کر کے لایا وطن و ملت کے مسائل پر تو مولانا کی گہری نگاہ تھی ہی۔ معمولی معمولی جزئیاتِ حالات سے بھی وہ باخبر رہتے تھے۔ جو انسان نظروں کے سامنے کبھی آ جاتا تھا اُس کی داخلی زندگی کے ہر پہلو کو وہ بھانپ لیتے اور دوبارہ ملاقات کے وقت اُسے کسی تعارف کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ چند جملوں میں ہزاروں اُلجھنوں کو حل کرنے کی قدرت انہیں حاصل تھی۔ دماغِ مخاطب کا اندازہ فرما کر جب گفتگو کرتے تھے تو سامع کی رُوح و دل کا اطمینان پُورے اتباع کے ساتھ اُن کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کسی مصلحِ مزاجِ اقوام کے لئے صبر و استقامت، ہوش اور خرد و آگاہی کے جن کمالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ان میں موجود تھے۔ اسلام کے حقائق کو قدیم و جدید رجحانات کا احاطہ کر کے پیش کرنے میں اُن کا ثانی تلاش کرنے پر بھی نہیں مل سکے گا۔ انسانوں پر انسان کی آمرانہ حکومت کو وہ اسلام کے انسانیت نواز اصولوں سے متصادم پاتے تھے اس لئے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی ہر صدائے عمل ان کے مُنہ سے نکلی اور جب تک اُسے ختم نہیں کر لیا یہ نوائے حُریت ان کے سازِ حیات سے مانوس رہی آزادیٔ کامل کا تصور انھوں نے ہی ہمیں بخشا اور اس جادۂ پُرپیچ کے ہر موڑ پر رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیئے ہندوستان کی عظیم سیاسی ہستی "گاندھی جی" انھیں 'اپنا مخلص رفیق' اور لائقِ احترام مشیر مانتے تھے اور اُن کے مشوروں کو قبول کر کے خوش ہوتے تھے بسا اوقات اُن کے مشوروں کی بدولت ملک اُن خطرات سے بچ گیا جن کی ہیبتناکیاں صفحاتِ تاریخ پر عبرت و موعظت کی کہانیاں چھوڑ جائیں۔ اُن کا دماغ شاہانہ "مزاج فقیرانہ" اور زندگی بے نیازانہ تھی مذہب فروش علماء اور وطن فروش رہنماؤں سے تنفر جزوِ خمیر تھا۔ اُن کی خوشی اور ناراضی دونوں اپنے

محترم حافظ محمد ابراہیم وزیر حکومت ہند

مقام پر سوا رہتی اندازمیں رہتی تھیں، دشمنوں سے تلطّف اور معاملات کا برتاؤ ترکِ آزار ہیں، ہوتا تھا۔ لگ اُن کی خوت پسندوں اکثر اعراض و تکبر کا مرادف سمجھتے تھے ۔ لیکن یہ ادائیں اُن کے لئے اطمینان و سکوت کے ماحول میں معاشر اور تفکر کی فضا تیار کرتی تھیں اُن کی پُوری زندگی میں سب سے زیادہ اور وہ بھی رنج و الم کا دن تقاضب آزادی وطن کا تحفہ روح فرسا تقسیم وطن کی تجویز المناک کا مژدہ سنا دیا اُن کی دُور بیں نگاہیں نتائجِ تقسیم کے جگر خراش نقشے دیکھ رہی تھیں اور مستقبل میں بلند ہونے والی کروڑوں ماتم و فریاد کی صداؤں کو وہ یُوں محسوس کر رہے تھے جیسے آج ہی اُن کا سکوت ٹوٹا ہے ۔

تنہا مسلمانوں کی بربادی و تباہی کا تصور انھیں بے چین نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ضربِ تقسیم میں آنے والی پُوری آبادی کے اُجڑنے کا یقین دل میں لئے مجسم اضطراب بن رہے تھے یُوں تو اُن کی زندگی کا سینہ ہزاروں بار آلام و غم کا گہوارہ بنا لیکن پلکیں دل کی ترجمانی کا شرف نہ حاصل کر سکیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں پیش آنے والے حوادثِ عبرت زا کا دُور اندیشانہ احساس کبھی کبھی خونِ دلِ دلگیر کا گوہرِ شفاف آنکھوں تک آ ہی جاتا تھا۔

یہ ایسا صدمہ تھا جو اندر ہی اندر انھیں گھلاتا رہا اور عزم و ارادہ کے بل پر چلنے والی جسمانی مشین بھی اُسے برداشت کرتے کرتے تھک گئی۔

ہم اب کہاں ہیں۔ کس مقام پر کھڑے ہیں، صراطِ مستقیم کدھر ہے؟ کاروانِ بے خضر کی حیثیت سے سوچتے ہیں راستہ کس سے پوچھیں؟ بے کسی و بے چارگی کے عالم میں کسے پکاریں؟ اور تلاش و تجسس کی پیہم ناکامیوں کے بعد کہیں تو کیا کہیں؟

مکتبِ عشق کا نرالا دستور!

"دیارِ محبت میں انتقام و دعوی کی شنوائی نہیں۔ عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لیکر آئے تو سر جھکا دیجئے اور ہو سکے تو بڑھ کر اسکے ہاتھوں کو چوم لیجئے۔"

ابوالکلامؒ

مولانا آزاد وزارتِ تعلیم کی مسند پر

از جناب اشفاق حسین صاحب ڈپٹی سکریٹری وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند

بخدمت عالیجناب مدیر صاحب الجمعیۃ دہلی۔

بندہ نواز!

مولانا مرحوم کی شخصیت ایسی تھی کہ ہر اُس شخص کا فرض ہے کہ نذرِ عقیدت پیش کرے جو اپنے کو مسلمان یا ہندوستانی کہتا ہے یا انسانی کردار کی بلندی کو زندگی کا ماحصل یا سرمایہ حیات سمجھتا ہے مگر اتنی عظیم شخصیت پر تبصرہ کرنے کے لئے جو اہلیت درکار ہے وہ میری بساط سے باہر ہے، نہ نظر میں وہ روشنی ہے نہ زبان میں وہ طاقت اور پھر شاید جیسا ڈاکٹر رادھا کرشنن صاحب نے فرمایا ابھی وہ وقت دور ہے جب مولانا کی شخصیت کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔ خواہ اُن کی ذات کا خواہ اُن کی ملی یا تاریخی حیثیت کا۔ ابھی تو ہم اس پہاڑ کے دامن ہی میں ہیں۔ جسے کل تک ہم ابو الکلام آزاد کے نام سے پکارتے تھے اور جو اب صفحہ تاریخ پر انسانی کردار اور شخصیت کا ایک عظیم نمونہ ہے ابھی وہ ہم سے اس قدر قریب ہے کہ اس کی عظمت اور بلندی کو پوری طرح سے اپنی نگاہ میں سمیٹ نہیں سکتے۔

اس لئے اگر تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں تو اُمید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ صرف میری نا اہلیت اور وقت ہی سدِ راہ نہیں ہیں بلکہ قسمت کی وہ اچانک اور بھرپور ضرب بھی جس نے ہوش حواس کو ایک حد تک معطل کر رکھا ہے، خیالات پراگندہ ہیں، بس کچھ بکھرے تأثرات ہی پیش کر سکتا ہوں۔

مولانا مرحوم کی قوتِ تحریر اور تقریر کی دھاک تو دل پر ایک زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی، اور "ترجمان القرآن" نے اُس پر مہر لگا دی تھی "تفسیر سورۂ فاتحہ" نے تو اس درجہ مسحور کر دیا تھا کہ "غبارِ خاطر" جیسا شاہکار بھی عقیدت میں اضافہ نہ کر سکا۔ مگر مولانا کی شخصیت سے روشناس ہونے کا موقع اس وقت تک نہ مل سکا جب تک کہ اُنھوں نے جنوری ۱۹۴۷ء میں تعلیمات کا قلمدان وزارت نہیں سنبھالا۔ اُس وقت مجھے سرکاری طور پر اُن کی خدمت کا شرف نصیب ہوا اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ یہ شرف مجھے تقریباً گیارہ سال تک حاصل رہا۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے خدمتگار کی نگاہ میں قابل پرستش نہیں رہتا۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے خدمت گار سے اُس کا چھپا رہنا محال ہوتا ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی کمزوریاں شخصیت کی مجموعی عظمت پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ مولانا مرحوم انسان کی فطری خاصیت سے مستثنیٰ نہ تھے مگر اُن کی شخصیت اتنی تابناک تھی کہ اُس کی جگمگاہٹ سو پردوں میں سے بھی پھوٹ نکلتی تھی، اس پردہ میں سے بھی جو سب سے بھاری پردہ تھا یعنی خود اُن کی تنہائیت۔ کم از کم زندگی کے آخری دس سال اُنھوں نے اس طرح گزارے کہ دنیا کے معاملات سے باخبر رہتے ہوئے اور اُن پر اپنی فراست اور دانشمندی کی کڑی نظر رکھتے ہوئے بھی اپنے کو ماحول سے گویا سمیٹ لیا تھا۔ ماحول پر اپنا پورا اثر ڈالتے ہوئے اپنے کو ماحول کے اثر سے محفوظ کر لیا تھا اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات اور خیالات کو گویا ایک آہنی ماحول پہنا دیا تھا جس کو دوسروں کی نظریں پا نہیں کر سکتی تھیں کتنے ہیں جو بزعم خود یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مولانا نے اپنے احساسات اور خیالات میں انھیں بھی شریک بنایا؟ خود مجھے تو یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا اور اس لئے میں اُن کے بارہ میں وثوق سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس گیارہ سال کے دوران میں میں نے اُن کا طریقہ کار دوسروں سے بڑا؟ اور طبعی رجحان جو دیکھا اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔

علم و ادب کی دنیا میں مولانا کی جو جگہ ہے اُس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں اور اس پر تفصیل سے تبصرہ کرنا مجھ سے زیادہ فاضل کا کام ہے۔ مولانا کی شخصیت کا مجھ پر جو پہلا اثر پڑا وہ اُن کی حیرتناک ذہانت، فراست اور تدبر کا تھا۔ باوجود اس کے کہ انھیں حکومت کے کاموں اور طریقوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا، وزارت سنبھالتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کاموں اور ان راہوں میں اُنھوں نے عمر گذاری ہو۔ ہر معاملہ کو اس قدر جلد سمجھتے تھے، اس کی تہ کو پہونچ جاتے تھے اور پوری تفصیلات پر حاوی ہو کر اس توازن کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی بالکل شروع زمانہ میں ایک ایسا معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا جس کے بارہ میں بے حد نکتہ چینی ہو رہی تھی اُنھوں نے نہایت تفصیل سے معاملہ کی جانچ کی اور جب انھیں اطمینان ہو گیا کہ محکمہ کی جانب سے جو کارروائی ہوئی تھی وہ اصولاً اور مجموعی حیثیت سے صحیح تھی اور اعتراضات کی بنا کچھ اور تھی تو انھیں اس میں بالکل تامل نہ ہوا کہ محض مسل پر نہیں بلکہ پریس کانفرنس بلا کر اعلانیہ محکمہ کے کام کو سراہیں، گو جو کچھ ہوا تھا وہ اُن سے پہلے کی بات تھی اور وہ اُس کے ذمہ دار نہ تھے اُن کی اس دیانت دارانہ اور باہمت پشت پناہی سے محکمہ کی بہت ہمت افزائی ہوئی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُنھوں نے اس کے فوراً بعد ہی افسر متعلقہ کو بلا کر اُسے محکمہ کی کوتاہیوں سے آگاہ کر دیا اور تنبیہ کی کہ ان کوتاہیوں کو فوراً دور کیا جائے۔ تیز نگاہ اور معاملہ فہمی، یہ توازن اور تدبر ایک منجھے ہوئے تجربہ کار عامل کا کام تھا نہ کہ حکومت کے پیچدار کوچوں میں ایک نو وارد کا۔

اس کے بعد ان گنت مواقع آئے اور برابر میں اسی معاملہ فہمی، فراست، توازن، تدبر اور دیانت داری کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ان تمام واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ مختصراً صرف اتنا عرض کر دوں کہ مولانا کی جس خوبی کا مجھ پر سب سے زیادہ گہرا اثر پڑا وہ اُن کی بے لاگ دیانتداری تھی، یہ بنیادی دیانتداری اس قدر مستحکم تھی کہ میں نے کبھی بھی مولانا میں کسی قسم کے تعصب کا شائبہ بھی نہیں پایا۔ اُن کے دل و دماغ میں نری صداقت کی روشنی تھی اور اگر کوئی بندش تھی تو صرف بنیادی اصولوں کی۔ اصول پر وہ اٹل تھے اور فروع کو اصول کا تابع رکھتے تھے، ہر معاملہ پر اس نگاہ سے نظر کرتے کہ جو حالات ہیں اُن میں کسی اصول کا خون کئے بغیر صحیح تر طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے بلا لحاظ اس کے کہ معاملہ کا تعلق دوست سے ہے یا دشمن سے۔ دوست کے کسی ناروا فعل کو روا نہیں رکھا اور مفادِ عامہ کی خاطر دشمن کو بھی فائدہ پہنچانے میں انہیں کبھی تامل نہیں ہوا۔ یقیناً یہ اسی بے تعصبی کا ایک کرشمہ تھا کہ اُن کے مزاج میں تلخی بالکل نہ تھی۔ یعنی اُن کی زبان سے کبھی بھی ایک کڑوا لفظ نہیں سنا۔ مسلم لیگ کے اراکین نے کیا کچھ اُن کے خلاف نہیں کیا اور نہیں کہا مگر مولانا کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لائے۔ تقسیم وطن کو وہ غلط سمجھتے تھے اور ہمیشہ غلط کہا مگر نہ مسلم لیگ کے کسی فرد کے خلاف اُنھوں نے کبھی کوئی نازیبا بات کہی۔ نہ پاکستان کی طرف سے اُن کے دل میں کوئی کدورت تھی۔ تقسیم وطن سے جو ٹھیس دل کو لگی اُس سے ہم میں سے اکثر کے دلوں میں ایک تلخی آ گئی تھی مگر مولانا اس سے ہمیشہ بالا رہے، حتیٰ کہ عین تقسیم کے وقت بھی جو اُن کی زندگی کا تلخ ترین صبر آزما وقت تھا جبکہ اُن کی عمر بھر کی کمائی خاک میں مل رہی تھی۔ اس وقت کا ....

ایک واقعہ میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہے گا اور خدا مجھے توفیق دے کہ اس سے سبق اور سعادت حاصل کرسکوں۔

میرے ایک مسلمان دوست نے مجھ سے مشورہ طلب کیا تھا کہ وہ کیا کریں، ہندوستان میں رہیں یا پاکستان جائیں۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا اور انہیں غلط فہمی ہوئی کہ میری اپنی بات ہے۔ مخالفت یا بیزاری درکنار، انھوں نے تعجب کا بھی اظہار نہیں کیا اور بلا تامل نہایت ٹھنڈے دل سے پوچھا، گویا کسی روزمرہ کے معاملہ پر غور کر رہے ہوں "کس کام کے لئے وہ لوگ آپ کو لیجانا چاہتے ہیں؟" جب میں نے بتایا کہ سوال میرا نہیں کسی اور کا ہے تو انھوں نے پھر اسی نقطۂ نظر سے بات کی۔ میرے دوست سے وہ زیادہ واقف نہیں تھے اس لئے معاملہ کے عام پہلو پر گفتگو کی۔ انھوں نے فرمایا "پاکستان کا بننا ایک شدید غلطی اور بدنصیبی ہے۔ اس سے انتہائی نقصان پہونچا ہے۔ مگر خیر اب پاکستان بن گیا ہے تو ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ اس نقصان میں اضافہ نہ ہو، ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان مضبوط ہو اور وہاں اچھی حکومت قائم ہو، ان کے پاس اچھے آدمیوں کی بہت کمی ہے اس لئے یہاں سے کچھ اچھے آدمی جانے چاہئیں۔ صرف اس کا اطمینان کرلینا چاہیئے کہ وہ وہاں کسی مفید کام پر لگائے جائیں گے۔" ان حالات میں یہ الفاظ اسی شخص کی زبان سے نکل سکتے تھے جو صحیح معنوں میں فراخدل اور روشن دماغ ہو اور جو خودپرستی اور تعصب کی گرد راہ سے پاک ہو کر انسانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ چکا ہو۔ ایسا انسان کمیاب ہوتا ہے، بہت ہی کمیاب۔ دنیا بھی ایک فخر انسانیت ہماری اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ خدا کرے دنیا اس کی صحیح قدر کرسکے اور اس مثال کو اپنے لئے چراغ راہ بنائے۔

قطعات

شد روان جانب بہشت بریں ۔۔۔ زین جہان آن بحکم رب عباد

گفت تاریخ رحلتش رحمتؔ ۔۔۔ رفت حضرت ابو الکلام آزاد

۱۳ ۵ ۷۷

(رحمتؔ بلند شہری)

یہ زیر خاک ہیں خاموش آج طوطی بیاں

۱۹ ۵۸

بلند رتبہ مفکر ابو الکلام آزاد

۱۳ م ۷۷

ابو الکلام کو بخشے خدا مقام بقا

۱۹ ۵۸

وہ نیک منبع و ہر نجیب نیک نہاد

۱۳ ۵ ۷۷

محمد عبد البصیر نجیب آرلوئی

نازش ہندوستان

مفتی بشیرالدین احمد لبش ایم اے

اک مہر علم و دانش و عرفاں گذر گیا
اک حق پرست حق کا نگہباں گذر گیا

اے ہند! تیرے تاج کا وہ دُرِ شاہوار
اے شرق تیرا لعل بدخشاں گذر گیا

وہ جس کے مشورے تھے کلید کشود کار
وہ چارہ گر وہ درد کا درماں گذر گیا

وہ جس کا لفظ لفظ تھا اک نغمۂ حیات
وہ اپنے کارواں کا حُدی خواں گذر گیا

وہ جس کو طعن و طنز کے کانٹے بھی پھول تھے
آنکھوں سے چن کے خارِ بیاباں گذر گیا

طوفاں ہٹا نہ سکا اُسے راہِ ثبات سے
قدموں کو جس کے چوم کے طوفاں گذر گیا

موتی چُنے تھے جس نے خدا کے کلام کے
غواص بحرِ معنیِ قرآں گذر گیا

انصاف کی تلاش میں اے مورِ ناتواں
جانے کہاں کہ آج سلیماں گذر گیا

ہندوستاں کو ناز تھا جس کے وجود پر
وہ پیکرِ عظیم وہ انساں گذر گیا

انسانی عظمت و سربلندی کا حقیقی راز

مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تقریر

گاندھی جی کے حادثہ قتل کے چند ہی روز بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نیو دہلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا۔ جس کا موضوع بحث یہ تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اجتماع کی صدارت مرحوم و مغفور مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ آپ کی صدارتی تقریر پیش نظر سطور میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ پوری تقریر غیر مطبوعہ ہے۔ گاندھی جی وطن عزیز کے سب سے اونچے لیڈر تھے اور ان کی عظیم شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان کی عظمت و سربلندی کا حقیقی راز کیا تھا؟ ہر فکر و ذہن سے الگ مولانا آزاد نے بالکل انوکھے اور نئے انداز سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ آج جبکہ خود مولانا مرحوم ہمارے درمیان سے رخصت ہو چکے ہیں اور خود ان کی شایان شان یادگار کا سوال ہمارے سامنے ہے، اس موقعہ پر اس تقریر کا شائع کرنا بے محل نہ ہوگا ——— "ادارہ"

آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے جو مہاتما جی کی ایک ایسی یادگار قائم کرنے کے مسئلہ پر غور و فکر کرے گی جو ان کے پاکیزہ مقاصد حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کرے۔

اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ان کی خدمات کے تذکرے اور قلمی یادگاریں، ان کے کارنامے محفوظ کئے جا رہے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں جب زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک روشن حقیقت ان کے سامنے آ جائے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن میں جب بھی سوچتا ہوں ایک چیز بار بار میرے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے اس میں مجھے ایک بڑا خانہ خالی نظر آتا ہے اور اگر اس کو پُر نہ کیا گیا تو ایک بڑی کمی رہ جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما جی کی زندگی مختلف کاموں میں گذری ہے لیکن ان جیسی شخصیتیں دنیا میں کبھی کبھی ابھرا کرتی ہیں جو دنیا کی تمام خود ساختہ حد بندیوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں جیسے جغرافیائی حد بندی، کہا جاتا ہے یہ یورپ ہے، یہ ایشیا، یہ عرب، یہ ہندوستان وغیرہ

مذہبی حد بندی، ہم کہتے ہیں یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی، یہ ہندو، یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حد بندی: کہا جاتا ہے، یہ انگریز ہے، یہ اٹالین، یہ ہندی وغیرہ

لسانی حد بندی: کہا جائے گا یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان وغیرہ

ایسے ہی رنگ، نسل کی حد بندی وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرہ میں رہتی ہیں ہمارے لئے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو گروہ انسانی کو تباہ کر دینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ میں جب بھی ان حد بندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چمکتے تھے خاک میں مل جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذہب کی حد بندی کو لیجئے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے، اور صلح و آشتی، امن و انصاف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر مذہب بنیادی طور پر صحیح مانتا ہے لیکن یہی مذہبی حد بندی جب تخریبی جامہ پہن لیتی ہے تو ہزاروں خونریزیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہزاروں کشت و خون ہیں جو اسی مذہب کے نام پر ہوئے ہیں۔

اپنے ہی ماحول کو دیکھئے کہ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہو چکا ہے وہ خدا کا نام لے کر ہی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیائی حد بندی کو لیجئے۔ قرآن کی بولی میں یہ حد بندیاں اس لئے تھیں کہ "لتعارفوا" تم میں باہم پہچان پیدا ہو۔ لیکن یہی حد بندی جب تباہی کی شکل میں آتی ہے تو بڑی بڑی بربادیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال قومی حد بندی کا ہے اس کا مقصد بھی وہی "لتعارفوا" ہے یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی جو ایک ذریعہ پہچان تھی جب اپنی حدوں سے گذر جاتی ہے تو دنیا میں بڑی بڑی خونریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجہ میں ہوتی ہیں۔

غرضیکہ دنیا میں بہت سی حد بندیاں ہیں جو ہماری زندگی پر چھا گئی ہیں اور ہم ان میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ ہم میں بڑی سے بڑی روح بڑائی کی بڑی سے بڑی جگہ پیدا کر سکتی ہے لیکن ان حدود کے اندر ہی اندر رہ کر! ان سے قدم رکھنے کی ان میں جرأت ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس طرح نیچر ایک خاص ڈھنگ پر چلتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنا رنگ چھوڑ دیتا ہے ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کی افق پر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں کہ دنیا کی کوئی حد بندی بھی انہیں بڑائی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔ مذہب کی حد بندی ان کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ قومیت کی حد بندی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ وطنیت کی حد بندی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ وہ ان تمام حدود سے بہت اونچے اور بلند ہوتے ہیں۔

جب یہ شخصیتیں ان بندشوں کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں تب آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھوں میں سچائی کا نور پیدا ہو جاتا ہے، ان کی نگاہ میں تعصب کا ایک شمہ نہیں رہتا۔ ان کی نظر ہر طرف اور ہر گوشہ پر یکساں پڑتی ہے۔ دنیا کا تمام اچھا برا ان کے سامنے ہوتا ہے وہ سب کو ایک ہی نور سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں، انہیں جہاں کہیں حسن نظر آتا ہے وہ دوڑتے ہیں کہ یہ تو

ہمارے لئے ہے۔ اُنھیں جس طرف خوبی نظر آتی ہے وہ اُس کو اپنا نے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ یاد رکھئے کہ تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت ہی کم ہوا کرتی ہیں

مہاتما جی کی ہستی تاریخ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے اور اُن کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے مجھے اُن کا تعارف سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں ہوا جبکہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی، ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور ان اطراف میں اُن کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرم تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا۔ جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ اُنھوں نے اس ٹیلی گرام میں والد مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء تک مجھے اُن سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقعہ نہ ملا۔ ۱۹۱۶ء میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا۔ ان دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لئے آئے اور اُنھوں نے ایک شخص کے ذریعہ مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں اور تم سے ملنا چاہتا تھا مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا اور ایک جلسہ میں شرکت کے لئے ۱۹۲۰ء کی ۲۰ جنوری کو دہلی آیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اُس دن سے آجتک جبکہ ۱۹۴۸ء ہے، ۲۸ برس گذر چکے ہیں۔ ۲۸ برس کے یہ دن ہم پر ایسے گذرے کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔

اس عرصہ میں بسا اوقات اُن سے اختلافات بھی ہوئے۔ چنانچہ اسی لڑائی کے زمانہ میں میرا اور اُن کا جو اختلاف ہوا تھا اُس سے آپ بھی واقف ہیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں میری یہ قطعی رائے تھی جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دیدی جائے گی تو ہم لڑائی میں شریک ہو سکتے ہیں، اُن کو اس سے سخت اختلاف تھا اور بالکل دوسری جانب جارہے تھے۔ وہ کہتے تھے ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے، اس لئے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لئے تیار نہ تھے۔

آپ کو یہ بھی بتادوں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لئے میں اور پنڈت نہرو گاندھی جی کے پاس گئے۔ وہ اُنھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنادیا۔

غرضیکہ اس طویل مدت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور اُن میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہونچی، اُنھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود اُن کی عظمت کی جو رسی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے۔

اس موقع پر میں آپ سے یہ کہدوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے، وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے جو میرے دماغ پر چھا جائے اور میری گردن کو دبالے اس وقت وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ "میری گردن کی رگیں سخت ہیں" میرے سامنے جب کوئی بات آتی ہے تو پہلے تو میرا ذہن اُس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لے۔ چنانچہ جب پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اُس وقت میں اُن کا معتقد نہیں تھا، میری آنکھیں پہ منتظر تھیں جو انسان کی آنکھوں کو خیرہ کردیا کرتی ہے لیکن اس کے بعد ان کی ہر چیز نے اُن کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کردیا اور جو دن گذرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا۔ وہ میں پنڈت جواہر لال ۔۔۔

ایک کھلی ہوئی کتاب تھے جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن، ہر لفظ دُھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا۔

آج! تمام دُنیا میں شاید اُن ہی کی زندگی ایسی تھی جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ یہ انسانیت کی عظمت کے لئے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر اُترنے والے تمام تاریخ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں جنہیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں

جن کو دنیا کی تمام حد بندیوں نے اُلجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اُلجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے اُن کا دامن پکڑنا چاہا مگر وہ گرفت میں نہ آسکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے، وہ بیشک ہندو تھے، لیکن اُنھوں نے ہندو مذہب و دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا اور وہ ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں، نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہونچ سکے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے

ہندو مذہب کا پُرانا دماغ اور نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے اُس میں بہت زیادہ وسعتیں تھیں اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے دنیا کے تمام مذاہب میں نظریۂ توحید کو جس مذہب نے سب سے زیادہ ترتیب سے دیکھا ہے وہ ہندو مذہب ہے میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں۔ لیکن آج ہندو دھرم کی وہ شکل باقی نہیں ہے اور اس کے بہت سے خانے خالی ہو چکے ہیں۔ ہندو مذہب نے ابتدائی دور میں یونانیوں کو وہ درجہ دیا تھا جو ایک برہمن کا ہوتا ہے صرف اس لئے کہ یونان ایک علم دوست ملک تھا۔ لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ ہندو دماغ گرنے لگا، چھوت چھات اور تنگ دماغ پیدا ہو گیا۔ تب ہی سے ہندو دھرم اپنی بلند سطح سے گر گیا۔

گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اُس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے، اُن کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے بلکہ سورج اور اُس کی شعاعوں کی طرح سب کے لئے ہے۔

پس! ہمیں گاندھی جی کی عظمت ان ادنیٰ درجہ کی چیزوں میں نہیں ڈھونڈنی چاہیئے بلکہ پردہ اُٹھاکر دیکھنا چاہیئے تب حقیقت کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ وہ اتنی بلندی پر تھے کہ دنیا کی کوئی حد بندی اُن کا راستہ روک نہیں سکی۔

آج ہم اُن کی کوئی بھی یادگار بنائیں وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ اُن کی اس سربلندی کو ظاہر نہ کرے۔

اس لئے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں قائم ہونی چاہیئے جو مہاتما جی کی اس سربلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتائے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصدِ حیات یہ تھا جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبانِ حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنالیں لیکن وہ بیکار ہیں جب تک کہ اُن کی اُنگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اُٹھے جو گاندھی جی کے پیش نظر تھی۔

فکر و تہذیب کا ایک سنگم

شری یو این ڈھیبر —— صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی

ادارہ الجمعیۃ کی درخواست پر صدر کانگریس شری یو این ڈھیبر نے اپنا ایک آرٹیکل ماہ جولائی ہی میں الجمعیۃ کے لئے ارسال کردیا تھا۔ اصل آرٹیکل انگریزی میں ہے جس کا اُردو ترجمہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں —————————— (ادارہ)

پانچ ماہ کے لگ بھگ گذر چکے جبکہ ہم نے غم میں ڈوبے ہوئے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ مولانا مرحوم کی میت کو اَبدی و سرمدی آغوشِ راحت کے سپرد کیا تھا۔ اُس دن ہم نہ صرف ایک قومی لیڈر یا ایک وزیر تعلیم ہی سے محروم ہوئے تھے بلکہ ایک عظیم معمار ہم سے رخصت ہوگیا تھا جس نے اپنی تمام صلاحیتیں مادرِ وطن کی آزادی بلکہ پورے صفحۂ عالم پر مظلوموں اور زبردستوں کی رُستگاری و آزادی کے لئے اور وطنِ عزیز کی تعمیرِ جدید کیلئے وقف کردی تھیں، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنی صلاحیتیں ایک عظیم قوم کو سیاسی، سماجی اور تمدنی طور پر سربلند کرنے کے لئے وقف کردی تھیں۔

درحقیقت مولانا مرحوم کی ذات دو زمانوں، دو تہذیبوں اور دو ہمشیر ملتوں کے درمیان ایک نقطۂ وصل تھی۔ اُن کی شخصیت ایک پُل تھی دو مختلف زمانوں کے درمیان یعنی دورِ سفسطہ و تخیل اور دورِ سائنس و مادیت۔

انھوں نے ایک طرف قدامت پسندوں میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ جدید سائنس و ٹیکنولوجی کو ہاتھ لگانے سے اُن کا فکر و نظر اچھوت یا بے کار نہیں ہوجائے گا۔ دوسری طرف انھوں نے یہ ثابت کیا کہ اس عہدِ تخلیق و تعمیر میں بھی قدیم فکر و نظر سائنس کے میدان میں بہت مددگار و مفید ہوسکتا ہے بشرطیکہ ٹھیک طور پر — اعتماد کے ساتھ اُس تک دسترس حاصل کی جائے۔

مولانا سراسر یقین و اعتقاد تھے، اُن کی نگاہ میں شک یا بے اعتمادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح معنیٰ میں عوام کے لئے ایک "پیدائشی رہنما" تھے۔

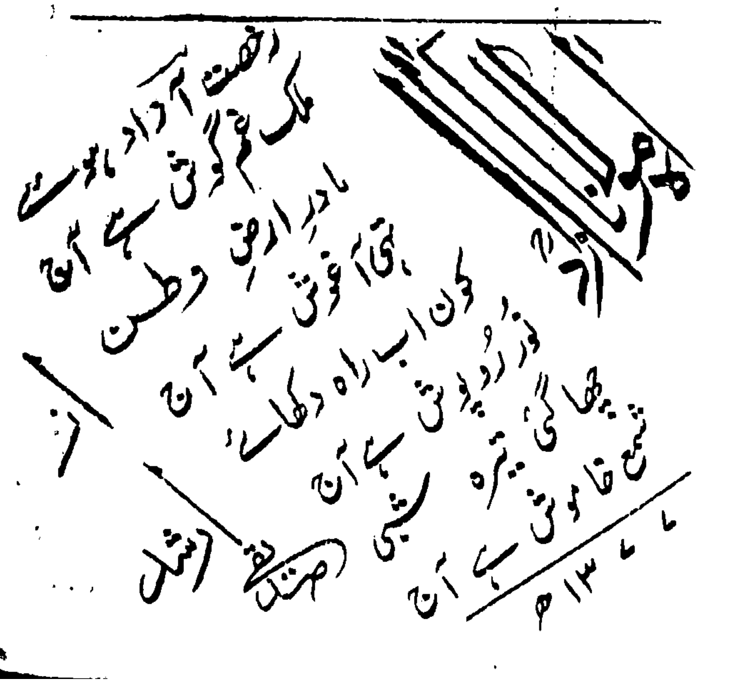
مولانا آزاد کی ذاتِ گرامی دو مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا ایک سنگم تھی۔ ایک قدیم مشرقی تہذیب جو بحرِ ظلمات کے ساحلوں سے بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی ہے اور دوسری مغربی تہذیب جو بحرِ اوقیانوس سے بحرِ ابیض متوسط تک برپا ہے — وہ علم و فضل کا ایک روشن مینار تھے اور زندگی کا ترقی پذیر تصور رکھتے تھے، انھوں نے قدیم و جدید کی خالص روح کی ترجمانی اپنے پاکیزہ اور حسین طرزِ بیان سے کی۔

یہی عظیم شخصیت سرزمینِ ہند پر بسنے والی دو ہمشیر ملتوں کے درمیان بھی ایک نقطۂ اتصال تھی۔ وہ ایک کھرے مسلمان بھی تھے اور سچے ہندوستانی بھی، بلکہ اِن دونوں صفتوں کی خوبیوں کا ایک صحت مند امتزاج یا گلدستہ!

فرقہ پرستی۔ تنگ نظری اور مذہبی تعصب (جس نے لاکھوں دماغوں کو مسموم کیا) کے خلاف صف آرا ہونے والے شہدائے حریت و فدایانِ وطن کے "نقیب" مولانا آزاد تھے۔ یہ حقیقت ہندوستانی قومیت کے لئے سرمایۂ صد فخر و بلندی ہے کہ اس کے سچے رہنماؤں میں ایسی عظیم شخصیتیں بھی تھیں جنھوں نے تفریق و جُدائی کو مٹانے اور مادرِ وطن کی پیشانی کو اس داغ سے پاک و صاف رکھنے کے لئے ہر قیمت پر اپنی کوششیں صرف کردیں — گاندھی جی نے ہندو فرقہ پرستی کے خلاف اور مولانا مرحوم نے مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جس طرح محاذ آرائی کی وہ آئندہ نسلوں کے لئے ایک زندہ مثال ہے کہ انسان جب عزم و تہیہ کیساتھ کسی مقصد کی طرف چل پڑتا ہے تو اس راہ میں کیسی کیسی کٹھن منزلوں سے ہنستا کھیلتا گزر جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ ایک بے مثل خطیب، انشاء پرداز، عالمِ دین اور حیرت انگیز مدبر تھے۔ اُن کی ذات جامع کمالات تھی، اُن کے فہم و اخلاق کے گلدستۂ صد رنگ میں دو چیزیں ہمیشہ نمایاں نظر آتی تھیں۔ اُن کے دل کی گرمی اور اُن کے ہر انداز میں بھروسہ اور اعتقاد! وہ کسی سے نفرت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اُن کے پاس سب ہی کے لئے ماں کی سی شفقت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ تھا، وہ عزم و ارادہ کے شہسوار تھے، شکست و مایوسی سے اُن کا ذہن کبھی آشنا نہ ہوا۔

آج ہماری تاریخ اور ہمارے معاشرہ میں اُن کی جگہ خالی ہے جو اُن کی یاد ہی سے پر ہوسکتی ہے۔ اُن کے خواب اُس وقت تک خواب ہی رہیں گے جب تک ہم اور آپ اپنے عمل سے اُنکی تعبیر نہ پیدا کردیں۔



شہنشاہوں کے لباس میں ایک درویش باصفا

از: وینکٹ راؤ - سکریٹری ہندوستانی ہندی سبھا - حیدرآباد دکن

"شری وینکٹ راؤ نے اپنے پیشِ نظر مقالہ میں حضرت مولانا آزادؒ کی سبق آموز زندگی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ اندازِ بیان کی سادگی اور مقالہ نگار کے پُرخلوص تاثرات اور اُن کا تسلسل متقاضی ہیں کہ کسی قدر طوالت کے باوجود ایک ایک سطر ملاحظہ کی جائے۔ قارئینِ کرام کے لئے یہ مقالہ بھی اپنے اندر پوری دل کشی رکھتا ہے" (ادارہ)

مولانا ابوالکلام آزادؒ شاہ تھے کہ فقیر، یہ کہنا مشکل ہے اُن کے چہرے سے مغل شہنشاہوں کا جلال ٹپکتا تھا تو اُن کی طبیعت میں پہونچے ہوئے فقیروں کی مستی موجود تھی، مولانا صاحب شہنشاہ اکبر بھی تھے اور اورنگ زیب بھی - اکبر کے برابر مُدبّر تھے اور اورنگ زیب کی طرح مذہبی، اُن کی کوٹھی کے اندر کبھی کسی نے کوئی تصویر یا مورتی نہیں دیکھی - شریعت کی پابندی وہ اتنی سختی سے کرتے تھے۔ دیس کے اندر سبھی دھرم و مذہب والے اُن کی سیاست اور دانش مندی کو مانتے تھے تو بدیسی انگریز وائسرائے اُن کی داؤں پیچ سے دُور سیدھی سیدھی باتوں سے بھی گھبراتے تھے، جب کرپس صاحب سیاسی مشن لیکر انگلستان سے آئے تھے تب ہندوستان میں کانگریس کے صدر مولانا آزاد ہی تھے - کرپس صاحب کے زبانی ساری کہانی سُن کر مولانا صاحب نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ چلو اب اس سے کیا بات کرنی ہے، ہوا بھی یہی، کرپس صاحب کو اُلٹے پاؤں لوٹنا پڑا، تدبر کے ساتھ ساتھ فقیری کا یہ عالم کہ مولانا صاحب کا مقابلہ نظام الدین اولیاء دہلیؒ، معین الدین چشتی اجمیریؒ اور خواجہ بندہ نواز گلبرگہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا صاحب کسی مجلس میں بیٹھیں، کسی جلسہ میں بولیں، چُپ چاپ کھڑے ہوں یا چلتے پھرتے ٹہلتے ہوں اُن میں اُس سنت ہی اور فقیری سے شرابور شان صاف جھلکتی تھی۔

نکھرا رنگ

مولانا آزاد میں رنگینی بھی کافی تھی، زندگی کی رنگا رنگ تصویریں ان کا آرٹ باطن میں بے رنگی ہی زیادہ تھے۔ صاف سفید رنگ ہی اُن کا من بھایا رنگ تھا، جوں جوں ڈھلتا گیا توں توں اُجلا ہی ہوتا گیا۔ مولانا صاحب نے اپنے اُس اُجلے رنگ میں کبھی کوئی دھبہ آنے نہیں دیا، یہاں تک کہ سر اور چہرے کے اُن کے کالے کالے بالوں نے بھی صاف سفیدی ہی کو پسند کر لیا۔ پہلے پہل سنہ ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں ہیئے آفس ؟ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا اور آخر میں دلی کے کنگ ایڈورڈ روڈ پر کوٹھی نمبر ۴ میں اور پارلیمنٹ کے آفس میں پہلی بار تیس برس پہلے کلکتہ میں جیسا انہیں دیکھا ٹھیک ویسا ہی دلی کی حکومت میں بھی دیکھا۔ جس محبت سے بھائی کہہ کر بولتے تھے اب بھی "وہی بھائی" کا لفظ ان کی زبان پر ہر سب کے لئے تھا، الہلال کے اُس نوجوان ایڈیٹر اور اس بوڑھے ایجوکیشن منسٹر میں کوئی فرق نہیں تھا کبھی عرصہ نے اُن کے پرانے خیالوں کو پختہ ہی کیا تھا، پختگی کی جانچ تو مصیبت میں ہوتی ہے اور بچاؤ اور آزمائش مولانا صاحب کی جوانی ساتھی تھی اور یہ ساتھ ایڈیٹری میں جو شروع ہوا تو منسٹری میں بھی نہیں چھوٹا - تب رانچی میں نظر بندی تو اب چار نمبر کنگ ایڈورڈ روڈ میں بند رہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد صاحب کو آزاد ہندوستان میں بھی آزاد سانس لینے کا موقع نہ مل سکا۔ پر مصیبت نے مولانا صاحب کو مضبوط ہی بنایا۔ ہرا پیچ نہیں بلکہ رکھا ہوا آگ میں
اُس سونے کا رنگ نکھرتا ہی گیا۔ جان نکلی پر آن جوں کی توں بنی رہی۔

نرالا ٹھاٹھ

اسٹیٹوں میں ہو یا سنٹر میں ہر منسٹر کے گھر پر سرکاری عملہ بھی ضرور رہتا ہے، ایک دو پی، اے ہوں گے ایک دو پرائیویٹ سکریٹری بھی چپراسیوں کی گھنٹی پر گھنٹی بجتی رہتی ہے اور وہ زرد سُرخ وردیوں میں منسٹر اور سکریٹری کے بیچ چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ مولانا صاحب کے پاس یہ سب ٹھاٹھ باٹ کچھ نہیں تھا، چپراسی جو ہوتے تھے اُنکی وردیاں بھی نہیں ہوتی تھیں - کوئی سرکاری پی، اے یا کلرک کچھ نہیں، مولانا صاحب کا بابا آدم ہی نرالا تھا۔ وہی بابا آدم کے زمانے کے ساتھی اجمل خاں مولانا کے سب کچھ تھے، پی اے بھی اور پرائیویٹ سکریٹری بھی اور باڈی گارڈ بھی' سچ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب مولانا کے پی، اے والا کوئی سرکاری کام دیکھتے تھے اور نہ پرائیویٹ سکریٹری بن کر مولانا کے ضمیر کی رکھوالی کرتے تھے۔ کیوں کہ مولانا صاحب کو باہری باتوں کی ضرورت نہیں تھی اور اُن کے دل کا حال تو دوسرا کوئی جانتا ہی نہ تھا۔

نالی موالی سے خالی

تلگو زبان میں ایک کہاوت ہے "تالاب میں چادر بھر پانی بھر گیا کہ ہزاروں مینڈک اپنا گھر کر جاتے ہیں"۔ منسٹر کے پاس اُس کے سگے رشتہ دار کیوں نہ جٹیں - مگر مولانا صاحب کے ارد گرد یہ ندارد، لوگ تو جانتے ہی نہیں تھے کہ اُن کے بھی کوئی تھے، یا وہ خود بھی کسی کے تھے۔ احمد نگر فورٹ میں رہتے ہوئے کلکتہ میں بیگم مولانا مریں تب کہیں پتہ لگا کہ مولانا آزاد کے بیوی بھی تھیں، وہ مرگئیں - پھر لوگ بھول ہی گئے کہ مولانا کے کچھ اور بھی لوگ ہیں۔ اُن کے مرنے کے بعد ہی سُننے میں آیا کہ کوئی بہن ہے بھوپال میں رہتی تھیں، اُن کے لڑکے لڑکیاں ہیں - اسی طرح بمبئی میں کچھ اور لوگ — لوگوں کے بھولے پن پر ترس آتا ہے جب آپ ہمارے جیسوں کے سیکڑوں رشتہ دار ہیں، کھانے کو نہ ہونے پر بھی فرضہ سر پر چڑھا کر کھا پی جاتے ہیں - مولانا صاحب کے تو دوست احباب رشتہ دار قرابت دار مغرب میں خلیفہ عمرؓ کے فتوحات کی سرحدوں سے لے کر مشرق میں ملایا سماترا تک پھیلے ہوں گے، لیکن مولانا آزاد ذاتی تعلقات کو حکومت سے بے تعلق رکھتے تھے۔

یادگار نہیں چاہیے

سنتے ہیں جب بیگم آزاد قیدِ حیات سے نجات پائیں تب مولانا کے ماننے والوں نے بیگم مولانا کی ایک یادگار قائم کرنی چاہی اور کچھ لاکھ روپے بھی اکٹھے ہو گئے، جانتے ہیں مولانا صاحب نے کیا کہا اور کیا کیا — "ممکن ہے میں نے کچھ کام دیس کا کیا ہو، لیکن میری بیوی نے کچھ نہیں کیا، وہ تو ایک پردہ نشین عورت تھیں اور کسی سماجی کام میں حصہ نہیں لیتی تھیں ایسی عورت کے نام

پبلک فنڈ سے یادگار کھڑا کرنا قطعی جائز نہیں ہے؟

چنانچہ مولانا صاحب نے اس سارے روپیہ کو جو بیگم مولانا کے نام سے جمع ہوا تھا گاندھی جی کی دھرم پتنی کستوربا کے ٹرسٹ فنڈ میں دے ڈالا۔ یہ ہے ایثار، اسے کہتے ہیں نفس کشی، ہم تو اس سے بھی آگے بڑھ کر کہیں گے۔ اگر کوئی مولانا سے کہتا کہ آپ کے نام پر یادگار قائم کریں گے تو وہ صاف انکار کر دیتے اور کہتے میں اس قابل نہیں ہوں میں نے کوئی خاص خدمت نہیں کی ہے۔

مولانا کا مسلک

مولانا آزاد کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا اتحاد، ایکتا، پریم اور پیار، ان کے دل، دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں اسی ایک مرکز کی طرف لگی ہوئی تھیں، جنگِ آزادی کے لئے اپنی ساری طاقت اسی ایک مقصد سے حاصل کرتے تھے۔ جیلوں میں جو کچھ لکھا اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا۔ ایجوکیشن منسٹر کی حیثیت سے جو بھی قائم کام کئے وہ بھی اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے، مولانا صاحب کیسے مسلمان تھے اور ان کا اسلام کیا تھا اسے سمجھنے کے لئے "ترجمان القرآن" پڑھا جائے، امن و صلح کل اُن کے اسلام کا لبِ لباب تھا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کود پڑے اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ دنیا میں جب تک سامراج شاہی کا دور دوراں رہے گا تب تک انسان انسان میں فرق بنا رہے گا، "قرآن" کا تبصرہ لکھا بنی نوعِ انسان کے درمیان بھائی چارہ بڑھانے کے لئے۔ منسٹر کی حیثیت سے ساہتیہ اکاڈمی اور کلچرل ریلیشن کے ادارے قائم کئے اسی پریم اور محبت کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے۔ لکھنؤ میں ۱۹۴۷ء میں مسلم کنونشن بلایا اسی کام کیلئے! سیاسی اقتدار جیسا مختصر مقصد اُن کی زندگی کا نصب العین تھا ہی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اور گناگوں سبھی باتوں میں وقت کے لحاظ سے کوئی خاص پہلو منظرِ عام پر زیادہ واضح ہو جاتا تھا۔

میں نہیں آؤں گا!

۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں مسلم کنونشن ہوا۔ مولانا صاحب نے خود اسے بلایا تھا، وہی اس کے صدر بھی تھے ——

ہندوستان کے کونے کونے سے سبھی خیال کے مسلمان اُس میں شریک تھے، ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ پاکستان بن چکا تھا بٹوارہ ہو چکا تھا مار کاٹ بھی شروع نہیں ہوئی تھی، طرح طرح کی افواہیں ماحول میں گونج رہی تھیں۔ عوام میں ایک عجیب پریشانی تھی، لوگ سمجھ رہے تھے کہ مولانا صاحب کوئی نیا پروگرام دیں گے اور سبھی پارٹی والے کمیونسٹ اور کمیونلسٹ —— (فرقہ پرست) اپنے اپنے پروگراموں کو آگے بڑھانے کے چکر میں تھے۔ سب کو مایوسی ہوئی کیونکہ مولانا صاحب نے صدارتی کرسی سے کہا کہ میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں، میرے پاس کوئی نیا پروگرام نہیں ہے وہی پرانی بات کہوں گا جو ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں، میل جول اور تعلیمی اور تعمیری پیغام —— مسلمانوں کو تعلیمی ترقی کرنے اور مالی حالت سدھارنے کا پیام دیا اور دیس کے سبھی لوگوں کو آپس میں میل جول محبت بڑھانے کی ہدایت کی۔ اور اس کانفرنس کے بعد ایک ہی ہفتے کے اندر ہی آل انڈیا کمیٹی کا اعلان کیا اس کے نام اور کام کا بھی یہی مقصد رکھا۔

کنونشن کے ختم پر مولانا صاحب کی قیام گاہ پر کئی لوگ ملنے گئے تھے، ایک صاحب آسام سے آئے تھے۔ نوجوان تھے۔ نیک بھی لگتے تھے۔ مولانا صاحب سے تقاضہ کیا کہ وہ ایک بار آسام تشریف لے آدیں۔ بڑی منت سماجت کی۔ لیکن مولانا صاحب نے صاف صاف کہا —— میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آپ لوگ کام کیجئے۔ ہمت کے ساتھ کام کیجئے۔ نیک نیتی سے کیجئے پر مجھ پر بھروسہ نہ رکھئے کہ ہر جگہ پہونچا کروں گا"

آپ مولانا صاحب کو غلط نہ سمجھیں اس لئے ان کی ایک اور مثال دیدوں جس کا خود اُن کی ذات سے تعلق ہے۔ ابھی پچھلے سال عام چناؤ ہوئے۔ مولانا صاحب نے اپنے کھڑے

ہونے کے لئے کوئی علاقہ خود نہیں چُنا، کئی ریاستوں کی کمیٹیوں نے خود اُن کا نام پیش کیا۔ آخر پنجاب سے نامزدگی کا فارم داخل کیا گیا۔ لیکن مولانا صاحب کی شان دیکھئے۔ چناؤ بھر میں خود اپنے علاقہ میں نہیں گئے۔ وہیں کے لوگوں نے اُن کے لئے کام کیا اور کامیاب کرا لیا۔ پھر وہ سب لوگ دلّی آئے اور مولانا صاحب کو مبارکباد دی۔ لیکن مولانا صاحب نے کسی کا کوئی خاص شکریہ ادا نہیں کیا۔ ہاں اُس کے بعد اپنے چُنے ہوئے علاقہ میں جا کر تقریریں کیں۔

آزاد صاحب ایسی جمہوریت پسند کرتے تھے۔ نہ دوسروں کے معاملے میں اور نہ اپنے ہی معاملہ میں۔ زبردستی یا دباؤ کی جمہوریت کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصلی جمہوریت بھی یہی ہے کہ خود جمہور (جنتا) اپنے آپ اپنے نمائندہ کو منتخب کرے اور وہ منتخب ہو۔

کانگریس کے سب سے چھوٹے اور سب سے بڑے پریسیڈنٹ

کانگریس کی تاریخ میں مولانا آزاد سے کم عمر پریسیڈنٹ کبھی نہیں بنا۔ نہ پہلے نہ بعد۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں مولانا صاحب کانگریس کے صدر بنے۔ ان کی عمر اس وقت پینتیس ۳۵ برس کی تھی۔ پھر سنہ ۱۹۴۰ء میں بنے تو آزادی تک بنے ہی رہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا آزاد صاحب ہی کی صدارت میں ملک آزاد بھی ہوا۔ سب سے چھوٹے اور سب سے بوڑھے مولانا نے سب سے زیادہ عرصہ تک صدارت کی۔ دونوں وقت ملک کے سامنے بڑا کٹھن مرحلہ تھا اور دونوں ہی وقت ملک نے مولانا ہی کو صدر بنایا۔ اس میں بھی مولانا کی سچی جمہوریت ہی نے کام کیا کیوں کہ زبردستی اُن کو پریسیڈنٹ بنایا گیا۔

بڑوں کی نشانی

اپنی غلطی ماننا بڑے پن کی نشانی ہے۔ مہاتما گاندھی نے بار بار اپنی غلطیاں کھُلے عام مان لی ہیں، وہ کیسی غلطی تھی اُسے بھی وہی سمجھ سکتے ہیں، اس سے بھی بڑی شاید یہ ہے کہ اُن کی کسی رائے میں کوئی چھوٹا سا آدمی بھی کچھ ترمیم کردے تو وہ فوراً مان لیتے تھے۔ ونوبا جی میں یہ بات ہے اور مولانا صاحب میں بھی یہ بات موجود تھی، مولانا صاحب کہتے۔ ہاں میرے بھائی یہ تو اور اونچی بات ہے، اونچے خیال کے ساتھ سادی زبان لانے میں مولانا صاحب کو سب سے زیادہ محنت اور مشق کرنی پڑی ہوگی دنیا جانتی ہے کہ وہ کتنی اونچی اور مشکل زبان میں بولنے اور لکھنے کے عادی تھے، مگر عوام تک اپنے اونچے خیالات کو پہونچانے کی خاطر عوام کی زبان کو اپنا کر مولانا نے اپنی عالمانہ زبان ترک کر دی۔ پھر اُن کی سادی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑیگا کہ اعلیٰ خیالی اور سادی زندگی کا وہ مجسم نمونہ تھے، سچائی کا حافظہ سے سیدھا تعلق ہوتا ہے، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو اُن کے مُنہ سے سُن کر دنگ رہ جانا پڑتا تھا اور ماننا پڑتا تھا۔ ایک سچے آدمی کا ہی حافظہ اتنا زبردست ہو سکتا ہے۔

وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے

مولانا صاحب نے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے کچھ نہیں کیا۔ اس طرح کے الزام اُن پر اُن کے ساتھیوں نے لگائے۔ مولانا صاحب ایک بے نیاز انسان، اُن پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اس سے بھی بڑی بڑی گالیاں سُنی تھیں، ہندوستان کے مسلمانوں نے اُن کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے انکار کیا، اُن کے کمرہ میں گھس کر اُن کے مُنہ پر تھوکا۔ ڈاڑھی نوچی، کیا مولانا صاحب کی پیشانی پر کبھی کوئی بل پڑا تھا! پھر پارلیمینٹ میں یا باہر کوئی کچھ اُن کے خلاف کہے تو کیا اثر لیں گے، مگر ہمیں بھی انصاف سے کام لینا چاہئے —— مولانا نے تعلیم کے لئے کچھ نہیں کیا؟ یونیورسٹی کورس کی جدید تنظیم کس نے کی؟ سکنڈری ایجوکیشن کا ڈھانچہ کس نے بدلا؟ گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کو اتنا زیادہ عملی رنگ کس نے دیا! ——

لندن میں بڑے بڑے ہندوستانی لٹریچر کو واپس لینے کیلئے کس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا! ایلورا، ایجنٹہ، سانچی وغیرہ قدیم یادگاروں کی حفاظت کس نے کی! پُرانی کلا کو کس نے جگایا! ہندوستان کی سبھی بھاشاؤں کو مساوی درجہ پر کس نے لاکر بٹھایا! بدیسی لٹریچر کو دیسی زبانوں میں اور دیسی ادبی خزانوں کو بدیسی زبانوں میں پیش کرنے کا اقدام کس نے کیا! کیا ساہتیہ اکاڈمی جیسی چیز ہندوستان میں یا اور کہیں کبھی بنی تھی؟ ہندی کو بھی اس سے بڑھ کر زیادہ فروغ کس کے راج میں ملا تھا؟ ہندوستان کے سبھی لوگ پڑھے لکھے نہیں، اس کے لئے وہ کتنے تڑپتے تھے، شاید ہی کسی کو پتہ ہو۔ کتنی باتیں وہ اور چاہتے تھے پر کر نہیں پاتے تھے، وجوہات کچھ بھی ہوں غلط فہمیاں بھی ہوں، روڑے اٹکانے والے بھی ہوں، پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے الگ الگ یا مل کر مولانا کو کم گالیاں سنائی تھیں، ہندی آندولن کوئی پُرانی بات نہیں ہے۔ لیکن دنیا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پنجاب کے سکھ اور ہندو لیڈروں نے مل کر یہ وعدہ کیا تھا کہ پنجاب کے اس بھاشائی جھگڑے میں مولانا آزاد کے فیصلہ کو دونوں پارٹیاں مان لیں گی۔ اسی سے جان لیجیئے کہ ہندی کے لئے اور دوسری سب زبانوں کے لئے اُن کو کتنی ہمدردی تھی۔ ایجوکیشن منسٹری کی ایک اور خوبی دیکھیئے۔ مولانا صاحب گوشہ نشیں بنتے ہوئے بھی۔ کوٹھی پر پی۔ اے یا سرکاری کلرک افسر نہ رکھتے ہوئے بھی، خود بھی دفتر بہت کم جاتے ہوئے جس خوبی کے ساتھ ساری منسٹری کا ایڈمنسٹریشن چلتا تھا یہ اُن ہی کا حق تھا۔

ایکتا کے اوتار اکیلے چلے

ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ، ایکتا۔اتحاد، مولانا آزاد کی زندگی کا رُوح رواں تھا — وہ ہندوستان کے سبھی لوگوں کے بیچ سبھی باتوں کی ایکتا چاہتے تھے، پوربی ایشیا اور پچھمی ایشیا کی ایکتا چاہتے تھے، یورپ اور ایشیا کی ایکتا چاہتے تھے، روس اور امریکہ کی ایکتا چاہتے تھے، ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ ساری دُنیا اُن کا گھر تھا اور سب انسان ان کے بھائی بِرادر تھے۔ اتنے بڑے پریوار کنبہ والا جب چلا تو اکیلا چلا۔ کوئی نیڈ کہیں مرے۔ دنیا کے کسی کونے میں مرے، اس کی لاش، راکھ اس کی جنم بھومی گھر پہونچتی ہے، جہاں سے جنم لیا تھا وہیں اُس کا آخری سفر ختم ہوتا ہے پر مولانا آزاد کا گھر کہاں، جنم بھومی کہاں، اگر کہیں ہے تو اُن کے گھر والے کون ہیں، لاپتہ، لاوارث اسی لئے جہاں مرے وہیں دفن کیا گیا۔ خانۂ خدا (جامع مسجد) کے سایہ میں! خدا کے سایہ میں!

خدا حافظ

مولانا آزاد بسترِ مرگ پر تین دن سے کم سانس لیتے رہے، اس عرصے میں انھوں نے کسی سے بات چیت کی نہ آنکھ کھول کر دیکھا تیسرے دن کچھ ہوش آیا، اُن کے پیارے پنڈت جواہر لال نہرو پاس بیٹھے ہوئے، لوگوں نے کہا پنڈت جی بیٹھے ہیں۔ مولانا نے پنڈت جی کو آنکھ پھیر کر دیکھا اور نہرو کو آخری "خدا حافظ" کہا۔ پھر ڈاکٹر انجکشن دینے آئے تب بھی آزاد صاحب نے اُسی مطلب کے الفاظ دُہرائے۔ مولانا نے کہا۔ مجھے "اللہ پر چھوڑ دو" قوم کے نمائندے جواہر لال کیلئے "خدا حافظ" یعنی خدا تمہاری حفاظت کرے اور اپنے لئے بھی وہی الفاظ "مجھے اللہ کی حفاظت میں چھوڑ دو، مسلمان ہر کسی کام کے شروع میں 'اللہ' کا نام لیتے ہیں "بسم اللہ" مولانا کا آخری بول بھی 'اللہ' ہی تھا۔ ہندوؤں کے حساب سے آخری سانس میں جو لفظ زبان پر ہوتا ہے اُسی میں وہ مل جاتا ہے۔ مولانا صاحب جواہر لال نہرو کے ساتھ ہم سب کو اللہ کے حوالے کر کے آپ خود اللہ سے جا ملے۔

روحانی کشش

جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا بھی۔ جن کے ساتھ وہ رہا مدفن مسان تک ساتھ چلتے ہیں، کسی کے ساتھ کم کسی کے ساتھ زیادہ۔ مہاتما گاندھی کی ارتھی چلی تو لاکھوں آدمی ساتھ چلے، گاندھی اور مولانا کے بیچ بہت سی ارتھیاں اور بھی اٹھیں، لیکن آج ایسا لگتا تھا کہ گاندھی کے بعد آزاد ہی مرے ہیں، وقت نہیں، اعلان نہیں، انتظام نہیں۔ پھر بھی مولانا کی میت میں لاکھوں کی بھیڑ۔ پانچ لاکھ کا اندازہ اخبارں میں آیا ہے۔ مگر اس سے بہت زیادہ تھی۔ دلّی دروازہ سے جامع مسجد تک سڑک کے دونوں طرف اور چھتوں پر لوگ گھنٹوں بیٹھے کھڑے آزاد صاحب کے آخری درشن کے انتظار کر رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر لوگ جس خاموشی سے کھڑے تھے ایسا لگتا تھا گویا آج ہر گھر سوگوار ہے — بھیڑ میں مائیں اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بیٹھی تھیں، انہیں ذرا بھی فکر نہ تھی کہ اُن کا ننھا کہیں بھیڑ میں کچل نہ جائے۔ آخر وہ کون سی طاقت تھی جو اُن میں وہ طاقت بھر کر اُنھیں بے خود کر رہی تھی۔ کسی کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اپنے آپ مولانا کا جنازہ اس طرح لاکھوں آنکھوں کی پلکوں پر سے ہو کر گزرے گا یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی روحانی کشش تھی کہ سب لوگ دوست دشمن، عورت مرد۔ بچے بوڑھے پیچھے پیچھے اپنے مولانا کے آخری درشن کے لئے چلے آرہے تھے، ایک پاک رُوح نے آج سبھی رُوحوں کو جگا دیا تھا۔

"مجھے ۱۹۲۰ء سے قومی کام میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اسلام کے بارے میں اُن سے زیادہ معلومات کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں، اُن کی دیش بھگتی اُسی طرح پختہ اور راسخ ہے۔ جس طرح ان کا اسلام میں عقیدہ۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ ترین سردار ہیں۔ اور ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ کرنیوالے ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے"

—— مہاتما گاندھی

بصائر

ایک پکار جو کانوں میں گونجتی رہے گی

انور صابری

اگر ہمارے دل و دماغ میں بصیرت کی روشنی ہے تو تجربۂ ماضی اور تجزیۂ حال کے جھروکوں سے ہم مستقبل کے نتائج کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں خدا کے فضل و کرم نے ہمیں اس روشنی سے بہرہ مند فرمایا ہے اور ہم عہدِ گزشتہ کے صُغریٰ کو کو الفِ امروز کے کبریٰ سے ملا کر مستقبل کا شاندار "نتیجۂ فکر و عمل" مرتب کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک، ۳ سال کی مدت ہم نے اپنی متعینہ منزل کی راہوں میں بسر کی اور سفر کے درمیان ہر نئے موڑ پر جن حوادث و مشکلات نے ہماری ہمتوں کو آزما کر حوصلہ افزائی کی وہ بھی اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

ہمیں ان حوادثات و مشکلات کو بھولنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اُن سے سبق لے کر جس خلدِ حیات کی طلب میں اب تک سرگرداں تھے اُس کی حفاظت و بقا کی اہم ذمہ داریوں کو اپنانا چاہیئے۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ جو "حوادث و مشکلات" ہمیں پیش آئی تھیں وہ آئندہ نسلوں کو نہ پیش آئیں۔

وطن کی جنتِ آزاد کا ہر گوشہ چند مخصوص اجارہ داروں کے لئے نہیں بلکہ اُس پر اُن سب کا حق ہے جو اُس کی گود میں زندگی کا سانس لیتے ہیں۔ انفرادی منفعت کا تصور ہمارے ذہنوں میں کبھی نہیں آیا۔ ہماری منزلِ سفر اجتماعی مفاد کے سوا کچھ بھی نہ تھی اس لئے اب جب ہم منزل پر پہونچ چکے ہیں "ذاتیات" کی نامحمود خراشوں سے سینۂ فکر و نظر کو مجروح نہیں کرنا چاہتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض زمانہ ناشناس طبیعتیں "جمہوریت" کی بنیادی قدروں سے قصداً تغافل و گریز روا رکھ رہی ہیں، ان شخصیتوں کے تعین اسما سے کوئی فائدہ نہیں۔ منتفرینِ کائنات اُن کی نقاب کشائی کو ضروری نہیں سمجھتے وہ ہمارے جانے اور پہچانے ہوئے پرانے دوست ہیں۔

ہمیں اُن کی ناسمجھیوں پر تعجب ہے، لیکن اُن سے جدائی گوارا نہیں ممکن ہے ہماری نیتوں کا خلوص انہیں سیدھے راستہ پر لگا دے اور وہ قدیم و جدید تہذیبوں کے پُر از کشاکش ماحول سے خود ہی کنارہ کش ہو جائیں۔

قومیں صرف زبانوں، تہذیبوں اور سماجی اصول کے استحکامات سے زندہ نہیں رہتیں، اُن کا ہمہ گیر اور جامع آدمیت کردار اُنہیں زندگی عطا کرتا ہے زبانوں، تہذیبوں اور سماجی اصولوں کا سوال ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

یاد رکھیے تنگ دلی اور اخلاق کی تنگ دامانی ایسے امراض ہیں جن کا علاج ممکنات کی حدود کے اندر کوئی نہیں۔

ہم نے جب اپنی جدوجہد، ایثار پسندی اور قربانی کے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرایا ہے اور اتفاقاً زمامِ اختیار بھی ہمارے ہی ہاتھوں میں آگئی ہے تو "وسعتِ قلب" کی توقع ہم سے مزید کی جائے گی۔

انسانوں کے مابین "مذہبی اکثریت و اقلیت" کے عنوان پر سوچنا فطرت کے منشائے تخلیق کے بالکل منافی ہے اور یہ جرم بغاوت فطرت کبھی معاف نہیں کرتی۔

حکمرانوں کے حوصلوں کی پستی عوام کے ضمیر دل کو پستی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

ہم نے ابھی ابھی جادوگرانِ فرنگ کی تراشی ہوئی تجویز "تقسیم" کے آغاز و انجام اور اُس کے خونیں نتائج کا مشاہدہ کیا ہے، جن غیر مآل اندیشوں نے اسی تحریک کو ہوا دی وہ پست حوصلگی اور تنگ دلی و تنگ نظری کا شکار تھے، جن عوام کو وہ ساتھ لے کر چلے اُن میں اندھی جذباتی تقلید نے شعور و عقل سے بے گانگی کا غالب عنصر پیدا کر دیا اور جب انہیں کھُل کھیلنے کا موقع ملا تو عقل و دانش اُن کی بہیمانہ حرکتوں پر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

ہماری فراست ہمیں بتاتی ہے پاگلوں کے انبوہِ کثیر کو اُبھار کر دوسروں کی عزت و آبرو اور جان و مال پر حملہ کرانے والے کبھی کبھی خود بھی انھیں پاگلوں کا نشانۂ دیوانگی بن جاتے ہیں اس لئے اُس دن کا انتظار بھی کرنا پڑے گا جب عمل و ردِ عمل کا یہ عبرتناک پہلو ہماری صداقتِ فراست کی گواہیاں فراہم کرے گا۔

ایک طرف ہمیں "بصائر و عبر" کے ان قدرتی مراحل سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے اور دوسری جانب خود اپنے اعضا و جوارح کے انتشار و افتراق کے خطرات کو بھی نظر میں رکھنا پڑے گا۔

سعی و کوشش کی مصروف زندگی آرام و آسائش کے دنوں میں کسی حد تک غرض مند ہو جاتی ہے۔ اور ساتھیوں کی بلندیاں نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہیں۔ اس مقام پر دلوں میں رفتہ رفتہ حسد جگہ پاتا ہے اور دھیرے دھیرے یہ حسد بڑھ کر بغض و عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ساتھی "صفِ حکمراں" کا جزو نہیں بن سکتا۔ باہمی رنجشوں کا دروازہ کھلتے ہی شکوہ و شکایت کا انداز جماعتی تنظیم کے لئے مہلک طریقہ استعمال کرنے لگتا ہے اور "ناراض عوام" کی بھیڑ کو ساتھ لیکر اُس جگہ کھڑا ہو جاتا ہے جہاں اب سے چند دن پیشتر حریفوں کی قیام گاہ تھی۔

ہماری رائے اس بارے میں صاف اور واضح طور پر یہ ہے کہ ہر مرحلۂ انتخاب پر پُرانوں کے عوض نئے مگر آزمودہ کار دوستوں کو خدمت کا موقع دیتے رہنے سے نفاق و افتراق کا خدشہ اگر مٹے گا نہیں تو کم سے کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔

اس وسیع ملک کو جسے ہندوستان کہتے ہیں، اگر نئی بنیادوں پر جغرافیائی حدود کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے تو زبانوں، تہذیبوں اور سماجی اصولوں کی حمایت کا شور و شر بلاشبہ ختم ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ دل و دماغ ذاتی منفعت، عصبیت اور فسادآلائشوں سے پاک ہوں، جب لسانی تہذیبی اور سماجی منطقے الگ الگ ہو کر ایک مرکزی نظام کو قبول کریںگے تو ان میں قدرتی رابطہ لاریب اُبھرے گا، اور ملک کی سالمیت بھی خطرات سے محفوظ ہو جائے گی۔ اور زبان، تہذیب اور سماج کے نام پر جھگڑوں کا سدباب بھی ہو جائے گا۔

ہمسایہ ملکوں سے محبت کا برتاؤ کسی آئین سیاست میں بُرا نہیں، پڑوسی کو آفتوں سے بچانا اپنے گھر کی حفاظت ہی کا ایک رُخ ہے۔ لیکن "عداوت و جنگ" کے عنوان پر "تقسیمِ املاک" کا افسانہ اپنے آغوش میں توہمات کے بے شمار پہلو چھپائے

رہتا ہے ہمیں ہر لحظہ فکر یہ سوچتے رہنا چاہئے کہ سطحی الفاظِ محبت کے پس منظر میں ایسی گہری سرنگیں نہ تعمیر کی جارہی ہوں جو ہمارے محلاتِ نشاط کو برباد کرسکیں۔

دنیا کو ہم نوا بنانے کے لئے داخلی امن اور بیرونی توجہ دونوں ضروری اجزا ہیں، ان سے گریزاں رہنے کی عادت خطرناک ہی نہیں مہلک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ساتھی ہم سے مطمئن رہیں، عوام بددل نہ ہوں ـــ اور ہمسایوں کو ہماری نیت مشتبہ نہ معلوم ہو۔ تسخیرِ کائنات کا خیال ان عناصرِ ثلاثہ کی متوازن شکل کا محتاج ہے۔

ہمارا ملک ازل سے محبت، اخوت، انسانیت اور زندگی کے ترقی پذیر خلوص کا گہوارہ ہے اس نئے اس ملک کو بامِ عروج تک پہونچانے کے لئے بھی یہی نعمتیں ہمارا ساتھ دیں گی۔

محدودے چند افراد کی لامحدود آمدنیاں بُری نہیں بشرطیکہ اُن کا مصرف غریب عوام کی بھوک سے متصادم نہ ہو۔

اوقاف کے غیر محتاط متولیوں کی نگرانی اور اُن کے عیش پرستانہ اخراجات کی نگہداشت بھی ملک کے اندرونی امن کو بحال رکھنے میں مدد دینے والا جزو ہے۔ ہمارے ملک کی عقیدت کیشی نے ایسے لاکھوں اوقاف کو تخلیق کیا ہے جن سے ہزاروں مفید خلائق امور انجام پاسکتے ہیں۔ ہمیں کبھی نہ کبھی ایسا کرنا ہی پڑے گا۔

یاد رکھئے ہم وہ مضبوط "اکائی" ہیں جسے بے تعلق دہائیوں میں تبدیل کرنے کی لغزش اپنی بربادیوں کا محضرنامہ خود تیار کرنے کے مرادف ہے۔

ایسی اُلجھنوں میں افکار کو مبتلا کرلینا عقل و دانش سے عداوت مول لینا ہے۔ ان سے بچنے کی ہر کوشش زندگی افروز ہوگی۔

ہم نے اعتماد کی جنسِ گرانمایہ کو تدبر کے پیمانے سے تولا ہے اور اس بیش بہا سرمایہ کو کسی قیمت پر برباد نہ ہونے دیں گے۔

جس وقت اعتماد مشکوک ہوجائے اُس وقت آپ کو یہ سمجھنے کی پوری آزادی ہوگی کہ مستقبل نے ہمارا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے، اور وقت کا منتقمانہ سلوک ہمیں دو ایسے حصوں میں بانٹ دے گا جو محض لعنتوں کی ہوائے تند سے مستعار لئے گئے ہوں۔

کس قدر بھیانک ہوگا یہ خواب اور کتنی مہیب ہوگی اس خواب کی روح فرسا تعبیر! مخلص دوستوں کو باہمی تصادم کی راہ پر نہیں لایا جاسکتا جبتک دوستی کا یہ خلوص باقی ہے فتح مندی کی سرافرازی ہمیں کو حاصل رہے گی۔

خدا نہ کرے کہ عہدوں کی خواہش مناصب کی آرزو اور سیم وزر کی تمنائیں ہمارے رشتۂ خلوص کو توڑ سکیں۔ یہ حادثہ رونما ہوگا تو نہ صرف ہمارا ذاتی وقار بلکہ پورے ملک کی عظمت تباہ ہوجائے گی۔

انسانی سوسائٹی میں مذہب کا مقام

الہلال کا ایک آرٹیکل

"انسان ذہن و جسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کرلے لیکن رُوح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں کرسکتا اگر اُس کا اعتقاد اور عمل رُوحانی ہدایت کی روشنی سے محروم ہو، انسان کے لئے یہ سہل ہے کہ تمام دنیا فتح کرلے۔

سکندر نے دنیا کی تمام سلطنتیں تہ و بالا کر ڈالی تھیں، انسان کے لئے یہ بھی مشکل نہیں کہ ذہن و فکر کی ایسی بلندیوں تک پہونچ جائے جہاں تک دوسروں کے قدم نہ پہونچ سکے ہوں۔ ارسطو، اقلیدس۔ سولن اور سنیکا جیسے فاتحین علم کی فتح مندیاں لازوال ہوچکی ہیں اور دنیا منطق ریاضی، قانون اور فلسفۂ اخلاق میں آج تک اُن کی پس زدہ ہے ـــ انسان کی اولوالعزمی ان بلندیوں پر بھی نہیں رکتی۔ کچھ مشکل نہیں اگر وہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے۔ سمندر کی موجوں کی ہنسی اُڑائے۔ پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے، مگر ہاں یہ مشکل ہے بہت ہی مشکل۔ کہ وہ اخلاق اور رُوحانی پاکیزگی کی راہ میں اپنی کسی ایک خواہشِ نفس کا بھی مقابلہ کرسکے۔ اس کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دنیا کی ساری رکاوٹوں کا تنِ تنہا مقابلہ کرسکتی ہے۔ ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی۔

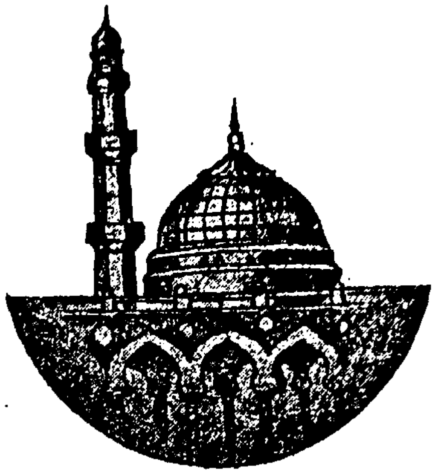
سکندر تمام دنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا۔ لیکن بابل کی ایک عورت جب اس کے سامنے آئی تو اپنی خواہشِ نفس کے اضطراب سے بے بس ہوکر گر گیا۔ سنیکا نے تمام نوعِ انسانی کو اخلاق اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی۔ لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا۔ ارسطو کے دامنِ علم کے دھبے بھی دنیا گن چکی ہے فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے جو الہامی ہدایت کی کسی بالاتر قوت کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ انسان اپنے ذہن و جسم کی قوتوں سے سب کچھ کرسکتا ہے لیکن تکلف اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس عملی صداقت کی کچھ بھی ضرورت ہے جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ناگزیر ہے کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلندتر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو ـــ مذہب اور الہام اسی ذریعہ ہدایت کا نام ہے۔" ـــــــــ (ابوالکلام آزادؔ)

آزاد ہندوستان کا جھنڈا

"آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے آزاد ہندوستان کا جھنڈا پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دلآزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

"ابوالکلام آزادؔ"

نشانِ راہ



"دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی تاج و تخت یا ایوان و محل سے نہیں اُٹھتی بلکہ ہمیشہ اُس کا سرچشمہ ویران جنگلوں۔ پھونس کے جھونپڑوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے اور یہ بھی اُس شاہد عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور اُفتادگی ہی کو محبوب رکھتا ہے



فضائے عشق پہ تحریر کی اُس نے نوا ایسی
میسّر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنّابی

اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے، زخمی دلوں کو اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خونچکانی اور لاشوں کے اضطراب میں۔ اور پھر اپنے حُسن و جمال کی جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں۔ شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں کو۔ پھر اگر وہ نہیں ہے تو آخر کون ہے جس کا ہاتھ گلیم فقر و مسکنی سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج اُلٹ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ کس کی تماشائی ہے کہ چند بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے اور وہ لاکھوں دلوں کو دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر اپنے آگے سربسجود کرا لیتے ہیں!"

مولانا آزادؒ

☆ شادی کی تہنیت مولانا آزادؒ کے قلم سے
☆ انسانی معاشرہ میں ازدواجی موقف
☆ اسلامی نقطہ نظر پر ایک فاضلانہ نگارش!

ذیل میں حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک غیر مطبوعہ اور بصیرت افروز مکتوب شائع کیا جا رہا ہے جو آج سے برسوں پہلے حضرت مرحوم نے مولانا محمد اکبر صاحب باقوی (پہنام ٹب۔ مدراس) کی تقریب زواج پر ارسال فرمایا تھا۔

اس مختصر مکتوب میں شادی کی تہنیت کے ساتھ ساتھ اسلامی نقطہ نظر سے شادی کے فلسفہ پر جس مرشدانہ اور فاضلانہ انداز میں ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے، بلا مبالغہ وہ مولانا آزادؒ ہی کا حصہ ہے۔ • ادارہ •

۵ $\frac{۲۲}{۱}$ ۶ $\frac{۱۳}{A}$ بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ۔

عزیزی تمہارا خط پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی تعلیم کی تکمیل کے بعد اب تمہیں زندگی کی وہ منزل پیش آگئی ہے جہاں سے انسان کی شخصی زندگی کی ذمہ داریوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے میرے لئے ممکن نہیں کہ اس موقع پر شریک ہو سکوں لیکن یقین کرو کہ میرے دل کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں میں اپنی جگہ اپنی دعائیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں!

زندہ باشی و کامراں باشی!

اللہ تعالیٰ اس تقریب کو برکت و سعادت کا موجب بنائے اور تمہاری یہ نئی زندگی ہر اعتبار سے کامیاب ہو!

میں اس موقع پر تمہیں یاد دلاؤں گا کہ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے تمہیں چاہیئے.... ازدواجی زندگی یعنی شادی کی زندگی کا وہ تصور اپنے سامنے رکھو جو قرآن حکیم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذالک لآیاتٍ لقوم یتفکرون۔ خدا کی حکمت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے۔ یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد۔ لیکن خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ تمہاری زندگی میں تین چیزیں پیدا ہو جائیں جن تین چیزوں کے بغیر تم ایک مطمئن اور خوش حال زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ سکون۔ مودت۔ رحمت۔ لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

مودت سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے اس لئے رشتہ جوڑتی ہے تاکہ اُن کی ملی جلی زندگی کی ساری تاریکیاں محبت کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

لیکن محبت کا یہ رشتہ پائیدار نہیں ہو سکتا اگر رحمت کا سورج ہمارے دلوں پر نہ چمکے رحمت سے مقصود یہ ہے کہ شوہر اور بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دیئے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے لئے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دیدیتا ہے۔ ایک خود غرض محبت کرنیوالا صرف اپنی ہی ہستی کو اپنے سامنے رکھتا ہے لیکن رحیمانہ محبت کرنے والا اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور دوسرے کی ہستی کو مقدم رکھتا ہے۔ رحمت ہمیشہ اس سے تقاضہ کرے گی کہ دوسرے کی کمزوریوں پر رحم کرے، غلطیاں خطائیں بخش دے۔ غصہ، غضب، اور انتقام کی پرچھائیں بھی اپنے دل پر نہ پڑنے دے۔

میری دلی آرزو ہے کہ خدا تم دونوں کو توفیق دے کہ اپنی ازدواجی زندگی کو اوّل دن سے اسی رنگ میں شروع کرو جس رنگ میں قرآن کی مقدس تعلیم نے اس معاملہ کو دیکھا ہے۔ اور نوعِ انسان کے آگے رکھا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

۱۳۷۷ھ

ثمر پھتاروی علی گڑھ

ہند کا فیروز بخت
ایشیا کا دل دماغ

حریت کا پیشوا
ملک کا روشن چراغ

قصرِ دانش کا نشان
شانِ رفتہ کا سراغ

پیکرِ عزم و یقیں
علم و ارشاد کا باغ

معرکہ آرا مدبر
۷۹۱ +
الہلال والبلاغ
۱۱۶۷
۱۹۵۸ء

صفحات مجيدة

من

حياة امام الهند ابي الكلام آزاد

للاستاذ محي الدين الالوائي الازهري

مولانا ابو الكلام آزاد كان عالماً متفنناً لا يبارى وفيلسوفاً حكيماً لا ينازع ووطنياً مجاهداً لا يتزعزع وسياسياً محنكاً لا يضاهى وكان متبحراً في العلوم الاسلامية ومتمكناً في الآداب الحديثة ومطلعاً على التطورات العالمية -

شاب يخترق طريقه الى ميدان السياسة والعلم ولم يتجاوز سنه اربعة عشر عاماً وشاب يبهر العقول بآرائه ونظرياته ويوقظ القلوب بكتاباته وخطبه ويندهش اكابر الادباء امام قوة يراعه ويتحير مشاهير العلماء امام عمق علمه ونبوغ فهمه ويتقهقر فحول الخطباء امام قوة بيانه وجرأة خطابه كل هذا وذاك يصدر من شخص لم يكمل دراسته في المعاهد العلمية ولم يحصل على شهادات جامعية ولم يتخصص لدى استاذ او معلم اللهم الا انه يولد في بيت علم وفضل ويترعرع في حضن والد عالم متدين ولكن هذا اما ذا يغني من العلوم الحديثة والفلسفة الجديدة والآداب المعاصرة ؟ ولكن الله سبحانه تعالى اعطاه موهبة علمية كبيرة وقوة حافظة عظيمة مع انه استخدم مواهبه الانسانية كلها استخداماً قويماً . وانتهز الفرص التي أتيحت امامه انتهازاً كاملاً ولم يضيع اوقاته النفيسة في سفاسف الامور ولم يدخل في مجادلات ومناقشات لا طائلة تحتها كما كان يفعل معاصروه من العلماء

ان الميزة التي يمتاز بها ابو الكلام آزاد عن غيره من العلماء والادباء والمفكرين والساسة سواء من لاحقيه او سابقيه هي انه قد شحذ افكاره اولاً ووسع آفاقه ثانياً وعين اهدافه اخيراً - وهكذا دخل الميدان بخطى ثابتة وبقلب عازم وبعقل صارم لا تزعزعه اهوال الميادين وشدائد الامور - ولا تخوفه بطشة الاعداء او قوة المخاصمين ولا يخضع امام الجبابرة والطواغيت وقد اجتمع فيه جميع الصفات اللازمة لعالم قدير وكل المميزات المطلوبة لمصلح امين لانه لم يكن يسكت على ما كان عليه المسلمون من ذلة وهوان وتأخر وانحطاط ولم يكن يقرهم على ما كانوا عليه من جهل متوارث وتقليد اعمى ودعاهم اولاً الى فهم تعاليم القرآن كما حقه والى تفهم الارشادات النبوية بدون تخريف ولا تحريف واستخدم قلمه ولسانه في سبيل اصلاح الامة المسلمة من الخرافات والخزعبلات والبدع والضلالات حتى تكون امة حية ناهضة تتمشى مع مسايرة الزمن وتصبح قدوة حسنة [illegible] التعاليم القرآنية والسيرة المحمدية . وقال آزاد في احدى مقالاته " ان السبب الاصلي لما اصبح فيه المسلمون من ذلة وهوان وتأخر وانحطاط هو الغفلة عن تعاليم القرآن الحنيف وجهل ما فيه من الاصول والمبادئ والشرائع والقوانين في المسائل الاقتصادية والسياسية والعلمية والمدنية حيث جعل فيه خالق البشر والقوى كل مقومات الحياة الكريمة الحرة والعزة في الدارين ولكن الناس جعلوه كتاباً تؤخذ منه مسائل الصوم والصلوة فقط ويقرء في المناسبات مثل البيناء بدون ان يتفهموا معناه او يدرك الغرض الذي انزل لاجله وقد تنبأ القرآن بهذه الحالة التي وقع فيها الان اتباعه وحاملوه بقوله:-
وقال الرسول يا رب ان قومي اتخذوا هذا القرآن مهجوراً "

ويقول القرآن ايضاً :- لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم آذان لا يسمعون بها ولهم اعين لا يبصرون بها اولئك كالانعام بل هم اضل

ولم يسكت ابو الكلام ايضاً على ما كان عليه مسلمو الهند خاصة من تأخر سياسي وحياة بعيدة عن الحركات الوطنية والتطورات السياسية فدعاهم الى متابعة الكفاح في سبيل تحرير الوطن من الحكم الاجنبي واخذ يدعو الناس متأثراً بروح الاسلام الى ترك موالات اعدائه ونزل الى ميدان الجهاد الوطني ضد الانكليز . واتفق في ذلك مع اكبر حزب سياسي في الهند اي حزب المؤتمر الوطني ومشاهير قادة التحرير الاخرين فسجن في هذا السبيل وحوكم امام المحاكم الانكليزية ولم يستطع هذا او ذاك ان يغيره من خطته ويؤخره عن تقدمه في ميدان النضال - وترأس حزب المؤتمر عدة مرات وكان يتزعم الحركة السياسية قبل استقلال الهند وبعده ولكنه لم يتخل عن اعماله العلمية والدينية والفلسفية بين هذه الصفحات السياسية فكتب تفسيره المشهور للقرآن بالاردية " ترجمان القرآن " وغيره من الاعمال العلمية القيمة اثناء جهاده الوطني واما مجلاته العديدة " لسان الصدق " و" الهلال " و" البلاغ " فكلها كانت دعوة اصلاحية حرة - واخذ بمجامع القلوب

وحرّك العقول الميتة ولم يكن التقليد الاعمى يعرف طريقا الى متاهاتها ومواضيعها وهو يغربل مسأله فمسألة ومشكلة فمشكلة في غرباله الخاص وكانت من المواضيع التي كان يعالجها في كتاباته وكتبه الاصلاح الديني والسياسي والادبي والعلمي في اسلوب عجيب ونسق جزل. واقول ان مولانا ابا الكلام آزاد لم يكن الا شخصا عاديا بل وكان يشق طريقه الى الامام بقلب واع وعقل متحرك ولم يكن الا عالما عاديا بل وكان لا يسكت على الجمود والخمول ولا يعترف باغلاق باب الاجتهاد والتطور وجعل هدفه الاصلاح وتنوير العقول مضحيا في هذا السبيل بكل غال ورخيص واعتقد ان السبب الاول لوصوله الى هذه القمة في الميادين الدينية والعلمية والسياسية هو عمق مطالعته واستقلال رأيه. "وان في ذالك لعبرة لاولى الابصار" والعلم لا ينفع وحده الا اذا صحبه استقلال الرأى و استقلال الرأى لا يغنى عن شئ الا اذا كان مصحوبا بقلب حازم وارادة قوية. ولم يسلم آزاد ايضا من المصاعب والمتاعب والمعارضة والمقاومة التي يواجهها كل مصلح او ناصح امين في جميع الادوار ولكنه قام في وجه هذه التيارات بصبر وعزم حيث لا يخاف لومة لائم.

ومن الاعمال الخالدة له التي تجعل ابا الكلام من ابناء الهند الخالدين خدمته الجليلة في سبيل الآداب الاردية والفارسية والعربية في القارة الهندية انه فتح بابا جديدا او بدأ عصرا ذهبيا في تاريخ اللغة الاردية حيث انه تبرع بذخائر قيمة الى مكتبة الادب الاردى الحديث وانشأ اسلوبا جديدا في كتاباته حيث لم يسبق له مثيل. وان هذه اللغة قد ارتفعت من عصره الى قمة عالية من البلاغة والفصاحة وارتفع شأنها في اعين الاصدقاء والاعداء على حد سواء. ولا غرو في ذلك لان ابا الكلام جعل اللغة الاردية لغة علم وفلسفة الى جانب كونها لغة ادب وسياسة وتفسيره للقرآن وخطبه المشهورة ومولفاته النادرة واعداد مجلاته العديدة كل هذا قد اعطى حيوية وخلود اللغة الاردية حيث يبقى اسمه حيا ما دام فرد من ناطقى هذه اللغة حيا يرزق على وجه الارض وقام ايضا بخدمات تذكر في سبيل الفارسية والعربية وكان متضلعا في هاتين اللغتين. فمن خدماته في سبيل الاحياء والنهوض بالادب العربي في الهند الخطوات التي اتخذها او وعزها لانشاء المعاهد العربية والمدارس الاسلامية في طول البلاد وعرضها وسياسته الحكيمة في توطيد العلاقات الثقافية بين الهند والعالم العربي وتشجيعه على تبادل الطلبة بينها وبين البلدان العربية واخيرا المجلس الهندى للروابط الثقافية الذى اسسه وشيد بنيانه في ايام حياته ومجلة "ثقافة الهند" التي تصدر بالعربية تحت اشراف هذا المجلس لهي خطوة موفقة في سبيل توطيد اركان اللغة العربية في القارة الهندية. واما سياسته التي كان يتبعها في مضمار التقريب بين الامة الهندية والامة العربية والشرقية فهي ايضا خطوة اخرى تؤيد في هذا الميدان وان التشجيع الذى نلته منه ايام دراستي في الجامعة الازهرية تحت اشراف مجلس الهند المذكور و رعاية مولانا آزاد كان دليلا ماديا على شغفه العلمي والادبي ولمست هذا بنفسي من اتصالاتي به ومراسلاتي معه في مناسبات عديدة حول اللغة العربية وآدابها.

وان ابا الكلام الذى ولد في مكة عند بيت الله الحرام في الحادى عشر من شهر نوفمبر عام ١٨٨٨ء الموافق لذى الحجة عام ١٣٠٥ من الهجرة النبوية بمنزل اسرته المتصل بباب السلام للحرم الشريف نشأ في أسرة عربية خالصة في واد غير ذى زرع. وسمي محى الدين احمد، وكنيته ابو الكلام ولقبه آزاد. ولقب شرفه امام الهند. و لبى الى نداء ربه وانتقل الى جوار رحمته في الساعة الثانية والدقيقة الخامسة عشر صباح يوم السبت الموافق للثاني والعشرين من شهر فبراير عام ١٩٥٨ء. ودفن في الميدان الفسيح الواقع بين جامع دلهي الشهير وبين القلعة الحمراء التاريخية في الساعة الثالثة والدقيقة العشرين بعد ظهر السبت المذكور اما الزبد فيذهب جفاء واما ما ينفع الناس فيمكث في الارض رحمه الله رحمة واسعة وتغمده بغفرانه.

في تاريخ وفاة ترجمان القرآن امام الهند

[illegible]

بقلم مولانا عبد الرشيد الارشد الرياضي الملقب بالاديب الفاضل

احب الناس كالانسان في عين
كاخيار مضى في الحق مقبولا

حيين القوم مغناهم وما واهم | بموت الحر قوم دام متبولا
معارفه كابراق منارة | على فضل وجود كان مجبولا
تصوت من وراء الغيب قدامي | محور العين في الفردوس مشغولا

١٣٧٧ھ

اُن کی جُدائی

تاثرات سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند

مولانا ابوالکلام آزاد صرف علوم مذہبی کے متبحر اور ایک جلیل القدر بلند پایہ عالم ہی نہ تھے بلکہ میدان سیاست کے بھی وہ ایک بہترین شہسوار تھے، امور سیاست میں وہ نہایت مدبر اور انتہائی دوراندیش مفکر اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ اُن کو تمام ایشیا کی سیاست سے بڑی گہری دلچسپی تھی اُن کو قدرت نے بڑی بصیرت اور فہم صحیح عطا فرمایا تھا۔

ہندوستان کی حکومت میں اُن کا بڑا پایہ تھا وہ اس حکومت کے وزیر تعلیم ہی نہ تھے بلکہ وزیر اعظم ہند کے دست راست اور اُن کے بازوؤں کی قوت تھے اُن کے مفید مشورے پوری حکومت کے لئے رہنمائی کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے معاملات کو اپنے خداداد تدبر اور ہوشمندی و دانشوری سے سُلجھا دیا کرتے تھے وہ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ ادب میں ایسے بے مثل ادیب تھے کہ اُن کی تقریر و تحریر کا جواب ان کی زندگی میں کسی دوسرے انسان سے بن نہ آسکا۔ اُن کے کلام میں ایسی جدید اور انوکھی بندشیں ہوتی تھیں جو صرف ان ہی کا حصہ تھا اور قدرت نے اس انوکھے طرز تعبیر کو اُن کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ بہرحال وہ ادب، سیاست اور مذہب کے بہترین اور بے مثل شناور تھے، اب دنیا اس شہسوار علم و فن کو مدتوں روتی رہے گی اور اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہ پا سکے گی۔ میدان جنگ میں اُن کے جنگی تھپیڑوں نے لارڈ ویول اور لارڈ اروِن کو عاجز اور درماندہ کر دیا تھا

وہ ان تمام علمی ادبی اور سیاسی خوبیوں کے ساتھ انتہائی خوش طبع، اور انتہائی خوددار تھے۔ خوش طبعی بھی اُن کی ادب اور جدید بندشوں سے لبریز ہوتی تھی وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں کبھی جھجکتے نہ تھے۔

وہ ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں صدر مقرر ہوئے جس میں اُنھوں نے ہندوستان کے علماء کو ایک بصیرت افروز اور فصیح و بلیغ خطبہ صدارت دیا۔ میں اس زمانہ میں ایک سال کی قید کاٹ رہا تھا اور میانوالی جیل میں اسیر تھا میرے اُن کے تقریباً چالیس یا پنتالیس سال سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ سب سے پہلی ملاقات میری اُن سے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دفتر نظام المشائخ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں احقر ملا واحدی صاحب کے مکان پر تھا۔

خلافت کے دور میں ایک جلسے کی جب وہ صدارت فرما رہے تھے میں نے تقریر کی تھی یہ جلسہ شاید دہلی میں ہوا تھا۔ کلکتہ میں کئی مرتبہ اُن کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہوا اُن پر مختلف دور گذرتے رہے اور میں نے اُن کو ہر حال میں صابر اور رضا کر پایا۔

اُن کا ذوق ادب اور اُن کی خوش طبعی کسی حال میں فرق محسوس نہیں ہونے دیتی تھی آخری ملاقات اُن کی وفات سے چھ روز پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ اردو کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ اُس دن یہ خیال بھی نہ تھا کہ آج سے ساتویں دن اُن کی میت اسی میدان میں ٹھیک تقریر کے وقت دفن ہوگی۔

اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور مقام صدق اور جوار رحمت سے اُن کو نوازے۔ (آمین)

تاثرات

مختار اعظمی

ابوالکلام پیکرِ جمالِ ملت بنی
ابوالکلام مرکزِ یقین وعلم آگہی
ابوالکلام مظہرِ کمال وعظمت وخودی
ابوالکلام زندگی
ابوالکلام روشنی

ابوالکلام عظمتِ حرم کے پاسباں رہے
ابوالکلام مصحفِ نبی کے ترجماں رہے
ابوالکلام اسوۂ حسین کے نشاں رہے
سلف کے قدرداں رہے
امیرِ کارواں رہے

ابوالکلام علم کے ادب کے ایک باغ تھے
ابوالکلام بزمِ دیں کے زرنگار ایاغ تھے
ابوالکلام شانِ الہلال و البلاغ تھے
وہ قوم کے دماغ تھے
وہ ملک کے چراغ تھے

ابوالکلام گلستانِ ہند کی بہار تھے
ابوالکلام انقلاب و امن کی پکار تھے
ابوالکلام حریت کی شمعِ نوربار تھے
مثالِ روزگار تھے
امامِ ذی وقار تھے

ابوالکلام رسم و راہِ زندگی سے آشنا
وہ نکتہ داں وہ دیدہ ور بلند فکر رہنما
وہ شانِ قوم نازشِ وطن وہ فخرِ ایشیا
وہ ایک مردِ باخدا
وہ حق طلب وہ حق نوا

انھیں فضا کی تیرگی نہ راہ سے ہٹا سکی
نہ آندھیوں سے کچھ ہُوا نہ برق انھیں ڈرا سکی
زمانہ کے فریب میں وہ شخصیت نہ آسکی
فرنگیت دبا سکی
نہ مصلحت جھکا سکی

ابوالکلام کیا گئے کہ روحِ انجمن گئی
لفاستِ زباں گئی لطافتِ سخن گئی
انھیں کے ساتھ ساتھ سب متاعِ فکر وفن گئی
صباحتِ چمن گئی
جلالتِ وطن گئی

تصویرِ ابوالکلام

از شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری

شبیہہ جنتِ کشمیر دیکھ لی میں نے ابوالکلام کی تصویر دیکھ لی میں نے
ادا ادا میں نہاں خلدِ حُسنِ اہلِ نظر بہشتِ شوقِ جہانگیر دیکھ لی میں نے
خطِ جبیں میں مچلتی ہوئی حیات افروز نگاہِ کاتبِ تقدیر دیکھ لی میں نے
مزاجِ کون و مکاں کو سمو دیا جس میں وہ الہلال کی تحریر دیکھ لی میں نے
"غبارِ خاطرِ آزاد" خضرِ بزمِ جہاں ترے کمال کی تاثیر دیکھ لی میں نے
نشانِ زخم اُبھرتا نہیں کبھی جس کا خروشِ بُرشِ شمشیر دیکھ لی میں نے
بیک نگاہ جو ٹوٹے دلوں کو جوڑ گئی وہ سحر کاریِ تدبیر دیکھ لی میں نے
مٹائیں جہلِ سیاست کی ظلمتیں جس نے وہ شمعِ علم کی تنویر دیکھ لی میں نے
ہے جس میں لطفِ غزل حافظ و نظیری کا وہ خوش روانیِ تقریر دیکھ لی میں نے
خطوطِ خواب جو ڈھالے تھے چشمِ فطرت نے انہیں کی صورتِ تعبیر دیکھ لی میں نے

فنا کے بعد بھی دنیا ہے وقفِ طوفِ لحد
عمل کی قوّتِ تسخیر دیکھ لی میں نے

وہ دیکھ چشمِ تصوّر کے "کاروانِ خیال" ابوالکلام کی رنگینیِ نقوشِ جمال
یہ اُس کا پرتوِ عارض ہے سامنے جس کے رہا ہمیشہ مہ و مہر کا عروج و زوال
نگار خانۂ قدرت میں ڈھونڈھنے پر بھی ملی نہ دیدۂ پُر آرزو کو جس کی مثال
وہ خوش نصیب سراپا شعور و دانش و فکر حکیم نبضِ جہاں تا حدودِ فضل و کمال
وہ بد نصیب نہ سمجھا کسی نے جس کا مقام کبھی سُنی نہ گئی جس کی دعوتِ اقبال
ہزار طعنۂ ابنائے قوم پر جس نے دیا سکوت سے دشنام کا جوابِ سوال
وہ لاجواب مفسّر۔ خطیب۔ فخرِ ادب چراغِ بزمِ صحافت۔ امیرِ حلقۂ قال
جہادِ عزم و شجاعت کا قافلہ سالار جلیل راہنما۔ خوش خیال و خوش اعمال
زعیمِ معرکۂ حرّیت "امامُ الہند" مخالفینِ وطن کے لئے خدا کا جلال
تھے چار سمت فراست کے جس کی سب قائل وہ غرب شرق ہوں یا گوشۂ جنوب و شمال

اُسی کے مشورۂ خیر کی تلاش میں ہے
باضطرابِ دماغ و دلِ "جواہر لال"



ایک سانحۂ عظیم

از حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

حضرت مولانا آزاد پر کچھ لکھنا بہت دشوار ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی شخصیت ایک جامع کمالات شخصیت تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں بہت بڑے مفکر و مدبر سیاست، بہت ہی متبحر عالم اور مفسر بھی تھے اور بے مثال ادیب بلکہ ادب نگاری کے امام بھی۔ ساتھ ہی فن تقریر میں کمال خطابت میں بھی اعلیٰ امتیاز رکھتے تھے۔ حضرت مولانا کے ان اوصاف کمال پر ان کی زندگی میں اس قدر واضح اضافہ ہو چکا ہے کہ اب قلم اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ ایک بات ضرور بہت ذاتی ہے کہ حضرت مولانا آزاد کے متعلق چند کلمات لکھے جاتے ہیں۔

وہ یہ کہ عام طور پر یہ غلط تصور قائم کر لیا گیا ہے کہ دینی، مذہبی تبحر علم اور علمی ذوق رکھتے ہوئے بھی ان کی مذہبی زندگی کو ان کے سیاسی مشاغل نے اس طرح متاثر کر دیا کہ وہ عوام ہی نہیں خواص کی نگاہ سے بھی اوجھل رہی۔

حقیقتاً حضرت مولانا کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگرچہ وقت کے تقاضوں اور اجتماعی ہنگامی زندگی نے ہی کو مسلسل تحریک تحفظ وطن اور پھر آزادی کے بعد وطن عزیز کی تعمیر اور مسلمانوں کے مستقبل کی فکر نے بے حد مصروف و منہمک رکھا پھر بھی حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ سکون شب و سعادت اوقات کی وہ گھڑیاں جبکہ دنیا بستر راحت پر خواب نوشین کے مزے لوٹتی ہے رجوع و انابت الی اللہ، مراقبہ و عبادت میں نہ گذری ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد (غموماً ۹ بجے) سو جاتے تھے اور صبح کو ۲-۳ بجے روزانہ بیدار ہوتے اور اول چار رکعت سے آٹھ رکعت تک خدا کے حضور میں سر بسجود جبین نیاز رہنے کے بعد اپنے شوق چائے سے فارغ ہوتے اور پھر تفسیر قرآن حکیم یا آیات الٰہی کے کسی عنوان پر غور و فکر میں صبح کی نماز تک مشغول رہتے اور نماز فجر پڑھ کر اپنے دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔

ترجمان القرآن جیسی علمی و مذہبی کاوش فکر کا شاہکار ہے۔ اس کی تسوید و تحریر بھی صبح کے ان مبارک اوقات ہی میں عمل میں آئی۔ جو حضرات اہل علم قرآن عزیز کے ترجمے مطالب اور تفسیر سے خاص شغف رکھتے ہیں ان کو حضرت مولانا کی اس تفسیر سے خواہ کسی خاص مقام پر اختلاف ہی کیوں نہ ہو تاہم وہ سب اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ اس راہ میں حضرت مولانا نے جو کاوش فرمائی اور اس کے نتیجہ میں جو معارف قرآنی اور تفسیری و تشریحی نوٹ دنیا کے سامنے آئے وہ آپ کی بے نظیر اور خداداد صلاحیت فکر و نظر کا روشن ثبوت ہیں۔

تعلیم جدید یافتہ اور تفاسیر کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس علمی کاوش میں حضرت مرحوم کا کیا مقام ہے۔ سورۂ فاتحہ کا مقدمہ جو درحقیقت قرآن حکیم کے سمجھنے میں ایک بنیادی مقام رکھتا ہے اس وقت اردو زبان کیا عربی تک میں اپنے اسلوب بیان، شوکت الفاظ اور دقت مطالب و معانی کے لحاظ سے کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

ترجمان القرآن میں جستہ جستہ مطالب و تفسیرات قرآنی پر جس طرح حضرت مرحوم نے قلم اٹھایا ہے تفاسیر کا مطالعہ کرنے والا بے ساختہ مرحبا و آحسنت کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ خود مولانا مرحوم کی زندگی ہی میں، میں نے بھی قصص القرآن میں حضرت مولانا کی بعض

آزاد سے اختلافات تو ہر کیا لیکن اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا سخت ناانصافی ہے کہ مجموعی طور پر آیات قرآنی کے ترجمے اور تحقیق مطالب و تشریح کے لحاظ سے بلاشبہ حضرت مولانا نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

بد قسمتی کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی اور اہل علم اور دین و ملت سے شغف رکھنے والوں میں اس تشنگی کا ایک احساس باقی رہ گیا۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے گرم موسم کا تقاضہ ہے کہ تالیف و تصنیف یا مطالعہ کے کام کو صبح کی ابتدائی گھڑیوں میں انجام دیا جائے ورنہ دماغ کی تر و تازگی مضامین و افکار میں وہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جس کا علمی کاوشیں تقاضہ کرتی ہیں۔

آج حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی حقیقی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا کوئی خوشامد و تملق نہیں ہو سکتا۔

آج اس محرومی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے کہ اس مرد مومن و مجاہد نے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں جو صحیح موقف اختیار کیا تھا بلاشبہ وہ مجموعہ ہندوستان کے لئے نسخہ کیمیا تھا مگر افسوس چند شخصیتوں، فرقہ وارانہ نظریات اور خود غرضیوں نے ایک تیسری طاقت کے بل پر ان کو بروئے کار آنے نہ دیا اور اس کی بدولت جو ناکامی و نامرادی دس کروڑ مسلمانوں کے حصہ میں آئی آنکھوں میں خاک ڈال کر آج اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس سے بھی زیادہ محرومی یہ کہ ایک ذہنی باکمال و بلند پایہ شخصیت کی علمی اور مذہبی کاوشوں کو بھی سیاسی اختلاف نے اجاگر نہ ہونے دیا۔

قوموں میں ایسی شخصیتیں صدیوں میں مشکل رونما ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا مرحوم کی ذات کو قدرت نے دین و دنیا کے سنگم کا ایک شاہکار بنایا تھا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مفتی اعظم فلسطین کا تأثر

علامہ سید امین الحسینی المدنی جو بعد میں مفتی اعظم فلسطین کے لقب سے مشہور ہوئے کسی زمانے میں ہندوستان آئے تو ان کی ملاقاتیں یہاں کے مقتدر علماء سے ہوئیں، مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی جو ملاقات ہوئی اس کے تاثرات انھوں نے ان الفاظ میں پیش کئے

"مولانا ابوالکلام آزاد نہضۂ دینیہ کے بلند پایہ مرکز اور رفیع ترین علم ہیں ان کی شخصی عظمت اور تبحر علمی میں کوئی کلام نہیں، تاریخ ہند میں آپ کا اسم گرامی زریں حروف میں لکھا جائے گا اور آپ کا تذکرہ تاریخ کے صفحات میں عزت و منزلت کی جگہ لے گا۔ آپ ایسے مرد حق آگاہ اور ایسے بطل حریت ہیں کہ باطل کی طاغوتی قوتیں کبھی آپ کو زیر نہیں کر سکتیں آپ ایک ایسی چٹان ہیں کہ جو بھی آپ سے ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔ خدمت دین آپ کا مقصد زندگی اور اصلاح ملت آپ کا نصب العین ہے۔ آپ نے اسلامی خدمات اس شان سے سرانجام دیں کہ رہتی دنیا تک ان کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ آپ نے تعلیم و تعلم، نشر و اشاعت اور تبلیغ و دعوت کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ کا اسم گرامی خود ان صفات کا مظہر ہے جن کا مظاہرہ آپ کرتے رہے اور کر رہے ہیں خدا کی قسم غیور رہو تو ایسا جو نصرت دین اور اشاعت و تبلیغ کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دے۔ عوام و خواص کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے ان کی زندگی پورے ملک کے لئے ایک سبق ہے۔"

علامہ سید امین الحسینی المدنی کی یہ رائے اس وقت کی ہے جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے عنفوان شباب میں تھے۔

ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

اے کہ تیری زندگی تاریخِ عالم ساز تھی
زندگی ممنونِ احساں ہے ترے پیغام کی

یُوں نوازا تھا کسی نے ذوقِ عرفاں سے تجھے
سب خودی و بیخودی کے راز تھے تجھ پر کھُلے

ارتقائے علم و فن کو تو نے وہ رُتبہ دیا
جس نے تا بامِ حقیقت رُوح کو پہنچا دیا

فہم و ادراک و تدبّر علم و ذوقِ آگہی
تجھ کو حاصل تھے ازل ہی سے بفیضِ سرمدی

حکمت و شعر و ادب ہو یا سیاست کا مقام
خوشہ چیں ہیں تیرے اندازِ تفکّر کے تمام

اعتبارِ منطقی ہو یا دستارِ فلسفی
سب نے تیرے نطقِ عرفانی سے پائی زندگی

تیرے لفظوں میں چھُپی رہتی تھی وہ برقِ تپاں
جس کے شعلوں میں شگفتہ تھے ہزاروں گلستاں

نالہ برلب اور کبھی تو محشرِ خاموش تھا
موجزن تیری رگوں میں انقلابی جوش تھا

زندگی کی کون سی منزل ہے وہ اے بُوالکلام
جس میں ہم رنگِ جرس گُونجا نہ ہو تیرا پیام

اے امامِ وقت ہم سے آج تو پوشیدہ ہے
اور تیرا جسمِ فانی واقعی نادیدہ ہے

لیکن اے سرمایۂ تجدید و تحقیق و شعور
معنویت تیری ہستی کی نہیں ہے ہم سے دُور

آج بھی تو بزمِ ہستی کا ہے صدرِ انجمن
مہرِ دانش تیرا ہر گوشے میں ہے پرتَو فگن

صبح کی تابانیوں میں ہے تجلّی ریز تُو
شام کی زلفوں میں ہے اک جلوۂ صد رنگ و بُو

دے رہا ہے درسِ غم ہر پردۂ اسرار میں
بن گئے نالے گونجتا ہے عشق کی گفتار میں

گلستاں کی خلوتوں میں بحر کی آغوش میں
تبکدے میں میکدے میں بادۂ سرجوش میں

جس طرف بھی دیکھتا ہوں تیرا خورشیدِ کمال
ہے تجلّی ریز ہر شے میں بحُسنِ اعتدال

ہے مُسلّم اہلِ دانش میں سرافرازی تری
آفریں تجھ پر ہوائے تبلیغ فطرت کے دھنی

تیرا پیغامِ وفا ہے آج بھی توقیرِ عشق
تیرے ارشادات میں پوشیدہ ہے تفسیرِ عشق

عشق کیا ہے ایک درپردہ مقامِ رازِ دل
جس کی مضرابِ جنوں سے بج رہا ہے سازِ دل

تھا یہی اک شعلۂ عریاں فرازِ طور پر
بن گیا تھا نالۂ برہم لبِ منصور پر

آگ کے شعلوں کو اس نے گُلِ بداماں کر دیا
وقت پر محرابِ خنجر میں کہیں سجدہ کیا

پنجۂ قدرت میں ہے اس کے دو عالم کا نظام
منزلِ جبروت میں ہے رہبرِ عالی مقام

ہے اسی کے دَم سے قائم ارتباطِ جسم و جاں
منکشف ہے اس پہ مرگ و زیست کا رازِ نہاں

شعر کو اقبال[1] کے بخشی اسی نے زندگی
جنّتِ عرفانِ حقیقت کی حسین احمد[2] کو دی

اے امام الہند فیضِ عشق ہی تو بے گماں
لے کے پہنچا ہے تجھے تا منزلِ باغِ جناں

بعد مُردن تو بآغوشِ بقا ہے شاد کام
تیری مرگِ عرش پیما پر محبّت کا سلام

الم مظفرنگری

از وجودِ خود عدم را باز جنت ساختی
زیں جہاں رفتی و مارا در الم انداختی

---

۱ ڈاکٹر علامہ اقبال
۲ حضرت شیخ الاسلام

ایک امانت

از
مولانا سید محمد میاں صاحب
ناظم جمعیۃ علماء ہند

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بہت بلند تھی اتنی بلند کہ اُس کے بہت سے گوشوں کو سمجھنا مشکل ہوتا تھا لیکن اگر کسی موقع پر کسی تقریب سے استفادہ کا موقع مل جاتا تھا تو آپ کی مدلّل، اور فصیح و بلیغ تقریر، نہ صرف مطمئن بلکہ اس درجہ محظوظ کر دیا کرتی تھی، کہ جب تک حافظہ اس کو محفوظ رکھتا تھا، دل و دماغ اس سے لُطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ لُطف اندوزی، حفظ و یادداشت کی عمر میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دیا کرتی تھی (رحمۃ اللہ تعالیٰ و شکرہ) ایسی بلند شخصیت کے متعلق کچھ لکھنا آسان کام نہیں، اسی بنا پر خامہ فرسائی کی ہمت ہوئی نہ طبع آزمائی کی، البتہ ایک خاص مسئلہ جس کا جواب خود مولانا موصوف کی جانب سے احقر کے پاس امانت کی طرح محفوظ ہے، اس کا پیش کر دینا اس وقت اس لئے بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے ایک شبہ کا ازالہ ہوتا ہے جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر "ترجمان القرآن" کے مقدمہ پر کیا جاتا ہے۔

ترجمان القرآن کو اگرچہ خود امام الہند نے اپنی آخری تصنیف نہیں قرار دیا۔ وہ ہمیشہ ایک اور تفسیر کا حوالہ دیتے رہے جس کا خاکہ دماغ میں مُرتسم تھا اور اس کو صفحاتِ قرطاس پر آراستہ کرنے کے لئے فرصت درکار تھی۔ مگر جب دستِ قضا نے فرصت کے تمام امکانات کو قطعی طور پر ختم کر دیا ہے تو اب یہ ترجمان القرآن ہی حضرت موصوف کی علمی تصانیف میں "شاہکار" کی حیثیت رکھتا ہے، اس ترجمہ اور تفسیر میں اگرچہ مولانا مرحوم کے ایسے تفردات بھی ہیں جن سے دوسرے علماء نے اتفاق نہیں کیا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقدمہ ترجمان القرآن یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ نہ صرف زبان اُردو پر بلکہ حقیقت شناس علماء۔ ۔ملت پر ایک احسانِ عظیم ہے۔

تفکر فی آیات اللہ۔ اور کائناتِ آفاق و انفس میں غور و خوض جس کی جابجا قرآن حکیم نے دعوت دی ہے۔ اور مختلف پیرایوں میں یہ اعلان

وفی الارض آیات للموقنین۔ وفی انفسکم
افلا تبصرون۔ (اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر دلالت
کرنے والی، اور اُس کے وجودِ برحق پر شہادت دینے والی بہت
سی نشانیاں اہل یقین کے لئے کائناتِ ارضی میں موجود ہیں اور
خود تمہارے اندر موجود ہیں، پس کیا تم چشم بصیرت سے کام
نہیں لیتے۔)

یعنی یہ بات کہ یہ مخلوقات جو پشتِ زمین پر یا زمین کے جگر ۔۔۔ کی تہ، دریا کی موجوں پہاڑوں کے سینوں یا فضاء آسمان میں موجود ہے جس کے مشاہدہ سے ہر وقت ہماری نگاہیں خیرہ ہوتی رہتی ہیں اس سے ہم اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی وحدانیت، اس کی ربوبیت، اسکی رحمت اس کے عدل و انصاف اُس کی کارسازی اور چارہ گری پر کس طرح استدلال کر سکتے ہیں ۔ت کہ استدلال و استشہاد کے وہ کون سے جواہر پارے فرشِ زمین پر بکھرے ہوئے ہر وقت اگرچہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں مگر (افلا تبصرون کے تعجب خیز

حیرت انگیز استفہام کے بموجب) ہم چشم بصیرت سے کام نہیں لیتے اور یہ بات کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو فہم و عقل اور چشم بصیرت عطا فرمائے تو وہ کس طرح ان سے کام لے سکتا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم نے تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس کی جو بلند پایہ مثال پیش کی ہے۔ وہ ایک بے نظیر اور بہترین درس ہے جس کی مثال اُردو کی کسی تفسیر میں تو کیا فارسی اور عربی کی تفسیروں میں بھی بہت ہی مشکل سے مل سکیگی بلکہ یقین ہے کہ نہیں مل سکے گی۔ مگر اس عجیب و غریب تفسیر کی ظاہری سطح صاف و شفاف ہونے کے باوجود کچھ ایسی فکر آزما۔ اور مزلۃ الاقدام ہے کہ بار ہا استدلال عموماً لغزش کر جاتا ہے اور مطالعہ کرنے والا یہ خیال قائم کرنے پر تقریباً مجبور ہو جاتا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ، توحید اور عقیدہ نبوت و رسالت کو تسلیم کر لینے کے بعد خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ نجات کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور کچھ اور اہلِ علم حضرات نے خود مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس طرف توجہ دلائی تو مولانا مرحوم کا جواب یہ تھا کہ اس بحث کا اصل موقع، سورۂ احزاب کی وہ آیتِ کریمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاتم النبیین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین۔ لیکن اس جواب کا مضمر پہلو گویا یہ تھا کہ تفسیر سورۂ فاتحہ کے مضمون کی اس خامی کو خود مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں تو پھر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا ضرورت ہے کہ اس خامی کو ختم کرنے کے بجائے محفوظ رکھا جائے اور ایک نہایت ہی مفید مضمون کی افادیت کو مخدوش اور مجروح کر دیا جائے۔

علاوہ ازیں یہ جواب کبھی اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ بلکہ گنے چنے افراد کے سینوں ہی میں اس کی کچھ یاد باقی رہ گئی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا مرحوم کے حامی علماء سے اکثر اس سلسلہ میں استفسارات ہوتے رہتے تھے چنانچہ ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے کہ ساؤتھ افریقہ کے مسلم حلقوں میں یہ بحث شروع ہوئی۔ "ڈربن نیٹال" سے شائع ہونے والے ایک ہفتہ وار اخبار "انڈین دیوز" نے اس بحث میں کافی حصہ لیا۔ اس سے متاثر ہو کر جمعیۃ علماء ٹرانسوال (ساؤتھ افریقہ) کے سکریٹری محترم محمد نانا صاحب نے چند سوالات پر مشتمل ایک خط براہِ راست حضرت مولانا آزاد مرحوم کو لکھا۔ ہمارے ایک اور کرم فرما۔ "احمد مُتات صاحب" نے ایک خط احقر کے نام بھی بھیجا جس میں یہی سوالات تھے اور احقر سے جوابات طلب کئے گئے، اس مرتبہ احقر کو بھی خیال ہوا کہ اپنی طرف سے جوابات لکھنے کے بجائے خود مولانا سے استفادہ کیا جائے، چنانچہ احقر نے یہ خط بجنسہٖ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجدیا۔

محترم محمد نانا صاحب کے خط کا جواب غالباً حضرت مولانا نے براہِ راست محمد نانا صاحب کو بھجوا دیا تھا۔ البتہ احمد مُتات صاحب کا جو خط احقر نے بھیجا تھا اس پر جواب کی دو سطریں اجمل خاں صاحب کے قلم سے لکھوا کر احقر کے پاس بھجوا دیں۔ اِس وقت حضرت مولانا کا یہی جواب پیش کرنا۔ اس مضمون کا موضوع ہے۔

جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احمد مُتات صاحب کا اصل خط بھی پیش کر دیا جائے۔

تاکہ یہ دستاویز اپنے اصلی الفاظ میں اشاعت پذیر ہوکر محفوظ رہ سکے۔

سوال ——— بیانؔ ڈربن نیٹال" سے "انڈین ویوز" نامی ایک ہفتہ وار اخبار عرصہ سے جاری ہے اس کے مدیر جناب موسی میر صاحب کے سلسلۂ مضامین میں ایک مولوی صاحب سے بحث شروع ہوگئی ہے اور طویل عرصہ سے حسب ذیل مضمون پر زور زور سے لکھ رہے ہیں

(۱) اگر کسی غیر مسلم کو اسلام کی صداقت و حقانیت کا یقین نہ ہوا ہو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو یہ "عدم ایمان بہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" قیامت کے روز قابل مواخذہ نہ ہوگا۔ قرآن شریف میں غیر مسلموں کے متعلق جو تہدیدیں آئی ہیں اس کے مصداق وہ غیر مسلم ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضد اور دشمنی سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ ہر ایک غیر مسلم یہودی، نصاری، مشرک سب کو اس کا نیک عمل قیامت کے روز پورا پورا فائدہ دے گا۔ اور "عدم ایمان بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم" جزا از نیک عمل سے مانع نہ ہوگا۔ اور اس پر "ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاری والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" وغیرہ آیات سے دلیل کرتے ہیں اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب دام اقبالہم کی تفسیر "ترجمان القرآن" سے حوالجات نقل فرماتے ہیں ——— لہٰذا خدمتِ اقدس میں گذارش ہے کہ از روئے شرع اسلام مذکور الصدر کی تصویب فرمادیں ——— نیز یہ بھی تشریح فرمادیں کہ جزا از نیک عمل میں تخفیف عذاب جہنم ہوگی یا کہ نجات من النار۔ و دخولِ جنت و رضاء الٰہی بھی حاصل ہوگی، بینوا توجروا

احقر احمد ثمات عفی عنہ

ڈربن (نیٹال - ساؤتھ افریقہ)

جواب از مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ بقلم اجمل خاں صاحب پرائیویٹ سکریٹری۔

(۱) قرآن نے ایمان و نجات کے لئے یہ بات بھی بطور بنیادی شرط کے قرار دی ہے کہ تفریق بین الرسل نہ کی جائے یعنی تمام انبیاء پر بلا استثناء ایمان لایا جائے جو غیر مسلم حضرت خاتم النبیین پر ایمان نہیں لاتا وہ تفریق بین الرسل کرتا ہے۔ اور یہ کفر ہے۔

(۲) قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ہر عمل کی ایک جزا ہے اور وہ عامل کو ضرور ملتی ہے۔

۲۱ر جنوری ۱۹۵۶ء

ان دونوں جوابوں کے تشریح کے دامن بہت وسیع ہو سکتے ہیں مگر مختصر جوابوں کے لئے یہ مختصر و مجمل تشریح یقیناً اہل علم کے لئے دلچسپ ہوگی کہ "کفر" بھی ایک عمل ہے۔

محمد میاں

مولانا محمد جمیل الرحمٰن دارالعلوم دیوبند

دریغا رفت امام الہند آزاد
کہ بود اندر جہاں فضل و علم

ہندوستان میں مسلمان کا موقف!

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کے تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی بلکہ وہ اس راہ میں میری راہ نمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل فیکٹر (FACTOR) ہوں۔ میں اس دعوی سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہم اپنے ساتھ کچھ ذخیرے لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہونچادیا۔

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں"

ابوالکلام آزادؒ

برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت

"میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے انہیں قید کر رکھا تھا۔"

ابوالکلام آزادؒ

ملّت کی تنظیم اور جماعتی شیرازہ بندی علمائے حق کی سرپرستی میں

مولانا آزادؒ کے افکار و عزائم کی زندہ تصویر

"جمعیۃ علماء ہند"

"وطن عزیز کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ملّت بیضا کی دینی قیادت و اصلاح تعلیمی و تہذیبی، نگہداشت اور فکری و عملی رہنمائی ہمیشہ ایک ایسی جماعتی زندگی اور صحت مند تنظیم کی متقاضی ہے جس کی زمام قیادت اُن روشن خیال علمائے حق کے ہاتھوں میں ہو جن کے ذہن فراست ایمانی سے بہرہ مند اور جن کے دل احساس فرض اور جذبۂ عمل سے آباد ہوں"

یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کی عملی تشکیل بیسویں صدی کے شروع میں خانوادہ ولی اللّٰہی کی فکری توجہات کا مرکز بنی ہوئی تھی اور بالآخر شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن فقیہ العصر مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ اسرارہم کے مبارک ہاتھوں نے جمعیۃ علماء ہند کی شکل میں اس کی داغ بیل ڈالی اور اپنی زندگیاں اس مرکز قیادت و تنظیم ملّت کی آبیاری اور ساخت و پرداخت کے لئے وقف کردیں۔ اس مرکز قیادت اور جماعتی تنظیم کو آج ہم "جمعیۃ علماء ھند" کے نام سے پورے ملک میں سرگرم عمل دیکھ رہے ہیں اور اس کی گذشتہ و پیوستہ خدمات کا زریں ریکارڈ موجودہ نسل کے سامنے ہے۔

شروع ہی سے جمعیۃ کی تشکیل میں حضرت شیخ الہند، حضرت مفتی اعظم، حضرت شیخ الاسلام رحمہم اللہ کے ساتھ ساتھ امام الہند کے دل کی دھڑکنیں بھی شریک و سہیم رہی ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے زندگی کے آخری سانس تک وہ جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے اور ہمیشہ جمعیۃ کی قیادت اور فیصلوں میں اُن کی تدبیر و رہنمائی شامل حال رہی۔

نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سب سے پہلا عظیم الشان اجلاس لاہور میں ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا آزادؒ نے فرمائی۔ اسی اجلاس میں آپ کو متفقہ طور پر "امام الہند" کا خطاب پیش کیا گیا تھا ——— علمائے حق کی بڑی جمعیۃ اپنے ایک متفقہ فتوے کے ذریعہ ہندوستان میں برطانوی تسلط کو سراسر ناجائز اور اس کے تعاون و موالات کو مذموم قرار دے چکی تھی۔ حکومت وقت نے یہ فتوے خلاف قانون قرار دیکر ضبط کرلیا تھا۔

حضرت مولانا آزادؒ کی صدارت میں اس اجلاس نے ایک بار پھر اُس فتوے کی تصدیق و تصویب کی قرارداد پاس کی اور اعلان کیا کہ وطن عزیز کی آزادی کے لئے ہر ممکن جد و جہد مسلمانان ہند کے مذہبی فرائض میں سے بھی ایک اہم فریضہ ہے۔ ساتھ ہی پوری جرأت حق اور عزم و ثبات کے ساتھ اس اجلاس نے ولایتی کپڑے کے ملک گیر بائیکاٹ کا فیصلہ بھی صادر کیا تھا۔

اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا آزادؒ نے فرمایا تھا

"آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ علماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں۔ میں ۱۹۱۲ء سے وا اسفا علی یوسف کی فغاں بھی کر رہا ہوں اور جس کے لئے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنی چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اُس کے سواد حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیئے ہیں۔ ۱۹۱۱ء سے آجتک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور روح عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب میرا دل اس مقصد کی طلب سے خالی رہا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گذری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بیقراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں

پس اے بزرگان ملّت! اگر آج علمائے اُمّت کی یہ نہضت مبارکہ "جمعیۃ علماء" کی شکل میں طالع و نظر فروز ہوئی ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ یہ میری تمناؤں اور آرزوں کا ظہور ہے اور میری فریادوں اور التجاؤں کی قبولیت!

هٰذا تاویل رؤیای من قبل۔ قد جعلها ربی حقا

۱۹۳۱ء میں کانگریس کے اجلاس عام کے بعد جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس بھی کراچی میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت مولانا آزادؒ نے ہی فرمائی۔ جمعیۃ کے اس عظیم الشان اجلاس میں تحریک آزادی ہند کے تقریباً تمام ہی صف اوّل کے رہنما شریک تھے۔ غیر مسلموں کی بڑی تعداد مسلم رہنماؤں کے افکار سننے کے لئے آئی تھی۔ گاندھی جی اور دوسرے غیر مسلم رہنماؤں کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ اسی اجلاس میں حضرت مولانا آزادؒ نے اپنی بصیرت افروز صدارتی تقریر ارشاد فرماتے ہوئے گاندھی جی کو خطاب کرکے فرمایا تھا۔

"ہندوستان کی تاریخ میں اس حقیقت کو کبھی بھلایا نہ جاسکے گا کہ جب وہ وقت آیا کہ ہندوستان کے ہاتھ غلامی کی زنجیروں میں بندھ گئے اور وطن عزیز کے پیروں پر بدیسی سامراج کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، ایسے وقت میں فرزندان وطن کا وہ طبقہ جو جدید تعلیم کے اعلیٰ امتیازات سے بہرہ مند اور نئی روشنی کو اپنے دلوں اور دماغوں میں سمائے ہوئے تھا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں سے نکلی ہوئی۔ وکیلوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں اور تربیت یافتہ دماغوں کی وہ فوجیں جنہوں نے فلسفۂ اور تاریخ کو بارہا دہرایا تھا جنہیں انقلاب امریکہ و فرانس کی داستانیں ازبر یاد تھیں، اُن کے کان خود اپنے وطن میں انقلاب کی صداؤں کو نہ سن سکے اور اُن کی نگاہیں کوئی راہ تلاش نہ کرسکیں۔ غیر ملکی اقتدار و شوکت سے وہ اس درجہ مرعوب ہوئے کہ علم و عمل کے دراز پرکنیاں اُن کے ہاتھ سے گرگئیں۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ایک دوسرا طبقہ جو قدیم روایات کا حامل اور پُرانی تعلیم و طرق کا علمبردار تھا اُٹھا اور وقت کے تقاضوں کے پورے احساس اور جوش عمل کے ساتھ میدان کی طرف بڑھا۔ آج ہم اس طبقہ کو جنگ آزادی کی صف اوّل میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ طبقہ، غریب شکستہ حال بوریہ نشین علماء کا تھا جو آج بھی آپ کے سامنے (اشارہ کرتے ہوئے) اس اجلاس میں موجود ہے"

ایک اور موقعہ پر ۱۹۲۲ء میں مسلمانان ہند کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا تھا۔

"ہندوستان کو آزاد ہونا ہے اور وہ آزاد ہو کر رہے گا مورخین عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادی ہند کا مورخ ہوگا جمعیتیں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادی ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر مرہون منت نہیں ہے جس قدر پیروان اسلام کا!"

سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کے ۲۷ سال ملکی سیاست میں انتہائی تیز و تند تھے اس میں سے ایک بڑا حصہ مولانا آزاد نے جیلوں میں گذارا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی زعامت و علمبرداری کی ذمہ داریاں بھی اس دور میں مولانا مرحوم ہی کی ذات سے وابستہ رہیں۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے فضا کو اس قدر مسموم اور غبار آلود کر دیا تھا کہ اپنے دل کی پوری تڑپ اور بے چینی رکھتے ہوئے بھی حضرت مولانا کے لئے مسلمانوں میں کام کرنا بہت دشوار کر دیا۔ اس تمام کے باوجود حضرت مرحوم جمعیۃ علماء کی راہ سے قوم پرور مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ایک بار پھر لاہور میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جنگ آزادی اپنے آخری مرحلہ کو عبور کر رہی تھی۔ انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود امام الہند لاہور پہنچ کر اس اجلاس میں شریک ہوئے اور اپنی بے مثال خطابت سے اجلاس کو مستفید فرمایا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تقسیم وطن عمل میں آئی اور فرقہ پرستی کا جو زہر پچھلے پندرہ بیس سال میں ملک کی فضاؤں میں بکھیر اگیا تھا اس کے ہولناک نتائج اپنی بھیانک شکل میں رونما ہوئے' بربادی و غارت گری کے طوفان اٹھے اور تقسیم شدہ اجزاء ملک پر چھا گئے مسلمانان ہند کے لئے تاریخ کا یہ سب سے نازک دور تھا۔

مولانا ابو الکلام آزاد جو اب حکومت ہند کا ایک ستون بن چکے تھے اس بھیانک دور میں کس کس طرح مصروف خدمت رہے' افسوس کہ اس مختصر تحریر میں ان تفصیلات کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اظہار واقعہ کے طور پر ایک ہی بات لکھی جا سکتی ہے کہ بظاہر اسباب اس بھیانک دور میں صرف مولانا رح ہی کی ایک ذات مسلمانوں کا آخری سہارا اور پشت پناہ تھی۔ اور مسلمانوں اور مولانا کے بیچ میں اس دور میں بھی رشتۂ عمل "جمعیۃ علماء" ہی تھی۔

آزادی وطن کے بعد سیاست و تدبیر کے زاویئے بدل چکے تھے اور اب سوال ملک کی آزادی کا نہیں بلکہ اس کی تعمیر جدید اور اس کے مستقبل میں مسلمانوں کے باوقار موقف کا تھا مولانا آزاد نے تاریخ کے اس نئے موڑ پر بھی جمعیۃ علماء ہند کی راہ سے مسلمانوں کو پیغام عمل سے نوازا۔ لہذا سنہ ۱۹۴۹ء میں مجلس منتظمہ جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس نے باتفاق مولانا آزاد رح کے پیغام کو اپناتے ہوئے پارلیمنٹری سیاست سے دستکشی اور ملت اسلامیہ کی تعلیمی۔ ثقافتی اور معاشرتی اصلاح و پیشرفت کے لئے جدید دستور کا اعلان کیا۔ حکومت کی سرپرستی سے بے نیاز ہو کر مسلمان نسلوں میں دینی فکر و تعلیم کی اشاعت اور تنظیم و تبلیغ کی مہم جو نئے دور میں جمعیۃ علماء ہند کا سب سے اہم نصب العین ہے' حضرت مولانا آزاد رح ہی کے فکر و احساس کا آئینہ ہے۔

اس دور میں سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات مولانا کی ذات اقدس کے گرد اس طرح ہجوم کئے رہیں کہ بہت ہی کم کوئی موقعہ ملا کہ وہ مسلمانوں کے کسی عام اجتماع میں آ سکے ہوں۔ تاہم جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی نشستوں میں وہ اس دور میں بھی اکثر و بیشتر شریک ہوتے رہے اور جمعیۃ کے ارادوں' فیصلوں اور عملی قوتوں کو اپنی مبصرانہ و حکیمانہ قیادت سے برابر نوازتے رہے حق تعالیٰ آج ان کو اس خاموش اور بے لوث خدمت اور ان عظیم احسانات و فوائد کی جزاء خیر سے نوازے جو نصف صدی تک ملت اسلامیہ کو ان کی ذات گرامی سے حاصل ہوتے رہے' بلکہ صدیوں تک ہوتے رہیں گے۔

شکر اللہ مساعیہ وغفر لہٗ واسکنہ فی جناتہ الخالدۃ۔

حضرت امام الہند رح کی آخری تقریر

۱۵ر فروری سنہ ۱۹۵۸ء اردو کانفرنس منعقدہ دہلی

جناب صدر اور دوستو! جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے آج آپ نے یہ مجلس اس لئے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اردو کی جو واقعی جگہ ہے وہ ملنی چاہیئے یہ نہیں کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے اور وہ اسے دی جائے۔

آپ اردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندرلال) نے کہا یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اسی اسپرٹ سے حل کا راستہ صاف ہوتا ہے۔ تیس یا چالیس سال پہلے زبان کے بارہ میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو جو لوگ اردو کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو اور جو ہندی کے حامی تھے ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو اردو ختم ہو جائے گی۔ اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا تو ہندی ختم ہو جائے گی۔ ہم ہر وقت اس نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے اور اسی کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا وقت آیا دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا جس کے نتیجہ میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب ہو گیا اور اردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے ختم ہو گئی اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے مانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی کیا جگہ ہے؟ اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے، بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں حالانکہ اب بات یہ نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کونسی ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے۔ لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیئے اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یوپی' بہار' دلی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں' یہاں کے لاکھوں ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لئے بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی۔ اور اب جبکہ وزیر اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔

مولانا آزادؒ کے دینی افکار میں وحدتِ ادیان کا مفہوم

معاندین وحدتِ ادیان کو جس انداز سے سامنے لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک تمام مذاہب کی مشترک سچائیوں پر عمل کرنا اور ایمان لانا نجات کے لئے کافی ہے۔

یہی مشترک سچائیاں قرآن کا " الاسلام " ہے جسے قرآن نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ رہے اعمال و عبادات، تو وہ صرف ظواہر ہیں۔ ان کی پابندی پر نجات کا مدار نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ کیا واقعی مولانا مرحوم کے نزدیک وحدتِ ادیان کا یہی مطلب ہے۔ ؟ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے تفصیل کے ساتھ مولانا نے اس مسئلہ پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گفتگو کی ہے، جہاں مولانا نے "دین اور شرع" کے اصطلاحی فرق کو واضح کیا ہے۔ پھر سورۂ بقرہ میں بھی چند مقامات پر اس کی طرف اشارات کئے ہیں۔

مولانا کا مقصود تو اس طویل بحث سے صرف اتنا ہے کہ "دین" نام در اصل عقیدہ و عمل کی ان سچائیوں کا ہے جنہیں پیغمبر نے ہر زمانہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور انہی سچائیوں کو ہر قسم کے گرد و غبار سے صاف کر کے قرآن کریم نے دوہرایا ہے۔

اختلاف اگر ہے تو اعمالِ عبادت میں ہے اور فروعِ احکام میں جو انسانی استعداد اور دوسرے حالات کے پیشِ نظر ضرور ہونا چاہئے تھا۔

ان اعمال و طرق کو قرآن کریم نے شرع اور منہاج کہا ہے۔

مولانا چونکہ قرآنی حقائق کے بیان میں قرآن ہی کے اسلوب بیان کی پابندی کرتے ہیں اور قرآن جس موقع پر جتنی بات کہتا ہے مولانا بھی اتنی ہی بات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اور بے موقع طوالت سے گریز کرتے ہیں اس لئے اس بحث میں یہ گوشہ بالکل سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے "اصل دین" کی دعوت کے ساتھ ساتھ جس "شرع اور منہاج" کی دعوت دی ہے اس کا درجہ کیا ہے۔ ؟

یعنی اگر ایک شخص توحید، معاد اور صدق و صفائی وغیرہ پر کاربند ہو جائے تو کیا اس کی نجات ممکن ہوگی؟ اور دین و دنیا کی فلاح کے لئے اس نظام زندگی کی ضرورت نہیں رہے گی جسے پیغمبرِ اسلام نے پورے ارکان و شرائط اور حدود و احکام کے ساتھ پیش کیا ہے،

اس سوال کے جواب میں مولانا نے اس موقع پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔ اسی سکوت سے معاندین اور بے راہ دوستوں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر مولانا کے مسلک کو رسوا کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب کہ "دین" کے ساتھ "شریعت" کا مقام کیا ہے مولانا نے آگے چل کر جگہ جگہ دیا ہے اور اپنی پوری علمی اور عملی زندگی سے دیا ہے اگر مولانا کی مجموعی دعوت کو سامنے رکھ کر وحدتِ ادیان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس میں ادنیٰ اشتباہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر سمجھئے: قرآن کریم نے کسی موقع پر تو صرف ایمان باللہ اور توحید پر زور دیا ہے (حم سجدہ-۳۰) اور کسی جگہ صرف یوم آخر کے اقرار پر (انعام-۴۸) اور کہیں ایمان باللہ کے ساتھ یوم آخر کا ذکر بھی ہے۔ (سورہ بقرہ ۶۲-۸) اور ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسل کا اضافہ ہے (آل عمران-۱۸) اور کسی جگہ ایمان کے پانچ اجزاء بیان کئے گئے ہیں (بقرہ-۲۲)

اب کوئی نادان کسی ایک آیت کو لیکر یہ استدلال کرنے لگے کہ بس ایمان تو خدا پر ایمان لانے کا نام ہے۔ یا صرف قیامت پر ایمان لانے کا نام ہے اور کسی دوسری بات پر ایمان لانا" ایمان" میں داخل نہیں ہے تو یہ اس کی جہالت ہوگی۔ صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے ضروری ہوگا کہ قرآن کی مجموعی تعلیم پر نظر ڈالی جائے کسی ایک آیت سے بھی صرفِ نظر کرنا حقیقت سے دُور پھینک دے گا۔

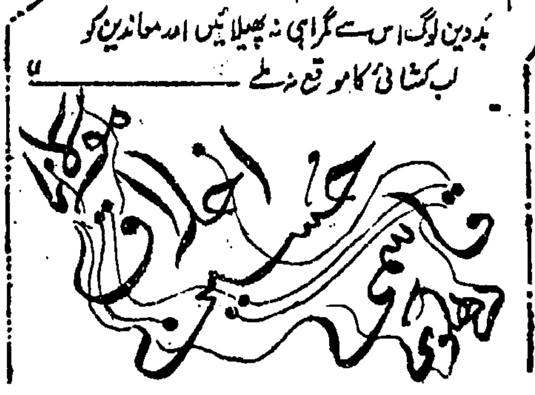
مولانا نے بھی یہی طریقہ رکھا ہے، جو بات قرآن نے جہاں کہی ہے وہیں اس پر گفتگو کی ہے جن تکمیلی خصوصیتوں اور اعمال کی مکمل اور جامع ترین صورتوں کے ذریعہ دین کو شریعتِ محمدیؐ نے کامل دین بنایا ہے مولانا نے ان پر مفصل کلام کیا ہے۔

توحیدِ الٰہی، مشترک سچائی ہے۔ جسے تمام رسولوں نے پیش کیا ہے لیکن قرآن نے خدا کی ذات و صفات کا جو مکمل تصور دنیا کو دیا ہے وہ قرآن ہی کی خصوصیت ہے اس پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں پوری بحث موجود ہے۔

یوم آخر کا یقین یہ بھی مشترک سچائی ہے مگر قرآن نے اس تصور کو جو جامعیت بخشی ہے اس پر بھی مولانا کے ہاں پوری تفصیل ہے۔

"مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے دینی افکار میں وحدتِ ادیان کی بحث بہت مشہور اور نازک بحث ہے اور اسے مرحوم نے اپنی معرکۃ الآرا، دینی اور ادبی کتاب ترجمان القرآن میں بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں مستقل ایک باب قائم کیا ہے اور سورۂ بقرہ میں مختلف آیات کے تحت اس کی طرف اشارات کئے گئے ہیں — یہ مسئلہ چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت مولانا مرحوم ہی نے عوام کے سامنے پیش کیا ہے — اور ان دو بزرگوں کے علاوہ کسی کی قلم نے اس مسئلہ پر حرکت کرنے کی جرأت نہیں کی اس لئے اس پر لوگوں کی طرف سے کافی "لے دے" ہوئی اور معاندین نے اس مسئلہ کی آڑ میں مرحوم کے مذہبی افکار کو بدنام کرنے میں بھی کسی قسم کی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر اس معاملہ میں مولانا کے عقیدتمندوں پر بھی کافی ذمہ داری رہی، کیونکہ ایسے علمی مسئلہ کو نقل کرنے، بیان کرنے اور اس سے استدلال کرنے میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی جو اس جیسے نازک علمی مسئلہ کیلئے ضروری تھی ———

——— یہی وجہ ہے کہ جب وہ "لے دے" مولانا مرحوم تک پہونچی تو مولانا نے "البیان" کے ذریعہ اس قسم کے مسئلوں کی وضاحت کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر افسوس کہ وہ وعدہ وعدہ ہی رہا اور مولانا اس مقدس آرزو کو اپنے سینے میں لئے ہوئے اپنے مولیٰ سے جا ملے ——— ذیل میں، مولانا مرحوم کے دینی مسلک (جو ان کے دینی مقالات میں واضح ہے) کی روشنی میں اس مسئلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک طالب علم کا اظہارِ عقیدت ہے حضرت مرحوم کی جناب میں، ورنہ یہ علمی کام اہلِ علم کا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی علمی جلالت کے شایانِ شان اس پر قلم اٹھا کر اس بحث کو ہمیشہ کے لئے صاف کر دیں تاکہ بددین لوگ اس سے گمراہی نہ پھیلائیں اور معاندین کو لب کشائی کا موقع نہ ملے ———"



ایمانیات میں اسی طرح رسولوں پر ایمان، کتابوں فرشتوں اور دوزخ جنّت پر ایمان اس کو بھی جس تکمیل کے ساتھ قرآن نے پیش کیا ہے اسے بھی مولانا نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

عبادات میں نماز، روزہ، حج، یہ بھی مشترک سچائیاں ہیں جو بنی اسرائیل کے اندر بھی موجود تھیں، لیکن ان عبادات کو ارکان و شرائط کے جن حدود کے ساتھ شرعِ محمدیؐ نے پیش کیا ہے وہ کہیں نہیں، مولانا نے نماز پر مستقل رسالہ لکھا ہے، روزہ اور حج پر ترجمان ہی کے اندر مفصل گفتگو کی ہے۔

یہی حال دیگر مشترک سچائیوں کا ہے۔

آئیے اب جلد اوّل ہی پر ایک سرسری نظر ڈالیں کعبہ کی مرکزیت کے اعلان کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

"جب وہ وقت آگیا تو پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا۔ اور ان کی تعلیم و تزکیہ سے موعودہ امت پیدا ہو گئی، اس امت کو نیک ترین اُمت ہونے کا نصب العین عطا کیا گیا اور اقوام عالم کی تعلیم و ہدایت اس کے سپرد کی گئی۔

ضروری تھا کہ اس کی روحانی ہدایت کا ایک دائمی مرکز و سرچشمہ بھی ہوتا، یہ مرکز قدرتی طور پر عبادت گاہ کعبہ ہی ہو سکتا تھا چنانچہ تحویل قبلہ نے اس کی مرکزیت کا اعلان کر دیا۔ یہی حقیقت قبلہ کے تقرر میں پوشیدہ تھی، جب تک بنی اسرائیل کا دورِ ہدایت قائم رہا مرکزِ ہدایت بیت المقدس تھا اور اس لئے عبادت کے وقت سب کا رُخ بھی اسی طرف رہتا تھا لیکن جب دعوتِ حق کا مرکز مکہ کا معبد قرار پایا تو ناگزیر ہوا کہ وہی قبلہ بھی قرار پائے اور اقوام عالم کے رُخ اسی طرف پھر جائیں۔" (صفحہ ۲۱۷)

مولانا مرحوم نے اصلِ دین پر گفتگو کرتے وقت اصل اور فرع کا فرق واضح کیا ہے اور اعمال و ظواہر کو فرع اور اصول و عقائد کو اصل قرار دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت و اعمال کی جو شکلیں تعلیم فرمائی ہیں وہ "الاسلام" سے خارج ہیں اور مولانا ان ظواہر و رسوم کی پابندی کو نجات کے لئے ضروری نہیں سمجھتے،

چنانچہ لکھتے ہیں۔

"نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں اور انہی کے کرنے نہ کرنے پر انسان کی نجات و سعادت موقوف ہے، لیکن قرآن کہتا ہے اصل دین خدا پرستی اور نیک عملی ہے اور شریعت کے ظاہری رسوم و اعمال بھی اسی لئے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو پس جہاں تک دین کا تعلق ہے ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے نہ کہ وسائل کی" (صفحہ ۲۲۹)

یعنی شریعت کے اعمال و عبادات، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ کی حقیقی رُوح خدا پرستی ہے جو لوگ خدا پرستی خدا کی رضا جوئی، خدا کی محبت کے بغیر یہ کام کرتے ہیں ان کی عبادت بے روح عبادت ہے۔

لوگوں کو چاہیے کہ نماز، روزہ کے حقیقی مقصود کو سامنے رکھ کر نماز روزہ کی پابندی کریں۔ نماز روزہ منہاج اور شریعت ہے اور خدا کی رضا جوئی اور محبت "دین" ہے۔ اس لئے یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا "منہاج و شریعت" کو فلاح و سعادت کے لئے غیر ضروری نہیں سمجھتے، البتہ دین دار بننے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ شریعت کے احکام و عبادات پر رضاءِ الٰہی کے حقیقی جذبہ کے ساتھ عمل ہونا چاہیے۔

مولانا نجاتِ اخروی کے لئے ایمان و عمل کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، لیکن وہ ایمان و عمل کیا ہے۔؟ کیا تمام مذاہب کی مشترک سچائیوں کا نام ایمان و عمل ہے۔

مولانا فرماتے ہیں۔

"جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعوے دار ہے تو اسے چاہیئے، اللہ کے رسول کی پیروی کرے اللہ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار، ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

یہ نوٹ ہے، آیت کے ترجمہ کو ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں۔

اے پیغمبر! تم کہدو (فلاح و سعادت کی راہ تمہارے لئے ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ) اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ (صفحہ ۲۸۷)

یہ اطاعت رسول ہی ہے جس نے تمام مذاہب کی مشترک سچائیوں کو "دینِ کامل" کی شکل بخشی ہے۔ اور یہی دینِ کامل" ان الدین عند اللہ الاسلام" ہے۔

ایک اور موقع پر "اصل دین" پر تقریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کے لئے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں۔ اور جو لوگ ان میں سے صاحبِ حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں۔"

آگے لکھتے ہیں:-

"اس حکم سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے تمام مذہبی اختلافات کے لئے قرآن و سنّت کی طرف رجوع کرنا چاہیے نہ کہ انسانوں کے اقوال و آراء کی طرف۔" (صفحہ ۳۴۷)

سورۂ نساء کی مشہور آیت فلا وربك لا یومنون پر لکھتے ہیں۔

یہاں ان لوگوں کی اس منافقانہ روش کا ذکر کیا گیا ہے اور صاف صاف کہدیا ہے کہ جو شخص اللہ کے رسول کے فیصلے پر یقین نہیں رکھتا وہ کبھی سچا مومن نہیں ہو سکتا۔ (۳۴۸)

تکمیلِ دین کی مشہور آیت الیوم اکملت لکم دینکم پر نوٹ لکھتے ہیں۔

آیت (۵) میں تکمیلِ دین کا اعلان ہے، فرمایا، آج کے دن خدا نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور امتِ مسلمہ اپنے تمام مقاصد اور خصائص کے ساتھ ظہور میں آ گئی۔ (۳۸۲)

ترجمہ میں تحریر فرمایا ہے۔

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پُوری کر دی اور تمہارے لئے پسند کر لیا کہ دین اسلام ہو۔

اس ساری تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم نے جس "الاسلام" کو آج کی دنیا کے لئے پسند کیا ہے وہ الاسلام وہی دین کامل ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مکمل ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ قرآن کریم نے توحید و معاد وغیرہ کے اصولِ عقائد اور معروف و مسلم نیک عملیوں کو اسلام ہی کا نام دیا ہے اور اسی کو اصل دین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ جو ہر دور میں ہر نبی کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے آتا رہا ہے، لیکن اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وحدت ادیان کی مسلمہ حقیقت کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ اسلام کو جو آخری اور مکمل ترین شکل دی ہے وہی قرآن کا پسندیدہ دین ہے اور وہ اپنی تمام معنوی اور ظاہری خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ آج دنیا کے سامنے موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وحدت ادیان ہی کی بحث پر موقوف نہیں حضرت مولانا نے دوسرے مقالات میں بھی جس بات پر پُورا زور دیا ہے وہ دین کے اصولی اور اساسی معاملات ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان آج بھی جس چیز کو اصلی دین بنائے بیٹھے ہیں

وہ چند رسوم ہیں، جن کو دین میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں۔ مسلمانوں کو نہ عقیدۂ توحید کی پرواہ ہے، نہ رضائے الٰہی اور محبتِ الٰہی کے جذبہ کی خبر ہے۔ نہ اسلامی اخلاق و معاملات کا خیال ہے۔ نہ نماز روزہ کی پابندی کا اہتمام ہے رسول اللہ اور اولیاء اللہ کی محبت کے نام پر چند کھانے پینے کی رسمیں ہیں جن پر جسم و جان اور مال و دولت کی پوری طاقت کے ساتھ زور دیا جارہا ہے اور انہی کو نجاتِ اُخروی کے لئے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

نماز روزہ کے پابند طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہ نماز روزہ کی پابندی کرتا ہے مگر نہ ان کی نظر اخلاق کی اصلاح پر ہے اور نہ معاملات کی صفائی میں! حالانکہ قرآن نے جگہ جگہ یہ بات صاف کردی ہے کہ عباداتِ الٰہی کا اصل مقصد اصلاح اخلاق اور رُوحانی ترقی ہے۔ عمریں بیت گئیں نماز روزہ کی پابندی کرتے ہوئے مگر اخلاق کے بگاڑ اور معاملات کی خرابی کا یہ حال ہے کہ دنیا کی نظروں میں مسلمانوں سے زیادہ کوئی بے بھروسہ نہیں، اعتماد ختم ہوگیا۔ وقار گر گیا نہ بات میں وزن ہے، نہ کردار میں، نہ قول میں نہ قرار میں۔

ان حالات میں مولانا نے اپنی دعوت شروع کی۔ ظاہر ہے کہ ایک حکیم داعی، ایک حساس رہنما ان حالات میں یہی راستہ اختیار کرسکتا ہے کہ مسلمانوں کو اصولِ دین کی اہمیت سے آشنا کر کر دین کی حقیقی روح کو نمایاں کرے، فروع کی اہمیت فروع کے درجہ میں رکھے، اصول کے درجہ میں نہ آنے دے۔

چنانچہ مولانا مرحوم نے اختلافِ امت پر ماتم کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"درخت جب سوکھتا ہے تو اس لئے نہیں سوکھتا کہ اس کی شاخوں میں رطوبت نہیں رہی بلکہ اس لئے کہ رطوبتِ حیات کا سرچشمہ جڑ ہے اور اب اس میں زندگی باقی نہیں رہی ہے۔

اسی طرح کوئی قوم اس لئے نہیں بگڑتی کہ اس نے اپنی تعلیم سعادت کی فروعات کو چھوڑ دیا بلکہ اس لئے کہ اصول و کلیات کا سرچشمہ اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا جب تک جڑ میں زندگی ہے اس وقت تک درخت کا ایک پتہ بھی خشک نہیں ہوسکتا لیکن اگر جڑ کو پانی نصیب نہیں تو شاخوں اور پتوں کے اوپر سمندر کے سمندر بھی اُونڈیل دو وہ سرسبز نہیں ہوسکتے"

وحدتِ ادیان کی بحث میں مولانا کا یہی جذبہ پُورے جوش و خروش سے اُبھر آیا ہے اور مولانا نے دنیا کی تمام قوموں کو اصولِ دین کی دعوت دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ آؤ! اگر اعمالِ دین کے نقطہ پر ہمارا اور تمہارا اجتماع نہیں ہوسکتا، نہ ہو لیکن اصولِ دین کے مرکز پر تو ہم اور تم مل بیٹھیں اور مذہب کے وجود کو لامذہبیت کی طوفانوں سے بچانے کے لئے ایک ہوجائیں۔

اگر تمہارا دعویٰ مذہب پرستی صحیح ہے، اگر تم عیسیٰؑ اور موسیٰؑ انجیل و توراۃ پر یقین رکھتے ہو تو "کلمہ سواء" یعنی مشترک بنیادوں پر باہمی تعاون کے لئے تیار ہوجاؤ، ورنہ اسے تسلیم کرلو کہ تم ایمان و عمل سے دُور اور نجاتِ اَبدی سے محروم ہو۔

کیا مولانا آزاد کا یہ مسلک تھا کہ نجات، فلاح اور سعادت کے لئے مذاہب کی مشترک سچائیوں پر عمل کافی ہے۔؟ اس کا جواب مولانا کا حسب ذیل جواب دے گا جو مرحوم نے نزولِ مسیح کے متعلق ایک سوال پر دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ احادیث کے بارے میں میرا عقیدہ کیا ہے۔؟ میں اس کا آپ کو کیا جواب دوں؟ یہ سوال آپ اس شخص سے کررہے ہیں جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کرچکا ہے بلکہ جس کو اس فہم کی توفیق ملی ہے کہ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ میں حکمت سے مقصود "سنت" ہے اور جس نے حابا مقدام کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ

یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن

فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ۔

اتنا ہی نہیں بلکہ جس کی تمام قلمی جدوجہد یکسر دعوتِ اتباعِ کتاب و سنت پر مبنی رہی ہے اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر وہ اتباع اتباع نہیں جو سنت کے اتباع سے خالی ہو

" ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند "

کیا جو ہستی اتباعِ سنت کو یہ مقام دیتی ہو وہ تمام مذاہب کی مشترک سچائیوں کو نجات کے لئے کافی سمجھ سکتی تھی۔؟

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحدتِ ادیان کے مسئلہ میں مولانا مرحوم کے اصل ماخذ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ مولانا کا ماخذ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کا وہ باب ہے جس میں شاہ صاحب نے "دین و شریعت کے فرق پر روشنی ڈالی ہے۔

شاہ صاحب نے باب قائم کیا ہے۔

ان اصل الدین واحد والشرائع والمناھج مختلفۃ۔

یعنی اصل دین ایک ہے اور شریعتیں اور طریقے مختلف ہیں۔

شاہ صاحب نے — شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً الخ اور لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً الخ آیاتِ قرآنی نقل کرکے لکھا ہے۔

واضح ہو کہ دین کی اصل ایک ہی شئی ہے، تمام انبیاء اس پر متفق ہیں، اگر اختلاف ہے تو اس کے طریقوں میں ہے۔

آگے اختلافات کی تفصیل بیان کرکے لکھتے ہیں۔

فالاوضاع الخاصۃ التی مھدت وبنیت بھا انواع البر والارتفاقات ھی الشریعۃ والمنھاج

یعنی عمل صالح، نیکی اور اس کی تدابیر کی جو مخصوص صورتیں مقرر کی گئی ہیں ان کا نام شریعت اور منہاج ہے۔

انہی مخصوص صورتوں کو مولانا آزاد ظواہر و رسوم کا نام دیتے ہیں۔

آگے فرماتے ہیں۔

وبالجملۃ فجمھور الناس لا یتم تکلیفھم الا باوقات وارکان وشروط وعقوبات۔

یعنی عوام پر اصلِ دین پر چلنے کی ذمہ داری اس وقت تک عائد نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی صورتیں متعین نہ کی جائیں، اوقات، ارکان، شروط اور نہ کرنے والے کیلئے سزائیں مقرر نہ ہوں، بحث کے آخر میں اس سوال کو حل کیا ہے کہ شریعت و منہاج کا اصل دین سے کیا تعلق ہے۔؟

فرماتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کی فرضیت میں ان کے اصلاحی اور تکمیلی امور کی فرضیت بھی شامل ہے کیوں کہ عقلاً اور عادۃً ہر شئی کا متمم (مکمل کرنے والا جز) اسی شئی میں داخل ہوتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ ۸۶)

یعنی شریعت اور منہاج نے دین کو مکمل ضابطہ حیات کی شکل دی ہے اس لئے شریعت اور منہاج اصل دین سے الگ نہیں سمجھے جاسکتے۔ پس شریعتِ محمدی نے دین کو مکمل کیا ہے اور مکمل دستورِ زندگی کی شکل بخشی ہے۔ اس بنا پر آخری پیغمبر کی آمد کے بعد نجات اور سعادت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

رثاء للفقيد العظيم

الى روح الفقيد العظيم سيدنا ومولانا ابى الكلام احمد آزاد المرحوم اقدم هذا الرثاء

(للشيخ محمد المامون الدمشقي)

سلام عليك ايتها الروح الطاهرة، اضجعى فى ضريحك هادئة مطمئنة فقد اختارك الله لجواره ليغدق عليك شآبيب رحمته واحسانه، اهنئى بقربك الى الخالق العظيم عز وجل بعد ان ناضلت روحا من الزمن طويلا واذبت نفسك فى تضحيات جسام لا من اجل جر مغنم او تحقيق نفع شخصى بل لنيل مقصد عظيم والوصول الى غاية سامية وهى: تحرير وطنك العزيز والنهوض به الى مصاف البلاد الراقية ونشر لواء العدل والحرية والامن والسلام فى ارجاء الهند بل فى العالم كله، وخدمة الامة الاسلامية والشريعة الغراء

هذا ولم يقتصر نضال مولانا المرحوم على الحقل السياسى فحسب بل كانت له اليد الطولى فى نشر العلوم والمعارف وبث روح الثقافة العالية فى الهند ولقد نجح فى مساعيه نجاحا باهرا وكان موفقا فى ميادين الجهاد الوطنى ورفع مستوى الشعب وتنوير الاذهان وتثقيف العقول - ولقد كان قائدا يقتفى اثره ونورا يستضاء بنبراسه وروحا يحيى بها ميت الآمال -

ولقد فاز على جميع اقرانه فى الهند بسمو المدارك وعلو الهمة وشرف الطبع وفصاحة اللسان وصفاء الذهن وقوة الارادة والعزم المصمم -

وان اعماله المبرورة وصفاته المتازة، ستبقى شخصاتها وتخلد نتائجها وتدوم آثارها ماثلة امام الامم والشعوب فى العالم وتكون اسوة حسنة للاجيال القادمة ومنبع فيض وسعادة مستمرة للنوع الانسانى مدى الدهر،

ولقد كان الفقيد عبقريا فذا حائزا على صفات الانسان الكامل وقد انجز فى غضون حياته من جلائل الاعمال فى سبيل تحرير الهند ونشر الهدى الاسلامى بمفرده ما لا تستطيع الجماهير انجازها فى عصور فلاجل ذلك كان وحده امة مستقلة ولقد قيل:

شعر: وليس على الله بمستنكر ان يجمع العالم فى واحد

فطوبى لك ايتها الروح السامية! فلقد رفعك الله الى الرفيق الاعلى لانك جاهدت فحققت

انجازات الاعمال وانصرفت الى خدمة العلم فكان نتاجك الادبى الفياض ينير العقول ويعلو بها الى اسمى الغايات وقد كنت توجهت الى خدمة الانسانية المعذبة بسبب جهلها وسوء تفاهمها مع اخوانها البشر فكانت جهودك الموفقة فى احلال التفاهم بين الامم واشاعة التعاون بين الشعوب نافعة جدا لانها كانت تعاونا مخلصا لوجه الله

كما انك قد سعيت فى محو الامية بتعميم التعليم وتوثيق الروابط الودية بين الافراد والجماعات لتأليف القلوب والتعاون المتبادل والاستتباب والسلام فى الهند والعالم كله لتنجو الانسانية من الهلاك والدمار المخيف الناتج من ويلات عصرنا الذرى

ولقد كنت حصنا منيعا يلتجئ اليك الضعفاء والمظلومون اتقاء لنوائب الدهر وطلبا لنيل حقوقها المشروعة ولقد قمت بواجباتك احسن قيام -

ايتها الروح العالية، ان فراقك لنا قد ملأ النفوس وجوما والقلوب اسى وحزنا والعقول اضطرابا وذهولا وخاصة عندما شيعتك الجماهير الى مقرك الاخير وهم مئات الالوف من النفوس الحزينة الباكية التى تأثرت بفداحة المصيبة وهول الخطب - فراحوا يبتهلون الى بارئك كانوا خاضعين خاشعين ويسألونه ليتقبل اعمالك قبولا حسنا ويجزيك خير الجزاء ويقربك اليه زلفى، ويجعل قبرك روضة فى رياض الجنان ويمتعك فى حظيرة قدسه بما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر فان الله لا يضيع اجر المحسنين.

هذا وان ماخلفه لنا مولانا المرحوم من التآليف القيمة والآثار الخالدة لهى خير ذكرى له تسجلها الاجيال القادمة بمداد من نور على صفحات الوجود والذكر للانسان عمر ثانى ولعمرى ان آثاره القيمة التى خلفها لنا لهى اعظم ثروة علمية لنا فعلينا ان نقدرها حق قدرها ونعض عليها بالنواجذ (ونعمل بها) ونقتفى اثر مولانا وننهج منهجه القويم فى خدمة الدين ونشر العلم وبث مكارم الاخلاق، والحث على صوالح الاعمال فان كل ذلك لخير الوسيلة لنيل سعادة الدارين - قال الله عز وجل: من عمل صالحا من ذكر او انثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون -

مفتوحہ ممالک میں فاتحین کا داخلہ

اور

غزواتِ اسلامی کا امتیازی نشان

امام الہند ——— کی ——— ایک ——— بصیرت ——— افروز ——— نگارش

فوجوں کا سیلاب جب میدانِ جنگ کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے اندر غیظ و غضب۔ جوش و غرور اور بغض و انتقام کی لہریں اٹھتی ہیں۔

سمندر میں جب طوفان خیز لہروں کا تلاطم برپا ہوتا ہے تو اس کے دردانگیز نتائج کا حال اُن لوگوں کو معلوم نہیں ہوسکتا جو شام کے وقت ساحلِ سمندر پر تفریحِ طبع کے لئے جمع ہو جاتے ہیں کہ موجوں کے تلاطم کا نظارہ دیکھیں اور لطف اٹھائیں، بلکہ اُن کی حقیقت سے صرف وہی خانہ ویران واقف ہو سکتے ہیں جن کے گھر کی دیواروں سے یہ سیلاب ٹکرا کر گذرا ہو۔ دنیا میں اب بھی معرکۂ کارزار گرم ہوتے ہیں۔ فوجیں جوش و غرور کے نشہ میں بادل کی طرح اُمنڈتی۔ بجلی کی طرح کڑکتی اور سیلاب کی طرح آگے بڑھتی ہیں۔ بیسویں صدی کے مناظرِ جنگ میں اگرچہ قدیم زمانوں کے خوفناک چہرے۔ ریدہ تن انسانوں کے ہاتھ پاؤں۔ اور ہفت خوانِ سیاحت کے عجیب و غریب مناظر نظر نہیں آتے تاہم! مہذب، انسانوں کا یہ سیلاب بھی جب کسی شہر پناہ سے ٹکراتا ہے تو ایران و بابل کے بوسیدہ کھنڈروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور خانہ بدوش انسانوں سے کہیں زیادہ تمدن مظلوم چیخ اٹھتا ہے۔

گذشتہ قوموں کے جنگی کارناموں کی داستانیں بیت المقدس، بابل اور ایران کی چاردیواریاں سنا چکیں۔ جدید زمانہ کے فنونِ حربیہ و مناقبِ عسکریہ کا نظارہ بھی پولینڈ۔ پیرس۔ برلن اور ہیروشیما ولیننگراڈ میں ہو چکا۔ تاریخ کی زبان کسی زمانہ میں بند نہیں رہی ہے۔

دورِ قدیم اور دورِ جدید کے وسط میں ایک زمانہ اور بھی گذرا ہے۔ جبکہ ایک گمنام قوم صحرائے عرب سے اٹھی، سیلاب کی طرح بڑھی اور موجِ بہار کی طرح تمام کرۂ ارض پر پھیل گئی۔ دنیا نے اس سیلاب کی رَو میں بھی ظلم و درندگی کی انہی لہروں کو دیکھنا چاہا جو ہمیشہ فوجوں کے طوفانوں میں اٹھتی رہی ہیں لیکن ذوقِ نظارہ ناکام ہو کر گوشۂ چشم میں چھپ گیا۔ دنیا نے دیکھا کہ وہ قوم مختلف مادی طاقتوں سے ٹکرائی۔ بڑے بڑے قلعوں سے ٹکر لی۔ عظیم الشان پہاڑوں کو ٹھوکر لگائی۔ اور بالآخر اس نے تمام کرۂ ارضی کو اُچھال کر رکھدیا تاہم نہ کسی جھونپڑی کو اُجاڑا۔ نہ کسی گھر میں آگ لگائی۔ نہ کسی عظیم الشان محل کو برباد کیا۔ نہ تہذیب و تمدن کی یادگاروں کو مٹایا۔ نہ آثارِ قدیمہ اور تاریخی نشانوں کو منہدم کیا۔ یہ قوم فاتحانہ جوش میں سیلاب کی طرح بڑھی لیکن جب مفتوحہ ممالک میں داخل ہوئی تو گرداب کی طرح سمٹ گئی۔

دنیا نے اس عجیب و غریب متضاد منظر کو دیکھا اور دَم بخود ہو کر رہ گئی۔ صرف ایک ابن خلدون کی زبان نطق میں کچھ حرکت پیدا ہوسکی اور اُس نے اِس حیرت انگیز تاریخ کے فلسفیانہ اسباب کو پوچھنا چاہا لیکن روحانیت کے دریا میں عقل و فلسفہ ہمیشہ غوطے کھاتا ہے۔ اور بالآخر روحانیت کی دستگیری سے ہی کام چلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی فوج فاتحانہ جوش میں میدانِ جنگ کا رُخ کرتی ہے تو اس کے دل کو مختلف طریقوں سے گرمایا جاتا ہے۔ طبل و قرنا کی ہنگامہ خیز صدائیں اُس کا خیر مقدم کرتی ہیں، سپہ سالاروں کی فصاحت اور رجز خوانوں کی آتش بیانی اُسے گرمجوشی کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ عَلَم و پرچم لہرا لہرا کر انسانی آتشِ غضب کو بھڑکاتے ہیں۔ وطن پرستی کی مقدس قسمیں دی جاتی ہیں۔ قوم پرستی کے حلف اٹھوائے جاتے ہیں۔ الغرض ان ہی چیزوں کا پیدا کیا ہوا جوش میدانِ جنگ میں سنگدلی۔ بیرحمی۔ قساوت و وحشت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب کسی شہر سے ٹکراتا ہے تو اس کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

ان الملوك اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ (قرآن حکیم)

لیکن اسلامی فوجوں کی حالت تمام دنیا کے فوجی نظام سے بالکل مختلف تھی — نہ ڈھول و طبل نے اس کے دلوں کو گرمایا نہ اس کے سامنے آتش بیانیوں سے آگ بھڑکائی گئی نہ سُرخ و سبز جھنڈیوں کے نیچے اُس کی نمائش و غرور کے پھریرے اڑائے گئے۔ نہ قوم و وطن کے ترانے سُنا کر اس کے دل و دماغ میں جوش و غضب کے سیلاب اٹھائے گئے بلکہ . . . . وہ خدا کی راہ میں، حق و صداقت کے عشق میں، صرف رب العٰلمین کا نام لیکر اٹھی قوموں اور فوجوں کے بیشمار ملکی و نسلی مقاصد کی بجائے اُس نے صرف ایک مقصدِ روحانی کو اپنے سامنے رکھا۔

لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا (تاکہ اللہ کا کلمۂ حق سربلند ہو)

وہ ایک ہی اخلاقی دستور العمل کو لے کر میدانِ جنگ کی طرف بڑھی جو آج بھی تاریخ کے سینہ پر نقش ہے۔

اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ۔ ولا تخونوا ولا تغدروا
ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا ولا شیخا فانیا ولا امراۃ
ولا تعسروا واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین

خدا کی راہ میں خدا ہی کا نام لے کر لڑنا۔ خیانت و بدعہدی نہ کرنا۔ دشمن کو لنگڑا لولا نہ کرنا۔

کسی بچہ۔ کسی بوڑھے، کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ مفتوحین کے ساتھ نرمی برتنا۔ سخت گیری اور تشدد سے کام نہ لینا۔ اصلاح و بھلائی کی کوشش کرنا کہ اللہ تعالیٰ نیکی اور بھلائی کرنیوالوں ہی کو عزیز رکھتا ہے۔ پھر دیکھو!

سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سربفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی نظر آتی ہیں، زلزلہ آتا ہے تو فقیروں کی جھونپڑیوں کے ساتھ قصر شاہی کے ستون بھی متزلزل ہوجاتے ہیں آندھی چلتی ہے تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگرے ہی اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

جنگ بھی ایک سیلاب ہے جو تمدن کے آثار کو بہالے جاتا ہے۔ لڑائی بھی ایک زلزلہ ہے جو نظام تہذیب و عمرانیت کی بنیادوں کو دفعتاً ہلا دیتا ہے۔ معرکہ کارزار بھی ایک آندھی ہے جو علم و تہذیب کے ایک ایک ریشہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیتی ہے۔

دنیا کی تاریخ نے ہر زمانہ میں اس کی دردناک مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔ بخت نصر اٹھا اور بیت المقدس کو برباد کرگیا۔ ایرانی آئے اور بابل کے قدیم تمدن کو تاراج کرکے چلے گئے رُومی اُٹھے اور کارتھیج کی سرزمین کو آگ اور خون سے بھر گئے۔ سکندر یونان سے نکلا اور ایران کے در و دیوار کے ایک ایک نقش کو مٹا گیا۔ تاتاری اُبھرے اور بغداد کے قدیم سرمایۂ تہذیب کو دجلہ کی گہرائیوں میں ڈبو گئے۔

اِس قسم کی یلغاروں نے مادی یادگاروں کے ساتھ ساتھ رُوحانی آثار اور نشانیوں کو بھی فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔

تاتاریوں نے بغداد کے عظیم کتب خانہ کا ایک ایک حرف دجلہ کے بہتے ہوئے پانی سے دھو دیا۔ اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ آگ کے شعلوں کی نذر ہوگیا۔ ایران نے تاج شاہی کے موتیوں کے ساتھ اپنے علمی جواہر بھی غارت گروں کے پاؤں پر نثار کردیئے۔ بت خانے منہدم۔ مسجدیں ویران۔ صومعے اور مدرسے برباد ہوئے۔

یخرج الحی من المیت

لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کے موجیں مارتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے۔ ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک اور بُوئے گُل کی موج بن جاتی ہے۔ ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بنکر چلتا ہے۔ کبھی نسیم خوشگوار بن کر بھی چلنے لگتا ہے۔

پس اسلام بھی ابر کرم کا ایک چھینٹا بُوئے گُل کا قافلہ، اور نسیم سحر کی ایک موج حیات تھا۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو برباد کردیا تھا۔ ایرانیوں کے حملہ سے بابل کا تمدن منہدم ہوگیا تھا تاتاری بغداد میں صرف اینٹ پتھر کا ڈھیر چھوڑ کر آئے تھے ....

...... لیکن فرزندانِ اسلام نے خدا کی راہ میں جان و مال کو برباد کیا تاکہ دنیا کو آباد کریں — انھوں نے خود کو مٹایا کہ دنیا کی مٹی ہوئی یادگاروں کو پھر زندہ کرسکیں۔

انھوں نے اپنا خون بہایا تاکہ دنیا کے چہرے کا وہ آب و رنگ پھر لوٹ آئے جس کو وحشیانہ حملوں کا سیلاب بہاکر لے گیا تھا۔

انھوں نے اس پاک مقصد کے لئے تلوار بھی ہاتھ میں لی تو دنیا نے دیکھا کہ وہی چیز جو پہلے رشتۂ حیات کو کاٹ دیتی تھی اب بکھرے ہوئے اجزاء تمدن کو جوڑ رہی ہے۔ عرب کے جن میدانوں میں خاک اُڑتی تھی، وہاں نسیم خوشگوار کے جھونکے چلنے لگے۔ ایران کے مٹے ہوئے نقش ونگار پھر ابھر آئے۔ یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر گرم ہوگئی۔ مصر و شام کی عظمتوں کا کارواں رفتہ پھر لوٹ آیا۔ بیت المقدس پھر تمدن کا قبلہ مقصود بن گیا۔ جہاں سے اُٹھا تھا۔ انھوں نے واپس دلایا۔ جہاں سے برباد کیا انھوں نے زندگی بخشی۔ پہلے وحشی جن راستوں سے گذری تھیں اُن کی راہ میں ہلاکت و بربادی برتی تھی۔ ٹھیک انھیں زمینوں پر مسلمان گذرے مگر اُن کے ساتھ تہذیب و تمدن۔ امن و آزادی تعمیر و نظم کے فرشتے سایہ فگن تھے۔

یہ تھا مآل اُس قوم کا جس نے دنیا میں اپنے قدم کسی ملک گیری و شہنشاہیت کی خاطر نہیں نکالے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ اللہ کا کلمۂ حق سر بلند ہو۔ اور خدا کی پریشان حال مخلوق کو امن و چین کا سایہ رحمت نصیب ہو، نیکی اور بھلائی پھیلے اور منکرات یا برائیاں دنیا سے دُور ہوں۔

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (یہ وہ قوم ہے کہ جب زمین پر اُس کے قدم جمتے ہیں تو اُس کا کام آبادیوں کو اجاڑنا۔ انسانوں کو قتل کرنا۔ عمارتوں میں آگ لگانا اور قہر و استبداد کی لعنت میں دنیا کو مبتلا کرنا نہیں ہوگا بلکہ وہ کارگاہِ عالم میں اسلئے قدم رکھے گی کہ صلوٰۃ الٰہی کو قائم کرے۔ محتاج اور کس مپرس بیکسوں کو اپنے مال و دولت میں شریک کرے۔ سچائی اور بھلائی کو پھیلائے اور ہر برائی اور ظلم و فساد کو دنیا میں روکے یقیناً یہی قوم اور جماعت تھی جس کا وجود دنیا کے لئے سایۂ رحمت و سکون تھا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس

علامہ جمال الدین افغانی اور مولانا آزاد

از مولانا سلیم احمد سلیم مینائی۔ بنگلوری

مولانا آزاد کا بغور مطالعہ کرنے والوں کو آپ کی شخصیت میں علامہ شیخ جمال الدین افغانی کے خط و خال ابھرتے نظر آئیں گے یا اگر ان دونوں کی سیرتوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ دونوں پیکر گویا ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مولانائے مرحوم کے مورث اعلیٰ علامہ جمال الدین افغانی کے ہم نام المعروف بہ شیخ بہلول دہلوی علوم دینیہ کے امام مانے جاتے تھے جنھوں نے اکبر کے دین الٰہی سے اپنا دامن کبھی ملوث نہ ہونے دیا۔

شیخ افغانی اور مولانا آزاد کے زمانوں کے اختلاف[۱] کو اگر کچھ دیر کے لئے ہم اپنے ذہنوں سے دور کر دیں تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ یہ دونوں جنگ آزادی کے وہ ایسے سپاہی ہیں جو انیسویں صدی میں دوش بدوش صفیں کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اس طرح ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا صرف شیخ افغانی ہی کے سر نہیں بلکہ اس میں مولانا آزاد بھی برابر کے شریک اور حصہ دار ہیں اور عروس مشرق کے گیسو سنوارنے میں دونوں نے کمال مشاقی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شیخ جمال الدین افغانی انیسویں صدی (۱۸۳۹ء) میں پیدا ہوئے جبکہ یورپ کی استعماریت پسندی کے شعلے مشرق کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے دو تین صدیوں سے مضطرب تھے آخر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مصر و ایران کے ساتھ ہندوستان بھی لپیٹ میں آ گیا۔ اور خصوصاً عالم اسلامی جس کے انحطاط کا ذکر علامہ اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

"مسلمانوں کے تنزل کا انتہائی نقطہ ۱۷۹۹ء تھا جب ترکوں کا بیڑہ غرق اور سلطان ٹیپو کو شہید کر دیا گیا"

آخر مغلوں کے تین سو سالہ دور حکومت کے بعد شاہ ظفر کے عہد سلطنت میں سسکتی ہوئی آزادی نے آخری ہچکی لی جس کے بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء سے برطانوی تسلط قائم ہو گیا لیکن آزادی کی وہ روح فنا نہ ہوئی جو مشرق میں شیخ افغانی نے پھونکی تھی، سر سید اور ان کے رفقاء کار کی کوششیں جاری رہیں۔ حالی نے "مسدس" کے سلسلہ میں اس دور کا نقشہ کھینچا ہے

"پس صنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اُس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی، اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب کرنا ہے جو لے راہ ہے پر گم راہ نہیں، وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں گر رستہ کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں اور ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں، مگر قابلیت موجود ہے اُن کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے ان کے قویٰ مشغول ہو گئے ہیں مگر زائل نہیں ہوئے اُن کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے بہتر نمودار ہو سکتے ہیں ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی ان کے خاکستر میں چنگا ریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔"

شیخ جمال الدین نے مشرق میں جو آزادی کا بیج بویا تھا وہ بار آور ہو نظر آ رہا تھا آزادی کے شعلے سارے مشرق میں اپنا اثر کر چکے تھے۔ شیخ کے خیالات و تصورات وقتی نہ تھے بلکہ ہر دور میں انھیں شمع راہ بنایا جا سکتا تھا۔ مترجم مقالات جمال الدین افغانی سید مبارز الدین رفعت ۱۹۴۴ء میں دیباچے میں رقمطراز ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ زمانہ اب بدل چکا ہے لیکن اب بھی غیر تبدیل اور لازوال ہندوستان کے بہت سے مسائل اسی ابتدائی حالت میں ہیں اس لئے جب کبھی اُن کا حل تلاش کیا جائے تو شاید علامہ افغانی کے خیالات اس کی راہبری کریں۔"

مولانا آزاد نے کمسنی میں شیخ کا آخری زمانہ پایا جس پر "پیران خردمند" کو بھی ناز تھا اور کچھ عجب نہیں کہ مشرق کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے اور ملت اسلامی کے منتشر شیرازے کو وحدت کا سبق دینے والے اس بطل جلیل کی عظمت ابتدا ہی سے مولانا آزاد کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوا، الہلال کے صفحات میں شیخ کو ہندوستان سے روشناس کرانے میں بھی مولانائے مرحوم ہی نے سبقت کی جس کا تذکرہ خود کیا ہے۔

تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد مولانا آزاد نے شام، فلسطین، عراق اور مصر کا سفر کیا ان ممالک میں شیخ کے لائحہ عمل اور سیرت کے مطالعہ کا کافی موقعہ ملا اور مصر میں شیخ کے دست راست الشیخ محمد عبدہ اور رشید رضا کی تعلیمات نے بھی آپ کو بہت متاثر کیا۔ سفر سے واپسی کے بعد مولانا آزاد اپنی راہ نمائی کی شمع اسی آگ سے جلا لائے جو شیخ نے ان ممالک میں روشن کر رکھی تھی کلکتہ کا طویل قیام بھی مولانا کے تاثر کی خبر دیتا ہے، جہاں شیخ کا ایک منظم گروہ سرگرم عمل تھا اور شیخ کے مقالوں کا اولین مجموعہ "مقالات جمالیہ" بھی عبدالغفور شہباز نے شیخ موصوف کی اجازت سے ۱۸۸۴ء میں رپن پریس کلکتہ ہی سے شائع کیا تھا۔

قدرت نے مشرق کے ان دونوں فرزندان توحید کو عزم و استقلال، تدبر و فکر، وسعت نظری اور تبحر علمی کی تمام خصوصیتیں برابر برابر تقسیم کی تھیں، خطابت اور طرز تحریر میں دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ شیخ کے "العروۃ الوثقیٰ" اور مولانا کے "الہلال" کے اغراض و مقاصد میں بھی یگانگت پائی جاتی ہے۔

بہرحال مستقبل کا مورخ انیسویں صدی کی ان جلیل القدر شخصیتوں کو جنگ آزادی کے دو جانباز سپاہی قرار دے گا جنھیں قید و بند کی انھیں دشوار گذار منزلوں سے گذرنا پڑا جو اہل حق کے لئے مقدر رہی ہیں۔

تعجب ہے کہ "آثار جمال الدین افغانی" کے مؤلف قاضی عبدالغفار مرحوم شیخ کی ہمہ گیر تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں شیخ کے تصورات کی اس روح کا دامن نصف صدی بعد علامہ اقبال کی فکر فلک پیما نے پکڑا، اس طرح کہ یہ فلسفہ خودی شاعر مشرق کے پیام کا ایک زندہ اساس بن گیا۔"

قاضی مرحوم نے دراصل اس سلسلے کی ایک اہم کڑی درمیان سے نکال دی ہے حالانکہ بقول شیخ اکرام "علامہ اقبال کا فلسفہ خودی "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہے"!

قیادت کی زمام مولانا آزاد نے بھی اسی طرح تھام رکھی تھی جس طرح آپ کے پیش رو شیخ افغانی نے تھامی تھی۔ مشرق کی آزادی و بیداری وہ آئینہ ہے جس میں شیخ افغانی اور مولانا آزاد دونوں ہم شکل نظر آتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

---

[۱] ولادت جمال الدین ۱۸۳۹ء وفات ۱۸۹۷ء
ولادت مولانا آزاد ۱۸۸۸ء وفات ۱۹۵۸ء

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مکتوب

میں پرنس آف ویلز کالج، جموں (کشمیر) کا طالب علم تھا کہ میں نے صوفیہ اور محدثین کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک استفساری خط تحریر کیا ——— سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا خط اپنے جواب کے ساتھ شائع بھی کر دیا جو معارف، اعظم گڈھ جلد ۵۳ نمبر ۴ ماہ اپریل ۱۹۴۴ء میں فن تصوف اور محدثین و صوفیہ میں تطبیق کی راہ کے عنوان سے چھپا۔ اس زمانہ میں چونکہ اس مسئلہ کی تحقیق کی جستجو تھی اس لئے، اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد میں نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ استفسار ایک دوسرے رنگ میں کیا، ان سے میرا استفسار یہ تھا کہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ پر تنقید کی اور ان کی مخالفت کی ہے لیکن محدثین میں ہی صوفیہ بھی ہوئے ہیں جیسے خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء۔ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبد اللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم ——— اس لئے تحقیق طلب امر یہ ہے کہ صوفیہ کا طریقہ صحیح ہے یا محدثین کا مسلک اور اگر دونوں ہی افراط و تفریط سے نہیں بچ سکے ہیں تو اصحاب استعداد اہل حق کا راستہ کونسا ہے اور عملی طور پر اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہئے، اس کے جواب میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے، ازراہ شفقت مجھے، اپنے قلم سے، جواب تحریر فرمایا جو بندھیاچل مرزا پور سے رجسٹری شدہ موصول ہوا۔ اصل خط تو معلوم نہیں ۱۹۴۷ء کی جموں کی شہر آشوبی میں دوسرے علمی نوادر کی طرح کہاں پہونچا لیکن میرے پاس اس کی نقل سری نگر میں محفوظ تھی جو بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں، تاکہ دوسرے اہل ذوق بھی اس سے استفادہ کر سکیں ——— خیال تھا کہ "الجمعیۃ کے آزاد نمبر" کے لئے ایک مضمون میں بھی لکھتا لیکن ۲۴ ستمبر سے بیمار ہوں اور مضمون لکھنے سے معذور اس لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی پیش کر رہا ہوں جو نہ صرف مضمون کی تلافی ہی کر دے گا بلکہ میرے مضمون سے بدرجہا گراں بہا اور قابل قدر رکھتا ہے۔

(مولانا) عبد الرحمن۔ ممبر پارلیمنٹ (کشمیر) ۱۳۶۔ سی، ساؤتھ ایونیو نئی دہلی

بندھیاچل مرزا پور۔

۲۲ نومبر ۱۹۴۵ء

عزیزی! جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے مجھے یاد نہیں کہ کشمیر[۱] میں تمہارا خط مجھے ملا ہو۔ صحت کی کمزوری اور اشتغال کا ہجوم بسا اوقات مجبور کر دیتا ہے تاہم خطوں کے جواب میں عمداً تساہل میری عادت کے خلاف ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ معاملہ تمہارے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوا۔

تم نے اپنے افکار و عقائد کا جو کچھ حال لکھا ہے اس سے نہایت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ علم و عمل حق کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

ابن جوزی و ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ لوگ صوفیائے کاملین کے مخالف تھے۔ خود ابن تیمیہ نے شیخ عبد القادر جیلانی کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے اور ان کے شاگرد ابن قیم نے "منازل السائرین" کی شرح لکھی ہے۔

تم نے میرے شخصی تاثرات دریافت کئے ہیں ——— میں زندگی بھر کی کد و کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق و حال کے میسر نہیں آتا ——— ومن لم یذق لم یدر۔

اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو نوافل تہجد کی مداومت کرو۔ فرائض کے علاوہ تمام نمازیں حتی الوسع تنہائی میں پڑھی جائیں اور استحضار قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ کمیت سے زیادہ 'کیفیت' کا لحاظ رکھنا چاہئے اور اس بات سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے کہ فوراً کشود کار نہیں ہوتا ——— اگر استقامت کے ساتھ سعی جاری رہی تو بحکم والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کشود کار یقینی ہے۔ طلب و سعی کی زندگی بجائے خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے اس سے اپنے آپ کو محروم کیوں رکھیں۔

میں یہاں سے ۲ دسمبر کو کلکتہ جاؤں گا۔ خط کلکتہ کے پتہ پر لکھا جائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام کان اللہ لہ

"سچ یہ ہے کہ ہم سب اپنے اصل کام سے غافل تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے ہمیں یاد دلایا ———"

(شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ العزیز)

---

[۱] مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ اگست ۱۹۴۵ء کے اواخر میں کشمیر تشریف لے گئے تھے۔ اور راقم نے اس وقت ان کی خدمت میں ایک خط جموں سے سری نگر لکھا تھا جس کا جواب نہ ملنے پر مولانا مرحوم رحمۃ اللہ علیہ سے نیازمندانہ شکوہ کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد — ایک تاثر

فطرت کی بساطِ تخلیق پر لاتعداد نقوش اُبھرتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں اسی نظامِ مرگ و زیست کا نام دُنیا ہے۔ یہ کارخانہ کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلے گا مشیت کے سوا اس راز سے کوئی واقف نہیں۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی چمن زارِ قدرت کے وہ جامع المحاسن پھول تھے جس میں شگفتگی، دل کشی اور متانت کا رنگ و حسن صاف نظر آتا تھا۔ یہ پھول جب سے کھلا بہاروں نے اس کا استقبال کیا نسیم سحر اُس کی رُوح کو گدگداتی رہی اور بالیدگیِ حیات کا سامان مہیا کرکے افسانۂ تبسم رنگین کا عنوان بنتی رہی شام شفق رنگ اُس کے عارض سے رنگ کی جرعہ نوش بن کر آتی اور آسائش و سکون زندگی کی منزل تک ساتھ دیکر رخصت ہو جاتی غنچے اس کے ہونٹوں کی لطیف مسکراہٹوں میں اپنی جنت نگاہ کے خاکے تلاش کرتے۔

اُس کی آنکھوں کی شراب گوں مستی کائنات میں بکھرتی تھی تو تاحدِ نظر ہر شئے سراپا خمارِ شباب بن جاتی تھی، اُس کا سکوت مصحفِ تقدیر کا سرنامہ تھا اور اس کا تکلم موجِ تسنیم و کوثر کا جمالیاتی پرتو تھا۔

یہ پھول آدمیت کی شانِ فکر و عمل کو تجملِ جاوداں عطا کرتا رہا۔ اُس نے ایک اشارۂ ابرو سے ہزاروں قسمتوں کے فیصلے صادر کئے۔ اور ادنیٰ سی جنبشِ نظر سے خزاں و بہار کی کشمکش کو ختم کر دیا۔ وہ نباضِ قلوب بھی تھا اور حکیم ارواح بھی۔ اصولِ کار کی جو صراطِ مستقیم اُسے نصیب رہتی تھی اس پر دو سروں کو چلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور جب تک وہ زندہ رہا اُس کا کوئی حریفِ سفر پیدا نہ ہو سکا۔

مزاج میں جرأتِ بیباک تھی، اور تفکر میں صبحِ ازل کی خنک طبعی ان دونوں کے امتزاج سے اس نے اپنے لیل و نہار کا جو ڈھانچہ تیار کیا اُس کی بدولت تمدن میں شہنشاہیت اور انہماک میں درویشی کا غیر متبدل توازن قائم ہو گیا۔

وہ ایک قلندرِ خلوت گزیں تھا۔ جس کے سامنے مسرتیں اور ناجرمانہ حقیقت ناشناسیوں کے لاکھوں مناظر تھے، وہ اُن سے گریزاں رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ اور اپنی تنہائیوں کو "فکر و مطالعہ" کی رفاقت سے ایک ایسی محفل کے سانچے میں ڈھال لیتا تھا جس کی جانِ محفل وہ خود ہوتا تھا۔ جلوتوں میں بھی اُس کی خلوت پسندی ساتھ دیتی تھی، بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ ضرورت کی مجبوریوں کے پیشِ نظر ملاقاتیوں سے باتوں میں مشغول ہے ہر سوال کا جواب پورا دے رہا ہے لیکن اس کا طرزِ جواب مکمل بیگانگی کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

وہ دُوسروں کے غبارِ خاطر کو اپنے کاروانِ خیال کی گرد سمجھ کر اُسی راستے کا خضرِ منزل بنا ہوا چلتا رہا جسے اُس کی عقلِ سلیم نے اپنے لئے متعین کر لیا تھا۔

رہزنانِ راہ کے متواتر حملوں، رفیقانِ سفر کی پیہم بدمذاقی اور نئی نئی الجھنوں سے بکھیڑتا ہوا حصولِ منزل کے بعد وہیں جا کر رُکا جہاں موت اس کی منتظر تھی۔

اُس کی قوتِ مدرکہ نے حقائقِ ارض و سما تک رسائی کے لئے تدبر و تفکر کے دائروں کو وسیع کیا۔ کہیں کہیں مشکلاتِ تجسس نے انکارِ حقیقت کے موڑ سے دو چار کیا۔ مگر وہ اُس موڑ پر کچھ دیر رک کر پھر آگے بڑھا اور حقائق کے چہرہ سے ہر مجازی پردہ کو ہٹا کر اُن میں گم ہو گیا، اب وہ سراپا حقائق تھا۔

سینۂ گیتی کی دھڑکنوں سے اُسے مستقبل کی کارآمد صدائیں سننے کو ملتی رہیں اور وہ ان صداؤں کو ترتیب دیکر اقتضائے وقت کے مطابق وہ مجسمۂ سازِ حقیقت بن گیا جس کی ہر آواز فطرت کی ہم ساز نوازشوں کا شاہکار ثابت ہو کر رہی۔

جب لوگ اس کی آواز پر کان نہ دھرتے تھے تو وہ صورِ قیامت کی طرح گرجتا تھا اور مُردہ دلوں میں نئی زندگی کو جنم دینے کی مساعی میں لگ جاتا تھا۔

سطح بیں طبقہ اُس کے الفاظ میں اُس کی زندگی تلاش کرتا تھا اور وہ "حریمِ معانی" میں چھپکر اس کوتاہ بینی پر ہنستا تھا۔

فلکِ انقلاب سازی کی ہر کروٹ اور اس کے نتائج اُسے معلوم تھے اس لئے ادائے فرض کی خاطر وہ فسطائیت کی پرشکوہ تدبیر بروئے کار لاکر "آگاہیِ عوام" کے لئے معارف بار دھنیں نکالتا تھا۔ اور بربطِ سرمدی کے مفہوم و منشا کو گوش آشنائے دہر کرنے سے اُس نے کبھی غفلت نہیں برتی۔

اُس نے جب انسانی جماعت کو مختلف گروہ بندیوں کا شکار ہوتے دیکھا تو اب سے ۴۶ سال پہلے یہ صدا بلند کی۔

"میری آرزو تھی کہ تمہیں محبت اور قدرت کے اُن گلزاروں کی سیر کراؤں جہاں ہر غنچہ کی چٹک تمہارے ہونٹوں کے تبسم کا انتظار کرے اور ہر پھول تمہیں گلۂ تنگ دامانی پر مجبور کر دے۔"

"مگر آہ! اے ناقدر شناسانِ حقیقت تم نے میری آرزو کو ٹھکرایا میری صداؤں پر توجہ نہ دیکر چمن زاروں کے عوض ببولوں پر قناعت کی اور اُن سے ایسا دامن اُلجھایا جو پوری قبائے حیات کو تار تار کرکے چھوڑے گا۔"

"غرناطہ و بغداد کی تباہیاں، اسپین کی بربادی اور لال قلعہ کی ویرانیاں تمہیں کوئی سبق نہ دے سکیں تو اب ان حوادث کا انتظار کرو جو تمہیں زندگی کے بجائے موت کا درس دینے آئیں گے۔"

"اگر تمہارے جمود کا یہی حال ہے اور تم زمانہ کے نئے تغیر سے آنکھیں پھیر کر بیٹھے رہے تو جس سرزمین پر آہ بار کے کاروانِ عمل پرجلال انداز سے آئے تھے تم وہاں سے قافلے بنا کر نکلو گے اور نحوست و مصیبت تمہارے حال پر آنسو بہا کر تمہیں رخصت کرے گی۔" اُس وقت تم ممکن ہے مجھے یاد کرو مگر میں شاید وہاں ہوں گا جہاں سُن تو سکتا ہوں مگر مُنہ سے کچھ بول نہیں سکتا۔ کس میں ہمت ہے جو اسکی ان صداقت افروز آوازوں کو جھٹلا سکے اور زبانِ حال سے اقرار نہ کرے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا۔

مادّی اور رُوحانی انقلاب

نزولِ قرآن - لیلۃ القدر - رحمت و سعادت کی ایک عالمگیر نمود

از مولانا ابوالکلام آزاد

سکندرِ اعظم نے نصف دُنیا فتح کر لی لیکن وہ ایک دل کو بھی فتح نہ کر سکا۔ رومیوں نے کیسے کیسے عظیم الشان شہر بسائے لیکن دلوں کی اُجڑی ہوئی بستی نہ بسا سکے۔ بخت نصر اتنا طاقتور تھا کہ پوری قوم کو اس نے قید کر لیا اور ستر برس تک غلام بنائے رکھا لیکن بایں ہمہ وہ ایک دل کو بھی اپنا غلام نہ بنا سکا ــــ ایرانیوں نے بابل کے لاکھوں انسانوں کو قتل کر دیا لیکن کسی ایک رُوح کی گمراہی کو فنا نہ کر سکے۔

بلاشبہ بڑے بڑے مادی انقلابات گزر چکے ہیں جنھوں نے عجب نہیں کہ درمیان کی زمینیں کاٹ کر سمندروں کو باہم ملا دیا ہو لیکن کسی کی طاقت یہ نہ کر سکی کہ کسی ایک انسان کو اسکے خدا سے ملا دے حالانکہ وہ اس سے دور نہیں۔

(نحن اقرب الیہ من حبل الورید)

آؤ! ان مادی انقلابات کی ہولناک تاریخ پڑھنے کے بعد ایک رُوحانی انقلاب کو بھی چل کر دیکھیں جو آج سے ۱۴ سو برس پہلے دنیا میں نمودار ہوا تھا۔ یہ انقلاب جس نے دنیا کی تقویم ہی بدل کر رکھ دی۔ فی الحقیقت ایک مقدس رات تھی جو وادیِ بطحیٰ کے کنارے جبل بُو قبیس کے ایک تنگ و تاریک غار سے نمودار ہوئی آسمانوں کے دروازے جو صدیوں سے زمین پر بند تھے یکایک کھُل گئے۔ افقِ مبین پر وحیِ الٰہی کی نور بار بدلیاں چھا گئیں ــــ

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر

یا ایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم و انزلنا الیکم نوراً مُبینا

یہ روحانی انقلاب رحمت و بخشش پروردگار کا ایک ابر تھا جو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک چھا گیا۔ کہ انسانی قلب و روح کی سرزمین کو جس کے حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے سیراب کر دے۔

فانظروا الی آثار رحمۃ اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا

یہ سمندروں کی طغیانی نہ تھی جو زمین کی بستیوں پر چڑھ آتی اور ان کو برباد کر دیتی بلکہ سرچشمۂ ہدایت و فیضانِ الٰہی کا ایک آسمانی ابر تھا جو برسات کی پھواروں کی طرح زمین پر برسا اور اس کی اُجڑی بہار کو شادابی و رعنائی سے بدل گیا۔

یہ زمین کی سطح کو ہلا دینے والا بھونچال نہ تھا جس سے ڈر کر انسان روتا ہے اور پرند اپنے گھونسلوں سے نکل کر چیخنے لگتے ہیں۔ بلکہ عالمِ روح و معنی کا ایک آسمانی زلزلہ تھا جس کی جنبش نے سولوں کو بیدار کیا اور بے قرار روحوں کو امن و راحت بخشی کہ وہ سونے کی جگہ بیدار ہوں اور رونے کی جگہ خوشیاں منائیں۔

وہ انسانوں کی درندگی نہ تھی جو اپنے ہی ابنائے جنس کو سانپوں کی طرح ڈستی اور بھیڑیوں کی طرح چیرتی پھاڑتی ہے۔ بلکہ خدا کی رحمت و نوازش کی ایک عالمگیر نمود تھی جس نے نسلِ آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانوں کو باہم بغل گیر کر دیا۔ اور زمین کو اُس کی چھنی ہوئی امنیت و سعادت واپس دلائی گئی۔

یہ قرآنِ حکیم و فرقانِ مبین کا نزول تھا جس نے قلبِ محمدؐ بن عبداللہ کو اپنا مہبط و مورد بنایا۔

وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین

پس سعادتِ بشری کا یہ پیغام جس رات میں اُترا وہ رات لیلۃ القدر قرار پائی اور وہ مہینہ جس میں کائناتِ ارضی نے اس بشارت کو سنا رمضان المبارک قرار پایا ــــ

یہی مبارک رات اور یہی مقدس مہینہ فی الحقیقت اس عالمگیر انسانی سعادت کی یادگار ہے جس کا دروازہ قرآنِ حکیم کے نزول سے دنیا پر کھُلا۔ اور جس کے بعد خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہجر و حرمان کی جگہ وصل و محبت کے راز و نیاز شروع ہوئے ــــ کفر و دشمنیت کے طوق سے انسانوں کی گردنیں آزاد ہوئیں، انسانی استبداد و حاکمیت کی زنجیریں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ نیکیوں کا لشکر آراستہ ہوا جس نے صدیوں سے پھیلی ہوئی بُرائیوں اور جمی ہوئی گمراہیوں کو شکست دی۔

پس جس طرح دنیا اپنے مادی انقلابات کی یادگاریں مناتی ہے، مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس عظیم الشان رُوحانی انقلاب کی یادگار منائیں۔ دنیا خونریزیوں کی یادگار مناتی ہے۔ لیکن ہمیں سچے امن اور حقیقی رحمت کی یادگار سونپی گئی، دنیا لڑائیوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ صلح و محبت کی عالمگیر یادگار قائم کریں۔

دنیا ملکوں کی فتح اور زمینوں کی تسخیر کی یاد مناتی ہے مگر ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ دلوں کی فتح اور رُوحوں کی تسخیر ہی اس قابل ہے کہ اس کی یاد منائی جائے۔

یہی یادگار ہے جسے قرآنِ حکیم نے یُوں تعبیر کیا ہے۔

"یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس و بینات من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔"

الجمعیۃ کے متعلق :—

یہ حقیقت

یاد رکھئے!

کہ

الجمعیۃ محض ایک اخبار ہی نہیں، بلکہ آج دنیا میں آپ کی قومی اور ملی آواز ہے۔ آپ کے مسائل و مفاد کا قابل ترین وکیل اور ترجمان ہے۔ حالات حاضرہ اور وقت کے تقاضوں پر آپ کا سچا مشیر اور روزمرہ کے ملکی و بیرونی واقعات اور خبروں کو آپ تک پہنچانے والا اردو صحافت کا بلند ترین اور باوقار جریدہ ہے ——— جس کا اجراء

مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ نور اللہ مرقدہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز، امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ ورفع درجاتہ جیسے مخلصانہ و بیباکانہ رہنماؤں کے احساس و فکر کا نتیجہ ہے۔

وطن عزیز میں اس آواز کو باقی رکھنا، مضبوط کرنا اور ترقی دینا آپ کا قومی، ملی اور جماعتی فریضہ ہے۔ صرف دو آنہ یومیہ خرچ کر کے آپ اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں ———

خود بھی الجمعیۃ خریدئیے۔ اپنے احباب کو بھی ترغیب دلا کر اس کار خیر میں ہاتھ بٹائیے۔ اپنے مقامی اخبار فروش سے الجمعیۃ ہی کیلئے اصرار کیجئے۔ اگر آپ کے ہاں الجمعیۃ کی ایجنسی نہیں ہے تو مقامی ایجنٹ کے ذریعہ ایجنسی جاری کرائیے یا براہ راست دفتر کو مطلع فرما کر بذریعہ ڈاک اپنا اخبار جاری کرائیے۔

خریداروں کے لئے شرح چندہ

روزنامہ	صرف ہفتہ وار ایڈیشن
سالانہ ... ... ۴۸/- روپے	۸/۰ روپے
ششماہی ... ... ۲۴/- "	

جنرل منیجر الجمعیۃ دہلی ۶

علم کو وسیلۂ معاش نہ بناؤ بلکہ مقصدِ حیات سمجھو!

مولانا ابوالکلام آزاد کا طلباءِ دارالعلوم سے خطاب

(دیوبند ۱۹۵۵ء)

طلباءِ عزیز! تم نے اپنے اپنے گھروں کو چھوڑا اور اعزا و اقارب کو چھوڑا، ہندوستان میں دوسرے طریقِ تعلیم بھی رائج ہیں۔ لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں، تم نے اُن سب کو چھوڑا ہے اور یہاں آئے تاکہ علومِ دینیہ کی تکمیل کرو، بہت اچھا ارادہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ

یہ علم جس کو آپ حاصل کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں یہ وسیلہ ہے یا مقصد ہے؟

اگر تمہارے دماغ نے اس کو صاف نہیں کیا — تو میں تم کو متنبہ کردوں گا کہ تم صحیح کام نہیں کررہے ہو۔

عزیزانِ ملت: یاد رکھئے، دنیا نے علم کو ہمیشہ وسیلہ سمجھا ہے مگر مسلمانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے علم کو کبھی وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ مقصد سمجھا — ان تمام یُونیورسٹیوں میں جو ہندوستان میں چوبیس سے زیادہ ہیں اور ان کالجوں میں جو ہر شہر و ضلع میں ہیں اور ان اسکولوں میں جن کے دامن دیہات تک پھیلے ہوئے ہیں، ان میں جو تعلیم ہوتی ہے اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے مقصد نہیں سمجھا جاتا — کیوں کہ ان میں صرف اس لئے تعلیم دلائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں، اُونچے عہدے حاصل ہوسکیں۔ مگر تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ

علمِ دین وسیلہ نہیں — بلکہ مقصد ہے

اس کو کسی وسیلہ کے لئے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے (طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ الحدیث)

مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے وسیلہ کے لئے نہیں سیکھا مسلمانوں نے کبھی بھی علم کو اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معیشت حاصل کریں گے یا کسی سرکاری منصب پر فائز ہوں گے۔ مسلمانوں نے ذریعہ معیشت کسی اور چیز کو بنایا اور علم کو صرف علم کے لئے سیکھا (اور اسی کو اپنا مقصد بنایا))

حضرت ابوحنیفہؒ جن کی فقہ پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں، وہ بزاز تھے، انھوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعۂ معیشت نہیں بنایا بلکہ ذریعۂ معیشت پارچہ فروشی تھا — حضرت امام معروف کرخی موچی تھے۔ آج تم ان پیشوں کو سُننے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے۔

مگر جن امام کرخی کے احترام کے لئے تمہارے دلوں کے دریچے کھُل جاتے ہیں وہ کرخ کے بازار میں نکل جاتے تھے اور راستہ چلنے والوں میں سے کسی کا جوتا ٹوٹا ہوتا تھا تو اُسی کو سی دیا کرتے تھے اور اس کی اجرت سے اپنی ضروریات پُوری کرلیا کرتے تھے۔

شمس الائمہ کا نام بھی حلوائی پڑگیا تھا ایک طرف خطاب شمس الائمہ اور دوسری طرف حلوائی — یعنی اتنا بڑا عالم حلوہ فروش بنا ہوا تھا۔

اسی طرح اسلام کے مشہور علماء نے علم دین کے چشمے بہائے مگر کبھی علم دین کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا، بلکہ وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے رہے۔ زخارفِ دنیا کیلئے نہیں! وہ اس کو فریضۂ مذہبی سمجھتے تھے۔ ان کے لئے یہ گناہ تھا۔ کہ علم کو دنیا کے لئے حاصل کیا جائے۔

اگر تم اس حقیقت کو سمجھ گئے ہو — تو گویا تم نے اپنی پوری زندگی کا پروگرام بنالیا۔

طلباءِ عزیز سے دوسری بات یہ کہنی ہے کہ وہ دین کی خدمت اور اشاعتِ دین کو اپنا فریضہ سمجھیں۔ وہ اس کو کاروباری متاع سمجھ کر خرید و فروخت کے لئے کوئی بازار تلاش نہ کریں آپ کے اسلاف نے علم کو کبھی بھی سرمایۂ فروخت نہیں سمجھا ان کا یہی عقیدہ رہا اور اسی عقیدہ کے طور پر ان کے تمام اعمال دائر سائر رہے کہ علم جوہر انسانیت ہے، فریضۂ انسانی ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ علم کی آواز کو ہر ایک کان تک پہونچائے، علم اور علم دین کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی تہی مائیگی نہیں ہوسکتی کہ علم کو کسبِ دنیا کے لئے ایک سرمایہ سمجھا جائے۔

آپ عنقریب اس درس گاہ سے دستارِ فضیلت حاصل کریں گے اس وقت آپ ایک عالم دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہوں گے، دین و ملت کی ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر ہوں گی، اس وقت آپ کا پختہ عقیدہ اور آپ کا نصب العین اشاعتِ علم ہونا چاہئے علم دین کی خدمت کو اپنا فرض سمجھیں اور اس فرض کو فرض کی حیثیت سے ادا کریں، ہرگز ایسا نہ ہو کہ علم کو آپ متاع اور وسیلہ سمجھنے لگیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی توفیق بخشے۔

ہم سے راز کھلا تیری دل آزاری کا
نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

شہنشاہِ علم و دانش

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سرو سامان نہ کرسکا غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی!

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا ہے مذہب۔ علوم و فنون۔ ادب و انشاء۔ شاعری کی کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار راہیں مبدأ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو۔ بجز یکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کردیتی ہیں۔ لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اُسی نے شاید سرو سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا، میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کردیا گیا" —————— (امام الہندؒ)

مولانا آزاد — غالب کی زبان میں

از نتیجۂ فکر جناب مرزا نذیر حسین صاحب نذیر ناظم کتب خانہ صدر انجمن مسلمانان بنگلور

یہ نظم ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کی شام کو بنگلور مسلم ہال کے جلسہ تعزیت میں پڑھی گئی جو بہت پسند کی گئی

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزادیٔ وطن کا عجب دل میں درد تھا　　بے شک تو بساطِ سیاست کی نرد تھا
رزم ستمانِ دہر کا اس رہ میں سرد تھا　　دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

بر جانِ الہلال گہن رونما ہوا　　گر البلاغ موردِ ظلم و جفا ہوا
میں کیا کہوں کہ کیا نہ ہوا اور کیا ہوا　　تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

رنگ آئے دن چمن میں نیا بھر رہا تھا تو　　تزئینِ آشیاں کے لئے مر رہا تھا تو
صیاد کے کلیجے پہ سل دھر رہا تھا تو　　تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا تو
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تیغِ قلم نے کھول دیا حریت کا باب　　حلالِ مشکلات تھی اللہ کی کتاب
ابرِ کرم نے دی وہ نہالوں کو آب و تاب　　دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جوشِ محاربت میں جوانی گذر گئی　　جب جنگِ حریت سے فراغت ذرا ہوئی
پیری میں حق رسی نے معارف کی باگ لی　　جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وُہی دل میں درد تھا

چھٹنے میں قید سے کبھی عجلت نہ کر سکے　　بی بی کی وقتِ نزع زیارت نہ کر سکے
حاد ہوگئی جنازے میں شرکت نہ کر سکے　　احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

پُر درد انتہا بڑی اس داستاں کی ہے　　تشویق روحِ پاک کو سیرِ جناں کی ہے
خانت شقیم محسن ہندوستاں کی ہے　　یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

برپا ابو الکلام کی ہے بزمِ غم نذیر　　چھایا ہوا دلوں پہ ہے ابرِ الم نذیر
آہ و بکا کا شور ہے آنکھیں ہیں نم نذیر　　تاریخ انتقال کی کردے رقم نذیر
شیدائے راہِ حق عجب آزاد مرد تھا

۱۳ ھ ۷۷

مولانا ابوالکلام آزاد انشاء و ادب کے میدان میں

(از جناب قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم)

ایک ادیب کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبیت کا مطالعہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مولانا کے علم و فضل کی انفرادیت اُن کے ادب پر اس قدر چھا گئی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اُردو زبان کے صاحب طرز ادیبوں میں ہم آسانی کے ساتھ غالب۔ محمد حسین آزاد۔ سر سید احمد خاں اور چند ایسے صاحب طرز ادیبوں کی ادبیات کا تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن مولانا کی شخصیت ان کے ادب سے اس قدر وابستہ ہے کہ انفرادیت سے جُدا کر کے اُن کے ادب کا مطالعہ کرنا ایک بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ خاص طور پر مولانا کے فکر و نظر کا انداز اُن کی تحریر کی بلاغت اور فصاحت میں ان کی انفرادیت کو اس قدر نمایاں کرتا ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ اُن کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا جو اُن کے پیش رو ادیبوں کے طرز نگارش سے ملتا جلتا ہو۔ غالب ہی تنہا ایک شخص ایسا تھا جس نے اپنی نثر اور نظم کا انداز اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا تھا۔ کبھی کوئی ادیب اس کی تقلید نہ کر سکا لیکن مولانا غالب کی اس خصوصیت سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کو اپنی بے مثل شخصیت کے قدرتی سانچے میں اس طرح ڈھال دیا کہ بہت سے اہل قلم اس طرزِ تحریر کو اپنانے کی کوشش کر کے ہار گئے۔ لفظوں کی قوت اور جذبات کی بے پناہ روانی کے ساتھ مولانا کا طرز تحریر ایک لطیف آرٹ بن گیا ہے۔ مجھے مولانا کی محترم شخصیت اور اُن کے مخصوص طرز تحریر کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر مولانا اتنے بڑے انشا پرداز اور ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے مصور یا ماہر موسیقی یا شاعر ہوتے۔ اُن کی رومانویت کو اگر ایک طرف مذہب کے تقدس اور دوسری طرف سیاست کی سنجیدگی نے پابند نہ کر لیا ہوتا تو اُن کے قلم کا یہ آبشار جو آزاد ہندوستان کے دورِ جدید کا نقیب ہوا۔ ہمیں وجدانیت اور رومانس کی پُر فضا وادیوں میں بہا لے جاتا۔

مولانا کا طرز تحریر اور اسلوب بیان اپنے اندر چند خصوصیات رکھتا ہے جو اُردو ادب میں بڑی حد تک صرف اُن کے لئے مخصوص ہیں جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا مولانا کی فطری انفرادیت سے اُن کا ادب بھی بھرپور ہے وہ کوئی ایسی بات قلم سے لکھ ہی نہیں سکتے جس کا انداز انشا پردازی کے عام اصول سے مماثلت رکھتا ہو وہ ایک پیش پا افتادہ بات کو بھی اسی طرح لکھیں گے جس طرح کبھی کسی نے نہ لکھا ہو اور اس کے ساتھ فصاحت اور بلاغت کا اشارہ و کنایہ اور قوت اظہار ان کے لفظوں کی معنویت بہت بھاری بھرکم اور دلوں اور دماغوں پر اثر کرنے والی بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات بہت سادہ حقیقتیں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔

اگر "الہلال" "البلاغ" "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی تحریروں کا ایک پیمانہ بنالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن کے قلم سے جو نقش و نگار بنتے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کی روح میں جو اپنے کو کبھی روحانیت کبھی فلسفہ اور کبھی طنز و مزاح اور کبھی اذیت نواز غمگینی کے پیرائے میں ظاہر کرتی ہے اگر مولانا کے علمی انداز بیان اور ادبی اسلوب کا تجزیہ کیا جا سکے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کے افکار کا بہاؤ ایک صحرائی چشمہ کی طرح آزاد ہے۔ جب وہ بہتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس چشمہ پر نہ تو کوئی پل باندھا جا سکتا ہے نہ اس کے پانی پر ملاحوں کی کشتیاں تیرتی ہیں اور نہ اُس کا پانی نہروں اور نالیوں کے خس و خاشاک سے آلودہ ہو سکتا ہے۔

یہ چشمہ ایک خاموش وادی کے آغوش میں جو مولانا کی فطرت ہے بہتا چلا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مولانا کی دوسری تحریروں پر غبار خاطر قابل ترجیح ہے جن کے مکتوبات غالباً اس لحاظ سے لکھے گئے تھے کہ وہ کبھی شائع نہ ہوں گے اور اس لئے ان مکتوبات میں مولانا نے اپنے افکار کے بہت سے گوشے بے تکلف ظاہر کر دیئے ہیں۔

مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناظرین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا نے "غبار خاطر" میں اپنے ادب کی فطرت کے بعض حقائق کو بے تکلف بے نقاب کر دیا ہے۔ وہ اپنے ادب کی اشاعت کے لئے "انانیتی ادب" کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں ایک مکتوب میں ایسے اہل قلم کی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"ایسے افراد اپنے "میں" کا جوش کسی طرح دبا نہیں سکتے ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور اُن کا سکون بھی پُرشور ہوتا ہے"۔

ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اُس میں قصداً بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے خصوصاً افراد کو معیار نظر سے دور رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کی عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین انہیں نہیں پکڑ سکتے زمانے کو اُن کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" "میں" بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" ان کی ہر "وہ" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔

اس آئینے میں مولانا کی نفسیات کا جو عکس نظر آتا ہے اس سے اُن کے ادب کو ناپنے اور تولنے کے بہت سے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں۔ بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں اور بہت سے دھندلے نقوش اُبھر آتے ہیں۔ زندگی کے فلسفہ کو مولانا نے خود اپنی زندگی کے بعض گوشے بے پردہ کر کے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"انسان کا اصلی عیش دماغ کا ہے جسم کا نہیں"۔

غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں اگر یہ پردہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں بلکہ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے"۔

اپنی سیاسی زندگی کے متعلق ایک جگہ بہت بلیغ فلسفیانہ انداز میں فرماتے ہیں:۔

"طبیعت کی افتاد نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بیکار ہو گئے لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند رہے اور منت گذار ہونے لگتا ہے چونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے وہ میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے میں اگر عوام کا رجوع اور ہجوم گوارا کرتا ہوں تو میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی اور تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا

سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔"

ایک اور مقام پر زندگی کے فلسفے کو اپنی فطرت کے آئینے میں اس طرح نمایاں کرتے ہیں :۔

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا کوئی مضائقہ نہیں، وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں اسے سجاتا ہوں اور اس کی سیر اور نظارے میں محو رہتا ہوں۔"

مولانا کے ادبی افکار کا ایک نیا پہلو "غبار خاطر" میں نظر آیا جو ان کے مطالعہ کی گہرائی اور قوت کا آئینہ دار ہے۔ غبار خاطر کے صفحات پر مولانا نے اپنے خاص انداز میں چڑیا چڑے کی ایک کہانی لکھی ہے جس میں انھوں نے مطالعۂ فطرت کے جواہر پارے بکھیر دیئے ہیں۔ کہنے کو تو آپ اسے چڑے چڑیا کی کہانی کہہ لیجئے لیکن حقیقت میں مولانا نے اس پردے میں جو فلسفۂ زندگی بیان کیا ہے وہ حسن بیان اور مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ تخلیق کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اس کہانی کی چند سطریں مختصراً پیش کرتا ہوں۔

"پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ان کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انھیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موتی (یہ نام مولانا نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنے کمرے کی ایک چڑیا کا رکھ دیا تھا) کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں کہ گھونسلے سے اڑتی ہوئی اتری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑنے لگتی ... موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر لاتی اسے کھلا دیتی وہ بچوں چوں کی مدھم آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود آنکھیں بند کئے پڑا رہتا ..... میرا خیال تھا کہ اب یہ بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرے کے اندر دور تک چلی گئی تھی یہ اس پر جا کر کھڑا ہو گیا اور اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا پھر گرے ہوئے پروں کو سیکڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوتی کی طرح فضا میں اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا ... . دراصل یہ کچھ نہ تھا زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشہ تھا۔

چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استطاعت ابھر چکی تھی، جب تک وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا ماں بار بار اشارے کرتی تھی ..... لیکن جوں ہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرندہ ہوں اچانک قلب بے جان کی ہر چیز جاندار بن گئی چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک بجلی سی تڑپ نے پر بال کو ملا کر اچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے بسی کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے۔"

مولانا نے اس کہانی کے انداز میں سرگزشت کا سارا فلسفہ بیان کر دیا اور اپنے مطالعہ کی گہرائی سے چڑیا چڑے کی کہانی میں زندگی کی بے پناہ حقیقتیں ظاہر کر دی ہیں۔

مولانا کے ادب کا ایک اور پہلو طنز و مزاح ہے جو ایک شمشیر بے نیام ہے" الہلال" میں اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ مولانا کے ادب کی قوس و قزح میں یہ رنگ بھی بہت دلنواز ہے اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ذہانت بہت تیزی سے ہر شخص یا ہر چیز کی تضحیک کا پہلو دیکھ لیتی ہے۔ اس قسم کے نظاروں کے زیادہ نمونے "غبار خاطر" ہی میں ملتے ہیں۔ مثلاً اپنی قید کے ساتھی ڈاکٹر سید محمود کے مشاغل میں مزاح اور تفنن کا پہلو دیکھتے ہیں اور اپنے ایک مکتوب میں بے ساختہ اس کو اجاگر کر دیتے ہیں :۔

"(ڈاکٹر صاحب) روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیکر نکل جاتے اور صحن میں جا...... ..... کھڑے ہوتے اور پھر جہاں تک حلق کام دیتا آآ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا کر پھینکے رہتے۔ یہ صلائے عام مینائوں کو تو ملتفت نہ کر سکی البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم کر دیا۔ بہر حال محمود صاحب آآ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے یہ دریوزہ گران کونہ آستین فوراً بڑھتے اندر دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔ محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی بجتی رہتی تھی اب جو دسترخوان کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک لوگوں نے صبر کیا آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دست کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجئے ورنہ ان ترکان یغما کی ترک تازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن و چین سے رہنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر ملی ہے اگر فیض کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ دکن کے تمام کوّے احمد نگر پر حملہ بول دیں۔"

مولانا کے مزاج کی یہ خصوصیت ہے کہ کہیں عامیانہ لہجہ یا بدمزاقی کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ طنز میں بھی مولانا کے قلم کی نوک کتنی ہی باریک ہو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ زہریلی یا تعصب و عناد سے آلودہ ہے۔ طنز کے پیرائے میں مولانا کے مشہور مضامین میں سے ایک وہ ہے جو "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے متعلق الہلال میں لکھا گیا تھا مولانا کے طنز کا یہ رنگ چند ہی مضامین تک محدود رہا اور سنہ تیرہ چودہ عیسوی کے بعد اس رنگ کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں یہ جو کچھ سرمایہ مولانا کے قلم نے جمع کیا ہے وہ معیاری ہے، باقی رہنے والا اور سدا بہار ہے۔ صدیوں بعد بھی مولانا کے فکر و نظر کے شاہکار اپنے مقام پر باقی رہیں گے اور ہر عہد کی ادبیات کا فاضل جب ہندوستان کے ادب کا تحقیقاتی مطالعہ کرے گا تو یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی اور سیاسی اور تہذیبی جدوجہد میں مولانا کے ادب نے جو حصہ لیا ہے اسے نظر انداز کر سکے۔

قطعہ تاریخ وفات

گئے آزاد بعد از شیخ اکبر نہ ہو پھر قلب کیوں مضطر پہ مضطر
مسیحی اور ہجری سال سنئے الم کا سن ہے تیرہ سو ستتر
۱۹ ء ۵۸

(مولانا عبدالواحد۔ دفتر محاسبی دارالعلوم دیوبند)

سال رحلت لکھ نسیم دہلوی
خلد میں ہے آفتاب علم آج
۱۳ ھ ۷۷

(مولانا محمد ادریس نسیم دہلوی)

اردو اسلوبِ نگارش محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک

از محمد وارث کامل

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریزاں رہا اور شیوۂ تقلید و تزویرِ خام سے پرہیز! جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی اپنی راہ خود ہی نکالی، اور دوسروں کے لئے اپنا نقشِ قدم راہنما چھوڑا۔"



اُردو ادب جن اربابِ قلم کی ذہنی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ اُن میں سرِ فہرست شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد (محمد حسین آزاد) کے نام آتے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے یہاد بار ایک ہی دور کی پیداوار ہیں غالب، ذوق، مومن، شیفتہ اور ظفر کی شعری نغمہ سنجیوں کے دن بیتے تو اُردو نثر کے میدان میں اشہبِ خامہ نے جولانیاں دکھائیں۔ اور اس زناٹے کی جولانیاں کہ کچھ عرصے کے لئے شاعری کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ شبلی نے قریب قریب ہر موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

حالی، ادب، تنقید اور سیرت نگاری کی حدود سے آگے نہیں بڑھے، نذیر احمد نے مذہب، اخلاق اور پند و نصائح کے لئے اپنی تحریریں وقف کر دیں۔ محمد حسین آزاد کی تحریریں بانکپن تھا اُن کے قلم نے شعر و ادب کی نثر میں عکاسی کی، ان شموسِ اربعہ کی تحریریں آج بھی ہم سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ جب ہم ان تحریروں پر نظر ڈالنے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے شہ پاروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم آسمان کی بلندیوں سے زمین کی شادابیوں کا نظارہ کر رہے ہیں، شبلی حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی تحریروں سے ہم ذیل میں ایسے اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے ان کے ادبی محاسن کے نقوش اُجاگر ہو سکیں!

شبلی کا اسلوبِ نگارش

"چمنستانِ دہر میں بارہا رُوح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اِس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازیِ مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں، شہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔ (سیرۃ النبی حصہ ۱ صفحہ ۱۲۳)

مولانا حالی کا اسلوبِ تحریر

"اے میری بلبلِ ہزار داستان اے میری طوطیِ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان اے میری وکیل۔ اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور ہر پھل میں ایک نیا مزہ ہے کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا زندہ نہ جادو کا اُتار کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی۔ اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی۔ اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔" (مضامین حالی صفحہ ۲۵۱)

مولانا نذیر احمد کا اندازِ رقم

"اگر تو ہم کو سمیع قلب سے حاضر و ناظر سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھ کو کیوں کر جسارت ہوتی تھی؟ تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا؟ کبھی کھولتے پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا؟ کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو تو نے مٹھی میں نہیں لے لیا؟ مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا۔ ضرور ہے کہ یا تو تجھ کو یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتشِ دوزخ ہے یا اگر یقین تھا تو اس کو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ، جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھ کو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا کیا تو نے اس کو ہمیشہ اپنے حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا؟ جو تکلیف تجھ کو دنیا میں پہونچی اگرچہ تو اپنے ہی ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر تا تھا مگر کیا تو اس کا الزام ہماری ذاتِ مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا۔؟

اے احسان فراموش! ہزاروں لاکھوں احسان میں نے تجھ پر کئے اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا"

(توبۃ النصوح صفحہ ۱۶، ۱۵)

محمد حسین آزاد کا اندازِ بیان

"اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا۔ کبوتروں میں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔ نوجوانی تاجِ شاہانہ لے کر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحبِ تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے، لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی، طلوعِ جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے۔ اور نمازِ عید کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالبِ علمی کی تحقیقات اور اہلِ علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا۔ اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری، شکاری بھی برابر جاری تھی، گروہِ علم کا عاشق، علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کیلئے یکساں تھے۔

۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقیِ سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔"

(دربارِ اکبری ص ۱۲۸/۱۲۹)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی روانیِ فکر و قلم

سرمدِ مجذوب

" علماء نے سرمد سے کلمہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لاالٰہ پڑھا کہ جملۂ نفی ہے اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ مرتبۂ اثبات تک نہیں پہونچا۔ اگر الا اللہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا، اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟ علماء نے کہا۔ ایسا کہنا کفرِ صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مستحقِ قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سنائی جائیں۔ وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو، یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہوکر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے۔ اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں دیوارِ کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں، اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں ؎

کشورے ہست کہ دردے رَوَد از کفرِ سُخن
ہمہ جا گفت دشنو برسرِ ایماں نہ رُوَد

(مقدمہ رباعیاتِ سرمد)

خونِ شہادت کی پکار

" بس میں آج اُن آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں۔ مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لئے نم آلود ہیں۔ میں اُن دلوں کی سرگزشت نہیں سناتا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہوں۔ مجھے اُن دلوں کی تلاش ہے جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے لئے مضطرب ہیں۔ مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجیہائے ماضی کا ادعا ہے۔ آہ! میں تو ان زبانوں کے لئے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہوں۔ اور ان کا دھواں آج بھی کائناتِ نشاط دانی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر سکتا ہے۔ جس کو عیش و عشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ نصیب نہیں! ؎

نہ داغِ تازہ می خارد نہ زخمِ کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم "

(شہادتِ حسینؓ)

افتادِ طبع

" جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور رشتۂ تقلید و تَدوُّغِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی اپنی راہ خود ہی نکالی۔ اور دوسروں کے لئے اپنا نقشِ قدم راہنما چھوڑا۔"

(تذکرہ)

نظربندی کے ایام

" کارسازِ قدرت کی بھی کچھ عجیب کرشمہ سازیاں ہیں۔ ایک مدت سے جس فروغِ خاطر اور آزادیِ فکر و عمل کو طبیعت ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر اشتغال و مشاغل کی کثرت سے نہیں ملتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی وجہ سے صحتِ جسمانی نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اب ملی بھی تو کن مجلسوں میں؟ دنیا نے جلاوطنی اور نظربندی کی خبر سنی اور دل نے خلوت گزینی و گوشہ گیری کی دولت و سعادت پائی۔ علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شب ہائے تمنا اور روز ہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں پائیں اور چشم و گوش نے لطفِ دید و ذوقِ سماع کی جو دولتیں پائیں نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے نہ سامعہ استعدادِ سماع رکھتا ہے البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت ان دس راتوں میں آجاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کر جاتے۔

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

قولِ فیصل

" عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں۔ جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے کٹہرے میں کھڑے کئے گئے، ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے۔ جس کو صرف اس لئے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا، ہم کو اس میں فلورنس کے فداکارِ حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے۔ جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لئے نہ جھٹلا سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔"

(عدالتی بیان)

خطبۂ صدارت سے

" آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جارہا ہے۔ کیا حقیقت اور معقولیت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہوجانا چاہئے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

(کانگریس کے صدر کی حیثیت سے)

سراجِ منیر

ہمارے پاس تو سراجِ منیر کی بخشی ہوئی ایک روشنی ہے اسے ہٹا دیجئے تو بالکل اندھے ہوجائیں گے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں، اور تمام آوازوں سے ہمارے کان بہرے ہیں.... ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں ÷ ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

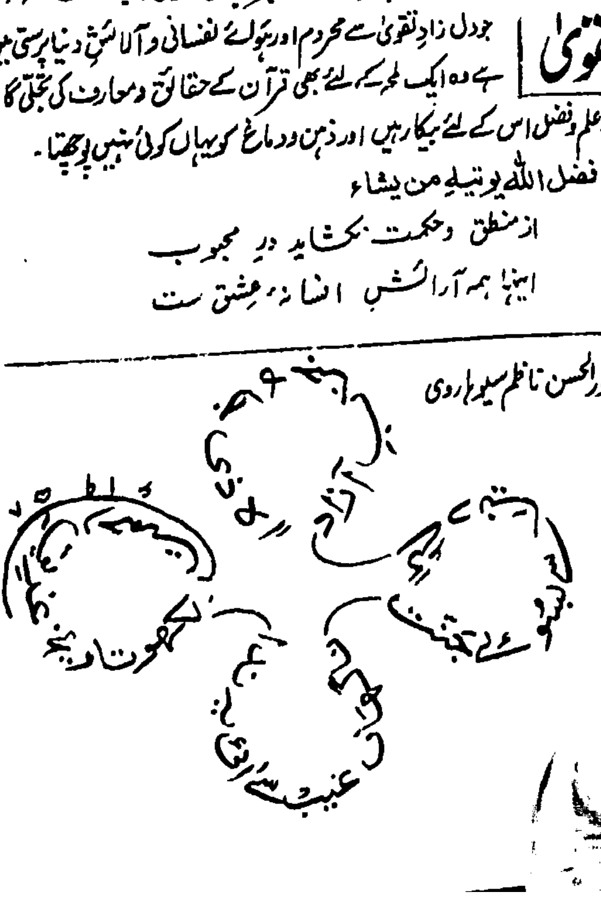
زادِ تقویٰ

جو دل زادِ تقویٰ سے محروم اور ہوائے نفسانی و آلائشِ دنیا پرستی میں گرفتار ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن کے حقائق و معارف کی تجلی گاہ نہیں بن سکتا۔ علم و فضل اس کے لئے بیکار ہیں اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء

از منطق و حکمت نکشاید درِ مجبوب
اینہا ہمہ آرائشِ افسانۂ عشق ست

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی



ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

(از مولانا غلام رسول مہر)

۱۹۱۲ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخط کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا لیکن دوستوں پر اعتماد تھا، اس لئے تذبذب کے بغیر دستخط کر دیئے، دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں، اوپر جلی حروف میں "مَنْ اَنصاری اِلَی اللّٰہ" مرقوم ہے، اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ پھر نام، ولدیت، عمر اور پتے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف۔ اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ جس سے نتیجۂ امتحان تک انتظار کا وقت بخوبی کٹ سکے، انھوں نے کہا کہ اخبار جاری کرا لو، اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کر دیئے، ایک روزانہ "زمیندار"، دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ "الہلال" کا چندہ اس زمانہ میں آٹھ روپیہ سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی۔ لیکن نہ اس وقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی، نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس طرح کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی۔ پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "ہلال احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا ثواب میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ لپیٹ کر رکھ دیا۔ بعد میں کسی حصہ سے استفادہ کا سوال باقی نہیں رہا۔ آٹھویں دن پرچہ پہنچتا تھا۔ میں اسے کھولے اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے فرائض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا۔ اس لئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت سے وابستہ ہو رہا ہوں، اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی، پھر تمام پرچوں کو اول سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر افسوس کیا کہ پہلے ہی دن ان کا باقاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا

بے غمِ عشقِ تو صد حیف عمرے کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتارِ غمت می بودم

میں کالج میں رہتا تھا جہاں ہفتے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی۔ "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکیے کی پیشوائی کے لئے جوش اشتیاق میں میل ڈیڑھ میل نکل جاتا، جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ جو عزیز اور دوست ملنے کے لئے آتے ان کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ الہلال سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی۔ اسی وقت سے مولانا ابوالکلام سے عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں وابستگی اور انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں، لیکن یہ رشتہ استوار سے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل قریب نظر آتی ہے اس تعلق کو زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر بیگنیز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انھیں دیکھا، اپنے ذہن میں جو تصور قائم کر رکھا تھا اس سے بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قد و قامت، جسم نہایت دبلا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی مونچھ صاف، کمبل اوڑھے پلنگ پر لیٹے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا آج شام کے چار بجے ملو۔ وقت مقررہ پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذبات عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی۔ گویا یہ نقشہ پیش تھا

آزردہ زمن حالِ شبِ وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

مولانا نے پوچھا کہ "بی۔ اے کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟" میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کروں گا تاکہ ملک و ملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا "مشغلہ اچھا ہے، تمھیں اندازہ ہے کہ اس منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسر آ جائے تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم از کم دو سال کا انتظار تو ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا ہوگا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ لئے بیٹھے ہو اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا۔" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

الہلال بند ہو چکا تھا۔ مولانا نے البلاغ نکالا۔ تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں دارالارشاد قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا الہلال کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے لیکن دارالارشاد کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انھیں بنگال کی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا، وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی البلاغ بھی بند ہو گیا۔ اور یہ دارالارشاد بھی۔ اس اثنا میں درس ابتدائی تین پاروں تک ہو چکا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذات بابرکات سے استفادہ کی جو امنگیں موجزن تھیں وہ بھی مدفون ہو کر رہ گئیں۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہوگئے۔ میں اس زمانہ میں "زمیندار" سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی، اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضل اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ حسن نیت کی بنا پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانہ حیثیت کے مالک تھے کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انھوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا، جو نصف صدی سے اس وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتاب جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے، وہ ان اصحاب میں سے تھے جنھیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے، وہ تحریر و تقریر دونوں اقلیموں کے تاجدار تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانہ میں بھی مشہور فرماں روایانِ علم و فضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں۔ جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالیؔ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہونچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ سال کے ہوں گے سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں، خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہوگئے۔ الہلال کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالیؔ کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا، نیز فرمایا کہ الہلال آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی شبلی ۱۹۰۵ء میں بمبئی گئے۔ تو اس زمانہ میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہونچے۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابو الکلام آزاد یہی ہیں۔ جب شک کی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر علم و فضل کے لئے باعث حیرت و استعجاب بن گیا تھا۔ اس کی شان و عظمت کے متعلق میں کج مج زبان کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ ان کی محسوس و مشہود مثالیں "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں "تذکرہ" رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں لکھا گیا۔ جب مولانا کے پاس کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ "غبار خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعہ سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں۔ "غبار خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبار خاطر" میں درج کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا۔ منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامراء" کی فلاں جلد کے فلاں صفحہ پر فلاں طرف اوپر کی سطر میں موجود ہے۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامراء" دیکھی تھی۔ اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں۔"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ طبع کے درخشاں ترین جوہر ہیں۔ انھوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی۔ ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی صحت کو نقصان پہونچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہوگئے۔ انھوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انھیں اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے وہ سب تلاشیوں میں تلف ہوگئے۔ لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلہ میں ایک نہایت دشوار و دلگداز مرحلۂ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہونچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہو تو میں اسے فوراً بمبئی پہونچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

"جوں ہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی....... میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا۔ لیکن شاید باطن کامیاب نہ ہو سکا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن....... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحب عزیمت رفیقۂ حیات اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئیں، جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعہ میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنھیں بخشندۂ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزانی ہوئی ہوں

مبادا کسی کو خیال ہو کہ مولانا اس افتاد پر انتہائی اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے، یہ سچ ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا، صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجباتِ غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ حزن پر قابو پالے اور انھیں مناسب حدود سے تجاوز کرنے کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساسات سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا طبعی احساسات سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقۂ حیات کی خطرناک حالت کا خط ملتے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی، خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعثِ تسکینِ قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انھیں بھی آرزو ہوگی کہ پاس رہتے خود اپنی اہلیہ کا علاج کریں اور تا بہ حد امکان اس کا دکھ مٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان

کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کرسکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انھوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا، تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کرلیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں، جب پے بہ پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحب عزیمت انسان کی طرح انھیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا، ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا

"ہر وقت اسے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا، تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؎

ہاں رو عشق ہست کہ رفتن ندارد بازگشت
جرم را اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست

دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہئے۔ لیکن جب اتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہوجائے۔ لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہئے۔"

مولانا کی ذات گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں، بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری رہی۔ بلاشبہ ان کے قلب پر بھی رنج و الم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہے۔ لیکن انھوں نے مقام صبر کے واجبات جس شان عزیمت سے ادا کئے ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں، موجبات غم سے متاثر ہونا ہر قلب سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پالینا صرف صابرین مصابرین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا، میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہ عمل طے کرچکے تھے اس پر مدت العمر بے خوف لومۃ لائم قائم رہے بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویداران عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انھیں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کرلئے لیکن مولانا کے نزدیک صحیح مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش سولہ سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ ... وہ وسائل معاش بھی بالکل تباہ ہوگئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کرلئے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دلعزیزی کی متاع عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کرچکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے، لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرمجوشیوں کا اظہار ہوتا رہا وہ کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوسکا۔ اور یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی انھیں اس وقت حاصل تھی، جب ان کی عمر ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھی خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا لاؤ بے غرضانہ تھی یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنھیں مختلف گروہوں نے صاحب اختیار و اقتدار دیکھ کر فتح یاب مقاصد کا ذریعہ سمجھ لیا ہو۔ لیکن انھیں پیش نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دلعزیزی کی متاع عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے یہ قربانیاں ذکر و بیان میں بہت دل پسند معلوم ہوں، لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آساں بر صف آتش زدن
می نماید گرچہ از پروانہ خوش

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرت ثانیہ بنی رہی۔ وہ ہمیشہ اول وقت اٹھتے۔ گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر تھے

عبادت سحری را مکن نظیری کم
کہ ہرچہ کرد دعا ہائے صبح گاہی کرد

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور آخر تک اسی پر قائم رہے ــــ وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی تھے۔ لطیف چینی چائے وقتاً فوقتاً مزے سے پیتے ــــ اس کے دلکش تذکرے "غبار خاطر" میں جابجا موجود ہیں، انھوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارہ نہیں کیا، حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ و نیاز بآسانی قبول نہیں کرتے تھے جنھیں انتہائی شفقت و نوازش سے انھوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا تھا۔ ایک مرتبہ انھیں عرق النساء کا عارضہ ہوا شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ میں ایسا نسخہ تجویز کردونگا کہ بفضل خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہوگا۔ میں نے حالات منگوائے، حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کردیا اور یہاں سے دوائیں بھیجدی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا حکیم صاحب کی رائے تھی کہ وہ دوائیں کچھ ... دنوں جاری رہنی چاہئیں (جواب میں) مولانا نے لکھا:۔

"مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں، اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہر منقی وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تو ضرور کروں گا ــــ مگر شرط یہ ہے کہ وہ دوا خانے کو حکم دے دیا کریں، تاکہ مجوزہ مرکبات وی پی پارسل کے ذریعہ بھیجتے رہیں۔ اس صورت میں شکرگذار ہوں گا اور انشراح خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں تو پھر میں نہ تو فراغ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا، نہ استرداد آجر کی حالت گوارا ہوسکے گی۔"

ایک مشہور عالم دین نے مولانا کی تفسیر فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کرلیا۔ ہر ادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی ضمناً یہ بھی لکھا تھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھجوا دوں۔ فرمایا کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔

"۱۹۱۸ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔"

پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں۔ انھوں نے مجھے لکھا:۔

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب "الہلال" نکالتا تھا۔ تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے۔ لیکن اب میرا حال دوسرا ہے کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں۔"

"اگر ایک مدعی اسلام میں صدق مقال نہیں، تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں، ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"

ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں شعلہ

اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا ت

آں بخت نہ داریم کہ ہم بزم تو باشیم ۔ ماد سرِ راہ تو د آہے زنگا ہے

انھوں نے جواب میں فرمایا کہ اس شعر کا بیان کیا موقع تھا۔

ایک حدیث قدسی ہے من تقرب الیّ شبراً تقربت الیہ ذراعاً (جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں) عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تعلق سے محروم نہ رہوں، اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا ع

ہزار بار بصد ہزار بار بیا

مضمون بہت طویل ہوگیا۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا، وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

زبان زکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست ۔ لبضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلاف عادت ان کے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے، فرماتے ہیں :۔

یہ افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

نادرا نہ بہ بازار جہان جنس وفا ۔ رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن، ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو۔ حتی کہ ہر دن اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔ لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا۔ اس نے سرو سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا۔ مگر اس کے حوالے کر دیا گیا ــــ"

جو کچھ فرمایا گیا ہے، نہ سخن گستری نہ تعلّی، بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا۔ تو انہی کی زبان سے کہتا ؎

سالہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن



فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

از مولانا آزاد

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدانِ جنگ کا رُخ کرتا ہے تو ڈھول و طبل کے غلغلے اور قرنا و چنگ کے ترانے خیر مقدم بجا لاتے ہیں، سر پر پرچم لہراتا ہے۔ چترِ شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اس کی طرف نگاہِ کرم سے دیکھنے نہیں دیتا۔ جاہ و جلال کا یہ دیوتا میدانِ جنگ میں ایک مجسمہ کی طرح کھڑا ہوتا ہے اور تمام فوج اس مرصع بُت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے۔ عظمت و جبروت کا یہ منظر دنیا کو بھی مرعوب کرتا ہے اور خود اس فاتح کا سر بھی بادۂ کبر و نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک پیغمبر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر سے نکلتا ہے تو (مخلصین و مومنین کی ایک جماعت ساتھ ہوتے ہوئے بھی) اپنا رفیقِ سفر صرف خدا کو بناتا ہے۔ اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل اللّٰھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر وکآبۃ المنقلب وسوء المنظر فی الاھل والمال - (نبی کریمؐ)

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ الحمد للہ الذی سخر لنا ھذا وہ سفر سے واپس لوٹتا ہے تو اپنے خدا کی حمد و ثنا کا ترانہ گاتا ہوا آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون ــــ پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلۂ تکبیر بلند کرتا ہے۔ نیچے اُترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح و تہلیل ہوتا ہے ــــــ فوج کو روانہ کرتا ہے تو اس کو نہ غرور و طاقت کی یاد دلاتا ہے نہ اُس کے جوش کو دو آتشہ کرتا ہے نہ پُرانی بہادریوں کے ذکر سے اس کے دلوں کو گرماتا ہے بلکہ اس کے دین اس کی امانت اور اُس کے اعمال و نتائج کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کرتا ہے۔ استودع اللہ دینکم و امانتکم وخواتیم اعمالکم ــــــ وہ منزل پر اُترتا ہے تو نہ شاہانہ خیمے نصب ہوتے ہیں نہ فرش و بساط سے زمین آراستہ ہوتی ہے۔ وہ خدا کا نام لیکر فرشِ زمین پر ہی لیٹ جاتا ہے۔ اور اپنی حفاظت کی خدمت خود زمین اور اس کے خالق کے سپرد کر دیتا ہے یا ارض ربی وربک اللہ اعوذ باللہ من شرک وشر ما فیک ومن شر ما یدب علیک ــــ وہ گھر واپس پہنچتا ہے تو سب سے پہلے مسجد کا رُخ کرتا اور دو رکعت نماز ادا کر کے سجدۂ شکر و رضا بجا لاتا ہے ــــ فتح و ظفر کی خبر آتی ہے تو اس کے سامنے نہ شادیانے بجتے ہیں نہ عیش و طرب کے ترانے گائے جاتے ہیں نہ کسی شاہانہ جشن کی تیاری ہوتی ہے۔ اس کی تمام مسرت و جشن ایک سجدۂ شکر ہوتا ہے ــــ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں شدید زخم لگتا ہے تو وہ طیش و غضب کا بگولہ بن جانے کی بجائے اپنے اللہ ہی سے رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے۔ رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون ــــ مختصر یہ کہ ایک فاتح میدانِ جنگ میں سرِ پُر غرور مگر ایک پیغمبر جبینِ نیاز ہوتا ہے۔ ایک بادشاہ جب زبانِ خود ستا ہوتا ہے، ان ہی لمحوں میں ایک پیغمبر زبانِ شکر گذار بن جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں ایک بادشاہ غیظ و غضب کا آتش کدہ مگر ایک داعیِ حق یہاں بھی رحم و کرم کا سرچشمہ ہوتا ہے

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ان دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہوتا ہے، بادشاہوں کے سرِ پُر غرور بار بار ٹھکرا دیئے گئے لیکن کسی داعیِ برحق کی جبینِ نیاز خاکِ مذلت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی زبانِ خود ستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی لیکن ایک داعیِ الٰہی کا نغمۂ حمد و شکر ہمیشہ دنیا کی فضاؤں میں گونجتا رہا۔ بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیئے گئے مگر انبیاء و رسل کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک کبھی روک نہ سکے۔

ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین - انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون

چند یادیں

(از مولانا عبدالماجد دریا بادی)

(بہ شکریہ صدق جدید)

سنہ ۱۹۰۸ء کا آخری زمانہ تھا۔ جب یہ نام اول اول نظر سے گذرا۔ الندوہ مرحوم کے ایک محترم مضمون نگار کی حیثیت سے۔ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ غالباً نویں درجہ کا، اور مرحوم اس وقت بھی تحریر میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے تھے۔ سن میں مجھ سے کل ۳، ۴ سال بڑے تھے۔ الندوہ مولانا شبلی نعمانی کی ادارت میں وقت کا ممتاز ترین ماہنامہ علمی اعتبار سے تھا، اس کی مضمون نگاری بجائے خود ایک اعلیٰ سند تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید شہادت کی ضرورت ہی نہ تھی ——— مولانا اس وقت تک "مولانا" نہ تھے، محض ابوالکلام آزاد تھے۔ ماہنامہ خدنگ نظر (لکھنؤ) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے اور شاید اپنا ہفتہ وار لسان الصدق (کلکتہ) بھی کچھ دن تک نکال چکے تھے۔ بہرحال الندوہ میں موضوع تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب المراۃ المسلمہ تھی، جسے مولانا نے عربی سے اردو میں اپنایا تھا اور اس میں جدید طبقہ کے جواب میں طبی، شرعی، ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں اور دونوں کی مساوات کا دعویٰ تمام تر غلط ہے۔ مضمون نگار کی طرف سے دل و دماغ میں عظمت پیدا کرنے کے لئے بس اسی قدر کافی تھا ——— ایک آدھ پرچہ میں بلند پایہ مصری رسالوں سے ماخوذ "علمی خبریں" بھی اسی قلم سے نکلیں۔ زور قلم اور جوش تحریر سے ایسا اندازہ یہ ہوا کہ شخصیت بھی بڑی ہی زوردار ہوگی، اور صورت کا نقشہ ذہن کے سامنے یہ جما کہ بڑے کلّے ٹھلے کے ہوں گے آواز سب پر غالب رہتی ہوگی۔ کسی کو اپنے سامنے بولنے نہ دیتے ہوں گے۔

ڈیڑھ سال اور گزرے۔ میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم تھا، کہ سردی کے موسم میں ایک سہ پہر کے وقت دو چار ساتھیوں سمیت کسی ضرورت سے اسٹیشن جانا ہوا، پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگریٹ پیتے برآمد ہوئے۔ گورے چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، جوان رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے، پوچھ گچھ شروع ہوئی، کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتے ہیں آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں ——— یہ زمانہ کوئی اخیر سنہ ۱۹۰۹ء کا ہوگا۔ مولانا وصہ ہوا الندوہ سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ کچھ دنوں امرتسر کے معروف و معزز سہ روزہ وکیل میں رہے تھے اور اور بھی رسالوں میں ان کا نام آنے لگا تھا ——— اصل صورت خیالی صورت سے بالکل مختلف نکلی اور کہیں زیادہ حسین و جاذب نظر۔

ملاقات اور ذاتی حصول نیاز کی نوبت اس کے بھی بعد آئی۔ سنہ غالباً ۱۹۱۰ء تھا اور "آزاد" اس وقت مولانا شبلی کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا اس وقت محلہ احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی کے اندر ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کا نام ان کی زبان پر صرف "آزاد" تھا، نہ مولوی، نہ مولانا، نہ محی الدین، نہ ابوالکلام، بلکہ صرف آزاد، زبان پر بھی یہی اور خطوط میں قلم پر بھی یہی ——— غیر معمولی ذہانت، خطابت، طراری، طلاقت لسانی کے قصے اسی زمانے سے سننے میں آنے لگے۔ مولانا شبلی کے ساتھ میں نے انھیں ہمیشہ باادب ہی پایا۔ تنہائی کی صحبتوں میں ممکن ہے کہ بے تکلفی زیادہ برتے ہوں، لیکن بہرحال اپنی شہادت تو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی چیزوں تک محدود رہے گی۔

اس کے بعد غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں الہلال افق کلکتہ سے طلوع ہوا۔ اور اب مولانا کا قیام کلکتہ میں مستقل ہو چکا تھا۔ اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی، صورت و سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جان دار۔ چھپائی، کاغذ، تصویریں سب کا معیار اعلیٰ۔ رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا۔ "احمد المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی"۔ یہ "المکنیٰ" کے صحیح تلفظ اور معنی کے لیے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی! اور "ایڈیٹر" کہاں! اس کی جگہ "مدیر مسئول"، "محرر خصوصی اور رئیس قلم تحریر" جریدہ کی جگہ "مجلّہ" ولایتی ڈاک کی جگہ "بریدِ فرنگ"، حیرت انگیز کی جگہ "محیر العقول"، قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان، ہر ہفتہ اس ادبی دہلی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے! ——— حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الٰہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو! سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔۔!

الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر "مولانا" ہو گئے اور شہرت کے پردوں سے اڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی اور مولانا کی خطابت کے جوہر بھی اسی وقت سے خوب چمکے۔ ہر جلسہ کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا، لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی۔ اور اس کی سیاست پر بین الملّی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی۔ بات بات پر آیات قرآنی سے استدلال و استناد۔ علمی، ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور ظرافت کا رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا، اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی۔ اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے، دیتے ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے، لکھنؤ آتے جاتے رہتے، قیام شروع میں مولانا شبلی کے ہاں رہتا (جو اب خود نئے بنے ہوئے امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر اٹھ آئے تھے اور الفاروق و سیرۃ النعمان سے کہیں زیادہ اب شعر العجم کے مصنف نظر آنے لگے تھے اور مولوی سے بڑھ کر غزل گو، شاعر اور نقاد کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے) پھر جب مولانا لکھنؤ سے منتقل ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ چلے گئے، تو بھوپال ہاؤس (جس کا اب وجود بھی باقی نہیں) لال باغ میں نواب صفی الدولہ حسام الملک علی حسن خان بھوپالی کے ہاں بھی ایک آدھ بار ٹھہرے اور اس کے بعد اپنے لئے مستقل مہمان خانہ حسین گنج کے سول اینڈ ملٹری ہوٹل (موجودہ برلنگٹن ہوٹل) کو بنا لیا تھا ——— الہلال کی دعوت سے اس وقت کے اس ملحد نیازمند کو اتفاق کیونکر ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ جب کوئی علمی رعب بھی دماغ پر مولانا شبلی کی طرح ان کا نہ تھا اور دل میں ان کی وقعت بجائے کسی عالم و فاضل کے محض ایک لسان اور پر جوش خطیب کی تھی، ادھر مولانا شبلی نے یہ کیا کہ میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) جو الندوہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ الہلال کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی تاب میں نہ لا سکا، اور طبیعت جو اس نوعمری کے جوش میں بحث و جدل کے لئے بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی۔ کچھ ہی روز بعد بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحب الہلال سے الجھ ہی پڑی دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا، جنھوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوا دیا، ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہونچتی۔

یہ سب کچھ تو اخباری صفحات پر ہوتا رہا۔ لیکن مولانا کا ظرف اور جوہر شرافت جو آگے چل کر بہت نمایاں ہوا اس وقت بھی بہرحال اتنا موجود تھا کہ اس نے کوئی اثر نجی تعلقات پر نہ پڑنے دیا۔ آپس کی خط و کتابت اسی طرح جاری رہی، جیسے پہلے تھی اور مولانا جوابات پابندی کے ساتھ اور دوستی

شفقت و محبت کے لہجہ میں بدستور دیتے رہے۔ لکھنؤ اب جب بھی آئے تو نان و نمک کے لئے ایک آدھ بار غریب خانہ کو بھی سرفراز کیا، اور جب اس کا موقع نہ نکل سکا، تو میں نے خود ہی ماحضر مولانا کے ہوٹل پر پہنچا دیا۔ میں اس وقت تک دریا بادی نہیں، لکھنوی ہی تھا ـــــ یہی زمانہ میں اور اب یہ ذکر جون ۱۹۱۳ء کا ہے ایم، اے کا امتحان دے چکنے کے بعد میرا جانا کلکتہ کا ہوا تو مولانا نے اصرار کر کے اپنے ہاں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرایا اور خوب خاطریں کر کے جہان نوازی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ ضمناً و تبعاً سہی۔ لیکن بہرحال یہ بات بھی اس منزل پر سن لینے کے قابل ہے کہ وہ وقت تھا جب الہلال کے اسٹاف میں بہترین اشخاص کا مجمع تھا، تین نام یاد رہ گئے ـــ حامد علی صدیقی۔ مولانا عبداللہ عمادی اور سب سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی ـــــ روزنامہ کے لئے نہیں، ایک ہفتہ وار کے لئے اتنا بڑا اور ایسا لکھا اسٹاف اردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کیوں نصیب ہوا ہوگا!

جن لوگوں نے مولانا کو بہ این سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری ۲۵، ۳۰ سال میں دیکھا ہے وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ ۱۳ء، ۱۴ء میں کیا تھے (اور اس سے بھی قبل یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں بلکہ آغاز جوانی کے سن میں وہ کیا تھے اسے تو سرے سے چھوڑ دیجئے) ذہانت و فطانت کا مجسمہ۔ شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں استاد، اسے چھیڑا، اسے بنایا، اس پر فقرہ چست کیا، اسے چٹکیوں میں اڑایا، لوگ تھامتے چلتے، سامنا کرتے گھبراتے، جھجکتے اور کنی کاٹ جاتے، ۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۴ء کا شروع، لکھنؤ میں کھانے پر بلانے کو تو بلا دیا۔ لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ ـــــ اپنے جوار میں ایک بڑے طرار، شوخ گفتار، طلق اللسان، خوش بیان، ادیب ظریف چودھری محمد علی، ردولوی ہوتے تھے۔ بقید ماضی نہیں، ماشاء اللہ اس وقت بھی ہیں) بس انھیں گھیر گھار کر لے آیا گیا، اور ہم تماشائیوں کو لطف مہذب و شستہ لطیفہ گوئی بذلہ سنجی اور برابر کی نوک جھونک کا آتا رہا ـــــ چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقہ ظرافت کی اصطلاح "بور" BORE چلائی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے بور مردے ست کم عقل کہ بے اراد دیگران را تکلف باشد۔ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ، تعریف کے لئے زبان بھی آپنے خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی!

باضابطہ تعلیم اور اصطلاحی تدریس تو مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی و حال کی طرح تو کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، لیکن خدا معلوم کتنے مختلف علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت مستحضر، طب ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات، جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی، بحث کا ہی نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے۔ اور تقریر بھی ایسی دلآویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا، اور غضب کی خوش دماغی ـــــ اور زبان پر عبور تو اور بھی حیرت انگیز تھا۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ جلسۂ ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے ـــــ فارسی شعر میں ان کا تبحر دیکھ کر گمان یہ گزرتا تھا کہ اساتذۂ فارسی کے دیوان کے دیوان اس شخص نے ازبر کر رکھے ہیں! ـــــ اور ۔۔۔ اردو کے لئے تو کہنا ہی تحصیل حاصل ہے، زبان اردو ہی تھی، پھر بھی اس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی دسترس اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، بڑے بڑے اہل

جامعیت کے معیار پر "فیل" ہی ثابت ہوتے ہیں، مستثنیٰ کسی حد تک بھی اگر کسی کی ذات رکھی جا سکتی ہے تو وہ ابوالکلام کی۔ اور یہ اردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخوں کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے۔ تاریخ اردو میں ان کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں، بلکہ بحیثیت صاحب طرز انشا پرداز کے ان کے نام کا باب، باب عالی شان بھی ہونا چاہئے، اردو کو انھوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس کی بات نہ پاسکا!

۱۹ء تھا۔ اور مولانا رانچی جیل میں نظر بند تھے۔ خیال آیا اور احساس پیدا ہوا کہ الہلال کے زمانہ سے جو شکر رنجی سی مولانا سے چلی آ رہی ہے، اسے بالکل دور ہو جانا چاہئے، معذرت کا خط ڈرتے ڈرتے لکھا، کہ دیکھئے جواب کیا آتا ہے۔ جواب جو آیا محض ضابطہ کا نہیں، شرافت اور عالی ظرفی کے کمال کا مظہر تھا۔ الہلال کی بندش خود مولانا کی اسیری اور نظر بندی اور البلاغ کی چند روزہ اشاعت کے بعد سے مولانا دوسرے تھے۔ اب ان کا شمار ملک کے صف اول کے لیڈروں میں تھا اور دعوت کا رخ بھی ہندوستانی قومیت کی طرف پھر گیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ وہ کانگریس کے بڑوں میں تھے۔ اور ان کی مانگ ہر بڑے سیاسی جلسے میں ہونے لگی، لیڈروں میں اب وہ اتنا گھر گئے تھے کہ ہم قدیم، بے تکلف نیازمندوں کی رسائی بھی ان تک مشکل تھی، پھر بھی کسی درجہ میں وہ اپنی وضعداری کو نبھائے گئے ـــــ ۲۰ء تھا کہ خلافت کمیٹی کے رشتہ سے تعلقات کی تجدید از سر نو ہوئی اور ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ اب مولانا صدر خلافت تھے اور یہ نیازمند بھی ایک چھوٹا موٹا سا صدر اپنے صوبہ کی خلافت کمیٹی کا۔ سالانہ جلسوں کے علاوہ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر مجلس عاملہ خلافت کے جلسے بار بار ہوتے اور کانپور، لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی بارہا نیاز کے مواقع ملے۔

آ وا خر ۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کی اشاعت کے بعد سے پھر تعلقات گھٹ گئے اور ہم دونوں کی سیاسی راہیں الگ ہوتی چلی گئیں، پھر بھی مولانا نے تمام تر اس نیازمند کو فراموش نہ کیا اور آخری بار جیل سے نکلنے کے بعد جب غبار خاطر شائع کی تو اس کا ایک نسخہ لطف فرمایا۔ یہ بات شاید ۴۶ء کی ہے ۴۷ء میں جب مولانا سرکار ہند میں وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے تو بجائے خالص مبارکباد پیش کرنے کے اس گستاخ نے ڈھٹائی کے ساتھ خط کچھ اس قسم کا لکھ مارا کہ "اس سرکاری تقرر سے تو ہم نیازمندان قدیم کو کچھ زیادہ خوشی نہیں۔ جی یہ چاہتا تھا کہ اس سرکاری تعلق سے جہاں ہر وقت سابقہ کاغذات پر دستخط کرنے اور فائلوں کی ورق گردانی سے رہے گا، آپ آزاد رہ کر سرکار ہند کے ایک غیر سرکاری مشیر اعلیٰ وزارت علوم و معارف رہتے۔"

۴۷ء تھا کہ آل انڈیا ریڈیو مشورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا، مولانا اسی تپاک اور گرم جوشی سے ملے کہ جیسے پہلے کسی زمانہ میں ملتے تھے، وزارت ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس بے تکلفانہ کر سکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا اور اسی روز پشاور کے خان عبد الغنی (فرزند خان عبد الغفار) بھی مدعو تھے، ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی زور شور، وہی طلاقت لسانی، وہی جامعیت و ہمہ گیری سننے والا حیران و ششدر۔ خوش خلقی، انسانی ہمدردی، مرنجان مرنج میں پہلے سے کہیں آگے بڑھے ہوئے تعلی و ترفع کے بجائے پیکر تواضع بنے ہوئے۔ شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین خصوصاً مسلم لیگ کے لئے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں، سب کا ذکر یکساں خوش دلی سے، بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت و شماتت طنز و تعریض کے الٹا کلمہ خیر! اور کچھ اس قسم کے الفاظ، کہ اب جبکہ وہ بن چکا ہے ہم سب کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقتور بنے! سیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔

مولانا آزاد — میری نظر اور دل میں!

از پنڈت گوپی ناتھ امن
صدر تعلقاتِ عامہ کمیٹی دہلی

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد سے میری زیادہ تر ملاقاتیں سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت کی ہوئیں اُن میں کبھی کبھی چند منٹ کے لئے کوئی ادبی گفتگو ہو گئی تو وہ محض ثانوی حیثیت رکھتی تھی مجھے اپنی وزارت کے دوران اُن سے اتنے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ہوا جتنا چیرمین تعلقاتِ عامہ کمیٹی یا دہلی پبلک لائبریری کا چیرمین بننے کے بعد میرے پہلے عہدہ میں مولانا کی منظوری شامل تھی اور دوسرا عہدہ تو اُنہیں کا بخشا ہوا ہے میں اپنے تاثرات اِن ملاقاتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاست اور ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں۔

سیاست

(۲) مولانا کی سیاست اُن کے عقیدوں سے پیدا ہوئی تھی اس لئے اس میں "دروغِ مصلحت آمیز" کی گنجائش نہیں تھی مولانا نے خود فرمایا تھا کہ ایسی مصلحت ایمان کی موت ہے۔ انگریزی کے لفظ "پالسی" کی طرح عربی کا لفظ "مصلحت" بھی اُردو میں کچھ اور کا اور ہو گیا ہے شاید اس میں اُردو سے پہلے فارسی کا قصور ہے کیونکہ "دروغِ مصلحت آمیز" حضرت شیخ سعدیؒ کے ہاں سے اُردو میں آیا حافظ کے یہاں مصلحت کا یہ استعمال پھر غنیمت تھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز

بہر حال جسے عُرفِ عام میں اور بالخصوص سیاست میں "مصلحت" کہا جاتا ہے مولانا اُس سے بے نیاز تھے یہ اُن کا طرۂ امتیاز تھا ادب کے خیال سے کسی اور بڑی ہستی کا نام لینا مناسب نہیں، البتہ یُوں کہنا مناسب ہوگا کہ مولانا اِس معاملے میں بے مثال تھے لیکن اگر مصلحت کو لغوی معنی میں لیا جائے جس کا مادّہ صلح ہے تو مولانا صلح جوئی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے مُسلم لیگ اور مسٹر جناح نے شاید گاندھی جی کو بھی اتنا بُرا بھلا نہ کہا ہو جتنا مولانا آزاد کو گاندھی جی نے تو ۱۹۴۲ء میں بمبئی کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس میں کچھ سخت باتیں مسٹر جناح کے متعلق کہدی تھیں مگر مولانا آزاد کی زبان سے ایک لفظ بھی عمر بھر نہیں نکلا۔ مسٹر جناح کیا، کسی کے بھی خلاف مولانا نے کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی البتہ اصولی مخالفت میں کبھی نہیں جھجکے آج کل کی سیاست میں اس کی مثال کہاں ملے گی!

(۳) مولانا بالغ ہونے سے پہلے ہی سیاست کی دنیا میں داخل ہو چکے تھے اور نوجوانی کے اس دور میں جسے فارسی شاعر نے نشاطِ عمر کہا ہے نظر بندی میں تھے کانگریس کی صدارت اُنھوں نے ۳۵ سال کی عمر میں کسی اور کو یہ فخر حاصل نہیں ہوا ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں اُن کی مصلحت کوشی بلکہ مصالحت کوشی پوری شان کے ساتھ نظر آتی ہے، ایک طرف سوراج پارٹی کونسلوں میں داخل ہونے پر بضد تھی دوسری طرف گاندھی جی کے پیرؤں کا ایک خاص طبقہ اس کیخلاف تھا دونوں کے بیچ ایک راہ نکال کر مولانا نے اُس قضیہ کو ختم کر دیا ورنہ کانگریس میں جو پھوٹ یا ٹوٹ پھوٹ ۲۵ سال بعد ہوئی اُسی وقت ہو جاتی۔

مذہب اور سیاست

(۴) یہ ایک پُرانا اور ٹیڑھا مسئلہ ہے مگر مولانا کا ذہن اس معاملہ میں بالکل صاف تھا یہ اُلجھن اُن ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے جو مذہب اور فرقہ دارانہ گروہ بندی میں کوئی امتیاز نہیں کرتے مولانا کے نزدیک آزادی جزوِ ایمان تھی اس لئے مذہب اور سیاست میں کوئی بَیر نہ تھا لیکن وہ سیاست کو مذہبی فرقہ داری کے ماتحت نہ رکھنا چاہتے تھے اُن کے ذہن میں سیاست کی جدید ترین شکلیں بھی تھیں اور قدیم قدریں بھی انھوں نے اِن دونوں کا خوبصورت امتیاز کیا تھا تاکہ یہ صورت نہ ہو کہ

جیسا موسم ہو مطابق اُس کے میں دیوانہ ہوں
مارچ میں بُلبل ہوں میں جولائی میں پروانہ ہوں

(۵) مولانا میں ایک کمزوری تھی اور وہی اُن کی شہ زوری بھی وہ چڑھ تو کسی حد تک بھی سکتے تھے مگر ایک خاص حد سے نیچے نہ اُتر سکتے تھے ایک طبقہ کے نزدیک یہ لیڈر کی خامی ہے اُسے ہر بلند و پست سے گذرنا چاہئے مولانا مادّی اعتبار سے ہر گرم و سرد کے متحمل ہو سکتے تھے اور انفرادی طور زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزر سکتے تھے مگر ذہنی سطح پر اُن کے لئے نیچے آنا محال تھا وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق شاعر نے اپنے اوپر ڈھال کر کہا کہ

تشنہ لب بر ساحلِ دریا بہ خشکی جاں دہم
گر بہ موج اُفتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مجھے ایک واقعہ یاد آیا آزادی کی آخری لڑائی کے دوران جب کانگریسی لیڈر ۱۹۴۲ء میں قید ہوئے تو مولانا صدر تھے اور جب ۱۹۴۵ء میں رہا ہوئے اُس وقت بھی صدر تھے۔ ۱۹۴۶ء میں لالہ دیش بندھو گپتا کے یہاں کانگریسی کارکنوں کی ایک میٹنگ تھی جس میں کچھ لوگوں نے کہا کہ انگریز حکومت سے گفت و شنید کی بجائے ہمیں ایک بار پھر لڑائی چھیڑنی چاہئے مولانا نے دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہو؟ جواب ملا چونکہ جنتا ایسا چاہتی ہے مولانا نے جلال میں آکر فرمایا کہ ہم لوگوں کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں ہم اُن سے رہنمائی لینے والے نہیں یہ تھا مولانا کا اصلی روپ جس پر مجھے سنسکرت کا یہ مقولہ یاد آیا۔

مہاجناں یین گتہ سہ پنتھہ

(مردِ بزرگ جس پر چلتے ہیں راہ وہی ہے)

مولانا کی یہ انفرادیت اُن کے اقوال و افعال میں برابر جھلکتی ہے یہی اُن کی سب سے بڑی خصوصیت تھی وہ اوروں کو اپنی راہ پر چلانے والے تھے یہ عجیب حسن اتفاق تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی آخری لڑائی انھیں کی صدارت میں لڑی گئی۔

انفرادیت

(۶) یہیں انفرادیت کی بات آجاتی ہے۔ مجھے اس بات پر تعجب نہیں کہ گمراہ مسلمانوں نے مولانا کے ساتھ بدسلوکی کی بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کیوں نہیں ہوئے! مجھے گاندھی جی کے قتل ہونے پر کوئی تعجب نہیں کیونکہ جس روز اُن کی پرارتھنا سبھا میں گولہ گرا تھا اسی روز سے میں سمجھ رہا تھا کہ گاندھی جی کی جان کو مستقبل قریب میں خطرہ ہے، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی بنگالی نظم "اکیلے چلو" بہت مشہور ہے عوام کے ذہن میں لیڈر کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ اُن کے دل کی بات کہے لیکن صحیح معنی میں لیڈر وہ ہے جو عوام کو راہِ حق پر چلا سکے،

سنگھن کے پھندے نہیں ہنسن کی نہیں پانت ۔
نہ شیروں کا ریوڑ ہوتا ہے اور نہ ہنسوں کی قطار ہوتی ہے ۔

مولانا کی یہی ذہنیت تھی جس نے انھیں ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک کے دوران علی برادران جیسا مقبول نہ ہونے دیا اور یہی ذہنیت تھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں میں مسٹر جناح کے برابر مقبول نہیں ہوئے بلکہ ایک وہ بھی دور آیا جب وہ مسلمانوں میں تقریباً اتنے ہی نامقبول ہو گئے تھے جتنے مہاتما گاندھی ہندوؤں میں مولانا نے اپنی اکثر تحریروں میں اس انفرادیت کا ذکر کیا ہے کہ اگر مڑ کر دیکھوں بھی تو میری تیز رَوی سے اُڑی ہوئی گرد کچھ نظر نہیں آنے دیتی، ان کی یہی ذہنیت تھی کہ انھوں نے ٹنڈن صاحب کے جواب میں پارلیمنٹ میں اُردو کی حمایت میں زبردست تقریر کی اور اُردو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے جتنا اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے پر زور دیا اُس سے بھی زیادہ ہندی کی اہمیت واضح کی تاکہ ہندی اور اُردو کی رقابت کا سوال باقی نہ رہے، اُن کی طبیعِ نازک جاہلانہ مدح سرائی کو بھی گوارا نہ کرتی تھی انہیں اپنے دل اور اپنے ضمیر سے جو داد ملتی تھی وہ ان کیلئے بس تھی بقول شاعر

عزت کی آرزو ہے نہ شہرت کی آرزو
میری نظر میں ہے ابھی کچھ میری آبرو

اسی انفرادیت نے انھیں تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے !

کے قائل ہو گئے تھے ۔

سُوجھ بُوجھ

(۷) جو لوگ مہاتما گاندھی یا مولانا ابوالکلام آزاد کی سوجھ بوجھ پر تعجب کرتے ہیں اُن کا یہ تعجب ختم ہو جائے اگر وہ صرف اتنی سی بات دھیان میں رکھیں کہ کیا کروں یا کیا کرنا ہے کا سوال اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب جوڑ توڑ کی کوشش کی جاتی ہے مولانا کا ذہن اس لئے صاف تھا کہ وہ ہر معاملہ کو مصلحت اندیشی سے بالاتر ہو کر صرف اس کی نوعیت پر سوچتے تھے نہ خارجی حالات اُن پر دباؤ ڈال سکتے تھے اور نہ تعداد کی اکثریت ایک مثال میرے ذہن میں آئی جب شری سبھاش چندر بوس کو گاندھی جی سے اختلاف پیدا ہوا اور وہ کانگریس چھوڑ گئے تو اُن دنوں مولانا آزاد صدر کانگریس تھے اُن سے کہا گیا کہ وہ سبھاش بابو پر سے پابندی اٹھا لیں اور انھیں سمجھا بجھا کر کانگریس میں لایا جائے تو مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ پہلے وہ گاندھی جی سے معافی مانگیں تب ایسا ہو سکتا ہے کچھ کانگریسی اس بات پر مولانا سے ناراض ہو گئے لیکن مولانا نے ایسی برہمی سے کبھی اثر نہیں لیا۔

برنگِ سرو ہیں آزاد باغِ عالم میں
ہے یک اپنی خزان و بہار کی صورت

اُن کے تمام ساتھی چاہے وہ مہاتما گاندھی ہوں یا پنڈت جواہر لال نہرو اُن کی اس سُوجھ بُوجھ کے قائل تھے گاندھی جی کو کروڑوں انسانوں سے سابقہ پڑا تھا مگر انھوں نے فرمایا کہ

"میں نے اِن سے بڑا اہلِ مستد اور کوئی نہیں دیکھا"

کتنی بڑی بات ہے جبھی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے پُردرد لہجہ میں کہا کہ

"اب کس سے مشورہ کریں گے"

ادب

(۸) میں عربی نہیں جانتا قرآن کے چند پارے پڑھے اُن کا بھی صحیح تلفظ نہیں کر سکتا اس لئے میں اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہوں کہ مولانا کس پایہ کے عربی کے عالم تھے البتہ میں نے انہیں بے تکلف عربی بولتے سنا تھا فارسی جانتا ہوں مگر اتنی نہیں جتنی اُردو اس لئے صرف اُردو ہی کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں۔

سیاست کی طرح ادب میں بھی مولانا آزاد صاحبِ طرز تھے میں نے مولانا کی چند تصنیفیں پڑھیں اور چند تقریریں سنیں اُن کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کا مقلد ہونا دشوار ہی نہیں، بلکہ تقریباً محال ہے۔ تذکرہ، ایک رومانی انداز کی تصنیف ہے جس میں مولانا کا شباب جھلکتا ہے، ترجمان القرآن، ایک مذہبی کتاب ہے جو نہ صرف مولانا کی مذہبی واقفیت کی وسعت اور گہرائی کا پتہ دیتی ہے بلکہ اُن کی ہمہ گیری اور بالغ نظری کی بھی دلیل ہے "غبارِ خاطر" اُن خطوں کا مجموعہ ہے جو مولانا نے احمد نگر جیل سے اپنے دوست جناب حبیب احمد خاں شروانی کے نام لکھے تھے میرے خیال میں اس صدی میں کسی اُردو کے ادیب یا عالم نے اس پایہ کے خط نہیں لکھے مولانا کی آخری تصنیف چھپ رہی ہے اُمید ہے کہ اُسے بھی ادب میں وہی مقام حاصل ہوگا جو مولانا کی اور تصنیفوں کو حاصل ہے۔

(۹) مولانا کے ادب میں بھی اُن کی ذات کی طرح عظمت ہے نہ وہ مبتذل انداز میں سوچتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں اُن کی ایک سطح ہے چاہے وہ سنجیدگی کا انداز ہو یا مزاح کا مگر وہ اپنی اس سطح سے نیچے نہیں آ سکتے وہ زاہدِ خشک نہیں مگر رندِ بدمست بھی نہیں اُن کا مزاح قہقہے لگانے کے لئے نہیں تبسم فرمانے کے لئے ہے اس میں تارنا جا راگ بوجھا کی کیفیت ہے ادب میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ بلندی پر جا کر رنگینی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں بلندی بھی ہے اور رنگینی بھی یہاں ہر ساز میں صدائے الست ہے یہاں ہر سرِ مسجود صراحی کے دہن میں صدائے قُل قُل ہے یہاں مرغانِ خوش الحان کُلُّ من علیہا فان بھی کہتے ہیں، یہاں صدائے زاغ و زغن اور زمزمۂ بلبل کو ایک ہی راگ کا زیر و بم بتایا گیا ہے ابوالکلام عام طور پر خاموش رہتا ہے کم بولتا ہے لیکن یہاں وہ پورے زور کے ساتھ بول رہا ہے۔ مگر جادو کچھ ایسا ہے کہ وہی سن سکتے ہیں جن میں کچھ صلاحیت ہو یہ نوائے راز ہیں جن کے لئے محرم ساز ہونا چاہئے یہاں نثر میں شانِ نظم ہے ابوالکلام عوام کا ہمدرد ہے اور سچا ہمدرد مگر ان کی قربت سے گھبراتا ہے کیونکہ وہ خود اپنے ہمدرد نہیں ہیں۔ اگر اُس سے ملنا ہے تو یہاں ملئے جیل میں ملئے چار پیتے ہوئے ملئے عالموں کی محفل میں ملئے ادیبوں کی مجلس میں ملئے سچ کہا ہے۔

شبد بنا دا بہت ہے دیہہ ملا دا نا نہہ
میل ملاقات وہی ہے جو شبد سے ہو جسمانی میل کیا میل ہے

زندۂ جاوید

(۹) ابوالکلام آزاد اب موجود نہیں مگر زندہ ہے کاغذ کے ٹکڑوں پر جنھیں صفحے کہتے ہیں بقول منشی پریم چند وہ لکھ رہا ہے، میں پورے زور سے زندہ ہوں، ہاں اب کسی بدتمیز کا ہاتھ میرے گریبان تک نہ پہونچے گا میں نے ان آنکھوں کو بھی پُرنم کر دیا ہے جو مجھے پُرغضب انداز میں گھورا کرتی تھیں میں نے اُن زبانوں سے بھی فاتحہ پڑھوائی ہے جو مجھے کوسا کرتی تھیں میں نے اُن اہلِ وطن کے سر جھکا دیئے جو مجھے شک کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ گاندھی جی کے آخر الفاظ "ہے رام" تھے۔ میرے آخری الفاظ "خدا حافظ" تھے۔

ایک مطلب ہو گیا ہے دو زبانوں میں ادا

قطعۂ تاریخ

زندگی میں بھی رہے فیروز بخت
اُن کے قدموں پر نچھاور تاج و تخت

غیب سے ہاتف نے دی صادق صدا
آج بھی وہ ہو گئے فیروز بخت

۱۳۷۷ھ

فیروز بخت تاریخی نام ہے مصرعہ سے تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات دونوں نکلتی ہیں۔ صادق

مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار پر

جناب بسمل سعیدی ٹونکی

کم ہوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہم کنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آب جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اُس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار

زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رُخ
موت ہی پر منحصر ہے زندگی کا اعتبار

اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار

زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک وضعِ زندگی پر ہے مدار

زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے جب زندگی
ہے یہی کچھ فطرت عادل کا دستور و شعار

الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راس البضاعت، زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و زیست دو حلقے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے مثلِ کوہسار

تھا اسی کا مقتضی تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار

ماتم انسانیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا خیر القروں
چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار

موج اندر موج تھا اک قلزمِ زخارِ فہم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

ناکدر تھا رد ترا اور باصفا تیرا قبول
نہی و امرِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم
کس قدر روندی ہے تو نے عظمتوں کی رہگذار

دیکھ کر اندازِ تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دنیوی تجھ کو ابد نے مستعار

بر بنائے پختگیٔ فکر تیری زندگی — اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار
ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مفتخر دورِ جہاں — ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیم روزگار
تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم "الہلال" — تھی تری صبحِ نخستیں روکشِ نصف النہار
کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت — عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بے کنار
ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی — حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکبار
تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان — تیری افتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار
پیش پا افتادہ رہتی تھی یہ صد عجز و نیاز — کجکلاہی سے تری، شانِ کلاہِ تاجدار
ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قربان تھا — تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار
اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے — خلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار
جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب — غازۂ روئے نگارش تیری خاطر کا غبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا — ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار
قلعہ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام — تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار
تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادیٔ ہند — جہدِ افرنگی کا دورِ قید و بند و گیر و دار
ہاں پریشاں کن تری جمعیتِ خاطر کو تھا — مسلم ہندوستاں کا افتراق و انتشار
تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی — ماسوائے ملک و ملت کا بھی تھا تو ذمہ دار
منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی — ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار
تھا جہانتابِ فضیلت نیرا خورشیدِ حیات — اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار
سربسر افلاک اس زمیں کو کر گئی کس[1] کی نظر — زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار
مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا — علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار
سر بسجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے — تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار
اس کے ذمے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا — اب ترے ذمے ہے اس پر رحمتِ پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مہرِ توثیقِ دوام
یہ عظیم المرتبت تربت - فلک رفعت مزار

[1] پنڈت جواہر لال نہرو۔

الہلال سے غبارِ خاطر تک

مولانا آزاد کا تنقیدی شعور اور باعظمت اسلوب

از محشر اعظمی

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص ہر فن میں ممتاز نہیں ہوتا کسی کی خطابت شاندار ہوتی ہے تو اس کے قلم میں زور نہیں ہوتا، اور قلم میں روانی ہوتی ہے تو خطابت میں جان نہیں ہوتی، بہت کم ایسے لوگ ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں جو تحریر و تقریر دونوں میں مہارت رکھتے ہوں لیکن مولانا آزاد کی ذاتِ گرامی میں بہت سی متضاد خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں، وہ ایک جید عالم تھے تو ممتاز سیاست داں بھی، وہ بلند پایہ مؤرخ اور محقق تھے تو بے مثال مفکر اور فلسفی بھی، وہ زبردست سحر بیاں اور آتش بار خطیب تھے تو صاحب طرز ادیب اور مایۂ ناز سخن داں اور سخن سنج بھی، مولانا کی ان تمام خصوصیات کے پیشِ نظر یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ زیادہ عالم تھے یا زیادہ سیاست داں تاریخ و تحقیق کے میدان میں آپ کے تجربات و مشاہدات زیادہ وسیع تھے یا حکمت و تفلسف کی گہرائی میں آپ کا جذبۂ سراغ رسانی زیادہ وسیع تھا۔ آپ عام اسٹیج پر اپنی خطابت اور سحر بیانی کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے یا علم و ادب کی دنیا میں اپنے قلم کی معجز نگاری اور اپنے ذوق کی بلندی اور پاکیزگی کی وجہ سے زیادہ مقبول تھے، مولانا سید سلیمان صاحبؒ۔ مولانا کے حالات قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان سطروں کے لکھتے ہوئے ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ یا امیہؒ بن عبدالعزیز۔ اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔"

مولانا کی انفرادیت ہر جگہ آفتاب کی طرح روشن ہے اور ہر میدان میں ان کی شخصیت ممتاز بلند اور نمایاں نظر آتی ہے لیکن ان کے کمالات و محاسن میں ایک اور بھی خصوصیت تھی ——— اور وہ تھا ان کا "تنقیدی شعور" اسی تنقیدی شعور نے ان کی شخصیت کا تعارف مذہبی، سیاسی اور ادبی حلقوں میں صحیح طور پر کرایا اگر قدرت نے ان کو تنقید کا زبردست ملکہ عطا نہ کیا ہوتا تو شاید ان کی شخصیت وقت کے دھندلکوں میں اتنی واضح اتنی صاف اور اتنی دلکش نہ دکھائی دیتی اور انہیں جو بلند اور منفرد مقام حاصل ہوا شاید نہ ہوتا۔ ان کے سیاسی و مذہبی مضامین ہوں یا ادبی نگارشات ان سب میں تنقیدی شعور کی پرچھائیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں ——— مولانا نے سب سے پہلے خود اپنی شخصیت پر نظر ڈالی اور اسے معیارِ خلوص پر پرکھا تو انھیں روایات اور قدامت پرستی کی بہت سی زنجیریں نظر آئیں جن میں اُن کی شخصیت جکڑی ہوئی تھی ان کے لئے اس وقت دو ہی راہیں تھیں یا تو وہ اپنے خاندان کے مُروّجہ آداب و مراسم کی پابندیوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے کی کوشش نہ کرتے اور قدیم روایات کی تقلید و تائید میں خود کو وقف کر دیتے یا تمام عقیدت و قدامت کی تاریکیوں اور تنگ گوشوں سے نکل کر نئی نئی گذرگاہوں سے اپنی زندگی کو روشناس کرانے، انھوں نے اپنے تنقیدی شعور کی رہنمائی قبول کی۔ حالات و کوائف کا تجزیہ اور فکر و مشاہدہ کرنے کے بعد اپنی زندگی کا رُخ زمانے کی طرف پھیر دیا اور منزل تک پہونچنے میں ان کے شعور اور محکم ارادے نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا ——— جب انھوں نے میدانِ عمل میں قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کو غلامی اور ذلت و نکبت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھا احساسِ کمتری نے ہر دل و دماغ پر چھاپہ مارا تھا۔ مغربیت کا زہر قوم کے جسم میں دھیرے دھیرے پھیل کر مہلک اثرات ظاہر کر رہا تھا۔ خصوصیت کیساتھ مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد ابھرنے اور پنپنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی نہ سیاسی اعتبار سے انکا کوئی صحیح موقف تھا نہ مذہبی حیثیت سے اُن کی زندگی کا کوئی گوشہ روشن تھا۔ تشکیک اور تذبذب کا یہ دور اُن کی ذہنی پراگندگی، ایمانی کمزوری، احساسِ کمتری اور عام جہالت کا صاف پتہ دے رہا تھا اس وقت علماء کرام کی ایک مختصر سی جماعت مسلمانوں کی صحیح سیاسی و مذہبی رہنمائی ضرور کر رہی تھی لیکن اس کی آواز کو ہر طرف سے دبانے کی کوشش کی جا رہی تھی اس کو وہابی کہہ کر عام مسلمانوں کو اس سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین خود علماء سو کی ایک جماعت کر رہی تھی یہی علماء مسلمانوں کو جامد اور فرسودہ روایات میں جکڑنے اور طرح طرح کے رسم و رواج اور بدعات و خرافات میں اُلجھانے کا فریضہ ادا کر رہے تھے ان کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے اور اسلام کے محافظ، ان کی گمراہ کن تعلیمات نے عام مسلمانوں کو قرآن کی مجاہدانہ تعلیم سے دُور رکھا اور ان میں یہ عقیدہ جما دیا کہ قرآن کو اچھے اور خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر احترام و احتیاط سے طاق پر رکھ دیا جائے جس گھر میں قرآن شریف ہوگا اس میں بھوت پریت کا گذر نہیں ہوگا۔ ان حالات میں مولانا آزاد نے اپنا اخبار الہلال نکالنا شروع کیا اور اس نے تھوڑی ہی مدت میں علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا صدیوں کا طلسم خواب ٹوٹا اور ہندوستان میں بیداری کی لہر دوڑ گئی عوام تو عوام خواص بھی چونک اُٹھے اور انہیں یہ بات تسلیم کر لینی پڑی کہ "ہم سب اپنے اصلی کام بھُولے ہوئے تھے الہلال نے ہمیں یاد دلایا"، الہلال کیا تھا آزادیٔ فکر و ضمیر کا ایک پیام تھا اس کے لفظ لفظ نے ایمانوں میں گرمی اور طبیعتوں میں امنگ پیدا کر دی اس کے جملے جملے میں بجلیوں کی کڑک، بادل کی گھن گرج، آندھیوں کی سنسناہٹ، سیلاب کی روانی، انقلاب کی گونج اور آزادی کی للکار اور وہ سب کچھ تھا جس کی وقت کو ضرورت تھی الہلال کے مضامین کو خصوصیت اور انفرادیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ وہ عام رنگ اور مروّجہ طرز سے الگ لکھے گئے اور خیالات و نظریات میں بھی نیا پن تھا اور ان میں ماحول پر کڑی تنقیدیں اور بھرپور وار تھا۔ الہلال اپنے سائز رسم خط۔ مضامین اور ترتیب مضامین۔ صورت و معنی ہر لحاظ سے انفرادیت و امتیاز کا

آئینہ تھا، آزاد کے قلم نے سیاست اور مذہب جیسی سادہ تصویروں میں وہ رنگ بھرے اور ان کے دامنوں پر وہ گل بوٹے بنائے کہ ان کی دل کشی نے ہر دل کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ہر نظر کو دعوتِ نظارہ دیا۔ آزاد نے لفظوں اور جملوں کے ہتھیار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور وقت کے سب سے مستحکم قلعے پر حملے شروع کر دیئے یہ دور برٹش کے انتہائی عروج و کمال کا دور تھا اس کے حدودِ سلطنت میں سورج ہمیشہ چمکتا رہتا تھا ہندوستان کے بڑے بڑے سورما بھی سامراجی طاقت سے ٹکرانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے لیکن یہ مولانا ہی کا جگر تھا کہ وہ اپنی جان کو ہتھیلی پہ لے کر آگے بڑھے اور وقت کی سب سے بڑی طاقت سے اعلانِ جنگ کر دیا آپ نے ایک طرف انگریزوں سے جنگ کا آغاز کیا دوسری طرف انگریز نواز ٹولیوں پر بھی کامیاب حملے شروع کر دیئے ان کے علاوہ علما رسو کی بھی ایک جماعت تھی جنھوں نے اپنی خانقاہوں کو دنیاوی خرافات کا اڈا بنا رکھا تھا انھیں بھی اپنا حریف قرار دے کر پوری طرح طاقت وجرأت صبر و پامردی اور جوش وخروش کے ساتھ مصروفِ پیکار ہو گئے۔ مولانا نے بیک وقت تین محاذ سے حملے کئے اور دشمنوں کے تیلے رد کے حالات کی ناسازگاری اور طرح طرح کی بے سروسامانیوں اور مجبوریوں کے باوجود عزم واستقلال کے ساتھ اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح جمے رہے وہ جذبات کی روانی میں بہے لیکن شعور کی پرچھائیاں ان پر پڑتی رہیں اپنے دلائل کی بنیاد تاریخ کے ٹھوس حقائق پر رکھتے تھے ان کے اخذ کردہ نتائج اور پیش کردہ دلائل اتنے مضبوط ہوتے تھے کہ ان کا غلط ثابت کرنا اور انھیں توڑ دینا آسان بات نہیں تھی وہ جس بات کو کہنا چاہتے تھے پہلے اس کے نتائج وعواقب پر خوب غور وفکر کر لیتے اور جب ان کا دل ہر طرح سے مطمئن ہو جاتا تھا تب اسے پیش کرتے تھے ان کا تنقیدی شعور اتنا پختہ اور اتنا بیدار تھا کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات ومقتضیات کو جانچ پرکھ کر مستقبل کا پروگرام ترتیب دیتے تھے وہ اپنی باتیں اتنے ستھرے انداز میں پیش کرتے تھے جیسے کوئی نئی بات لکھی جا رہی ہو مولانا کے مضامین میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے اس کے دو خاص اسباب ہیں ایک تو یہ کہ مروجہ طرز اور عام اسٹائل سے الگ ہو کر ایک خاص اسلوب ایک ممتاز لہجہ اور ایک منفرد انداز اختیار کیا گیا دوسرا یہ کہ ان کے تنقیدی شعور نے احیائے مشرقیت اور عالمگیر انسانیت کے تصور کو جنم دیا اور اپنے خیالات ونظریات کو بڑے پُرشکوہ اور باعظمت اسٹائل اور انقلاب انگیز الفاظ میں ادا کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کی انفرادیت جن محرکات وعوامل کی وجہ سے تھی وہی دوسروں کے نزدیک زبان و ادب کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے، بعض کا خیال ہے کہ

"سرسید اور ان کے رفقا اور مقلدین ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادی عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے بعد کو بعض جدت پسند طبائع کو جب وہ روکھی پھیکی معلوم ہونے لگی تو اس میں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنے کے لئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا گویا اس طرز کو سرسید مرحوم کے طرز کا ردِ عمل کہنا چاہیے اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔"

یہ بات درست ہے کہ سادہ اور سہل زبان اپنے اندر پھیلنے اور بڑھنے کی طاقت رکھتی ہے اور سرسید احمد مرحوم کے دور میں صاحبانِ قلم عام طور پر آسان اور سادہ زبان لکھتے تھے تمام لکھنے والے سرسید مرحوم کے رجحانات ونظریات کے قبول کرنے والوں میں تھے یا اُن کی شخصیت سے مرعوب اور متاثر تھے اگر ہم ایسے تمام لکھنے والوں کو سید اسکول میں شمار کر لیں تو غلط نہ ہوگا یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک طرز کا اسکول سب کو پسند ہو اور ایک ہی شخصیت کو سب کچھ تسلیم کر کے اس کی تقلید وتائید کریں، سرسید اسکول کے علاوہ دوسرے اسکول بھی قائم کئے گئے اور انھیں اپنی پسند اور الگ الگ طرز کے یہ اسکول اُردو ادب اور اُردو زبان کی خدمت میں مصروف ہو گئے علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے طرز کا ایک اسکول قائم کیا اور اس میں علم وادب، اخلاق و فلسفہ، مذہب وسیاست پر گہری نظر رکھنے والوں کو جمع کیا شبلی اسکول سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے خیالات ونظریات کی پوری طرح اشاعت اور ترجمانی کی، سید اسکول نے ہندوستان میں مغربیت کے تصور کو فروغ دیا تو شبلی اسکول نے احیائے مشرقیت کی تائید وحمایت میں آواز بلند کی اور دونوں نے جو کام کئے اسے ہم ایک دوسرے کا ردِ عمل نہیں کہہ سکتے اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سرسید مرحوم کے ردِ عمل میں اُردو کو ثقیل اور عربی فارسی کے گراں قدر الفاظ سے بوجھل کیا گیا سرسید براہِ راست عوام سے خطاب کر رہے تھے اور علامہ شبلی اور ان کے اسکول سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقے کو بیدار کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے واسطے سے عوام تک رسائی ہو یہی وجہ ہے کہ دونوں اسکولوں کے درمیان اسلوب، لب ولہجہ اور خاص وعام کا فرق وامتیاز رہا ——— مولانا آزاد شبلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنا ہر انداز انھوں نے انوکھا رکھا طرزِ تحریر اور اسٹائل میں روانی زیادہ پیدا کی تاہم احیائے مشرقیت میں انھوں نے اپنے قلم سے وہی کام لیا ہے جو علامہ شبلی انجام دے رہے تھے۔ آزاد نے احیائے مشرقیت کا تصور جس انداز میں پیش کیا ہے اسے زیادہ سے زیادہ جارحیت سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اس وقت کے حالات اور تقاضے ہی کچھ ایسے تھے کہ اگر جارحانہ روش اختیار نہ کی جاتی تو شاید مغربیت کی گمراہ کن تاریکی دل ودماغ کی وادیوں پر چھاپہ مار دیتی اور مشرقیت کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا آواز میں زیادہ توانائی شکوہ، عظمت اور للکار کی ضرورت تھی جسے مولانا آزاد نے پورا کیا اس سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان سے صحیح کام لیا جائے اور اسی مقصد کی کامیابی کے لئے انھوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا لوگ بیدار بھی ہوئے اور مغربیت کا طلسم بھی بہت حد تک ٹوٹا۔ اگر مولانا "ادب برائے ادب" کے محدود دائرے میں اپنے قلم کو جنبش دیتے تو اس سے یہ ہوتا کہ ہمیں ایک اسلوب مل جاتا اور بس ——— غلامی کا بچھن دور نہ ہوتا قوم کے سینے میں زندگی کی آنچ نہ پیدا ہوتی، ملک میں حریت وانقلاب کی آواز نہ سنائی دیتی۔ ذہنوں اور طبیعتوں کا انجماد ختم نہ ہوتا جو لوگ الہلال اور البلاغ کی فائلوں کو سامنے رکھ کر آزاد کے اسٹائل پر جھٹ ایراد کر دیتے ہیں وہ فن کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں برتتے اور آزاد کے بارے میں ایمان داری اور انصاف سے کام نہیں لیتے۔ مولانا کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھنا چاہیے مضمون کے پہلے حصے میں وہ مضمون رکھے جائیں جو قوم کو بیدار کرنے اور اس کی رگوں میں حرارت پیدا کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی شخصیت وحقیقت کو پہچان کر احساسِ کمتری، ذہنی غلامی، اور فکر وضمیر کی کمزوری کو دُور کر سکے۔ اس لئے ایسے مضامین میں جوش وخروش روانی وبرجستگی، گرج اور کڑک کا ہونا ناگزیر ہے ——— دوسرے میں وہ مضامین رکھے جائیں جن میں علمی حقائق، تحقیقی نکات، تاریخی اور مذہبی مسائل ومعاملات سے بحث کی گئی ہے ان میں سنجیدگی، متانت، تقدیس، گہرائی اور گیرائی، ٹھہراؤ اور رچاؤ سب کچھ ہے ———

الہلال اور ترجمان القرآن کو سامنے رکھنے کے بعد نقاد بہت جلد اس نتیجے پر پہونچ سکتا ہے کہ الہلال کا اسلوب خاص محرکات وعوامل کی وجہ سے اختیار کیا گیا اور ترجمان القرآن کا اندازِ بیان بھی اپنے حالات کے لحاظ سے درست تھا لیکن اس میں مولانا کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ فن اور حالات کے تقاضے ہی کچھ ایسے تھے اس لئے الہلال کو اس کے ماحول اور اثرات کے آئینے میں دیکھنا چاہیے اور ترجمان القرآن کو اس کے مقاصد ومعانی اور ایک عالمگیر روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیے، الہلال نے تو یہ کام کیا کہ قوم کی خوابیدہ صلاحیتوں کو صور پھونک کر بیدار کیا

لیکن اس کے بعد قوم کے ذہن اور کردار کی تعمیر بھی ضروری تھی اور یہ کام ترجمان القرآن نے انجام دیا۔ وقت گزرتا گیا، حالات بدلتے گئے اور تاریکیاں چھٹتی گئیں مولانا کے قلم کا طوفان بھی تھم گیا اور عمر کے تقاضوں کے ساتھ اندازِ گفتار بھی بدلتا گیا اور ایک دَور وہ آیا جب بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو حیرت و استعجاب سے یہ کہنا پڑا

"بعض علمی مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ادا کرنے میں زبان مشکل ہو جاتی ہے لیکن عام طور پر رُجحان سہل زبان لکھنے کی طرف ہے انتہا یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے ایڈیٹر جن کی تحریر عربی اور فارسی کے پردوں پر پرواز کرتی تھی عَام زبان پر اُتر آئے ہیں اب ان کی گفتگو میں بیٹھک اور چنا وجیسے لفظ سُن کر حیرت ہوتی ہے۔ خطبات عبدالحق ص ۱۶۰

مولانا کے قلم کی آخری یادگار "غبارِ خاطر" ہے جس میں جوش و خروش کا طوفان خاموش ہو موجیں یہاں بھی اُٹھتی ہیں لیکن آہستہ خرامی کے ساتھ صرف جھُرجھُری لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور سطح پر ایک پُرسکون زندگی مسکراہٹیں لئے ہوئے تھرک رہی ہے۔ "غبارِ خاطر" یُوں تو مولانا کی دماغی تفریحات کا نتیجہ ہے لیکن شاید خود انہیں بھی اپنی تفریحات کی حقیقت معلوم نہیں تھی کہ ان کے قلم کی لکیریں بہت زریں ہیں اور ان کی تفریح بھی ادب کی جان ہے "غبارِ خاطر" کی زبان شیرینی، گھلاوٹ اور شگفتگی اور سجاوٹ کا ایک مرقع ہے حسرت مرحوم جو مولانا کے مذہبی اور سیاسی مضامین کو دیکھ کر ہی بول اٹھے تھے

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر ؎ نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

حسرت مرحوم کے سامنے جب "غبارِ خاطر" آئی ہوگی تو پتہ نہیں ان کے احساسات کا کیا عالم رہا ہوگا۔ اگر ردیف و قافیہ اور بحر کی پابندی اٹھا دی جائے تو اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے تمام خطوط الگ الگ عنوانات کے ماتحت نظم کی صورت میں ہیں تحریر کے بناؤ سنگار میں تکلف اور تصنع کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی ممکن ہے کچھ لوگوں کی نظر میں ایسا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ رنگینی اور غنائیت ان کے قلم کی فطری چیز ہے روانی اور ٹھہراؤ، تسلسل اور شگفتگی، طمانیت اور اُن کی داخلی زندگی کی پرچھائیاں ہیں —— یہ خطوط قید و بند کے روح فرسا ماحول میں لکھے گئے ہیں لیکن ان خطوط میں فراریت کا نام نہیں تنوطیت کا وجود تک نہیں حالانکہ یہ دور اُن کے لئے بڑا ہی صبر آزما تھا اور یہ گھڑیاں ان کی زندگی کی سب سے کٹھن گھڑیاں تھیں ایسی حالت میں "غم دل" کا اظہار کون نہیں کرے گا کوئی دوستوں کو خط لکھے یا عزیزوں – اور رشتہ داروں یا عقیدت مندوں اور شناساؤں کو "داستانِ غم دل" کے سوا اور کیا لکھے گا لیکن مولانا اپنے "صدیق مکرم" کو جیل میں نہیں بلکہ چمنستان میں بیٹھے ہوئے لکھ رہے ہیں پھولوں کے تذکرے۔ بہار و باغ کی آرائش، پرندوں کے چہچہے۔ موسم کی تبدیلی اور اس کے آثار و مناظر سامنے آجاتے ہیں اور پھر علمی اور تاریخی مباحث اس شگفتگی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ پڑھتے جائیے اور طبیعت کو سیری نہیں حاصل ہوتی مولانا کی نثر میں تو یُوں بھی رنگینی اور اچھوتا پن کچھ کم نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود وہ اچھے اور معیاری اشعار کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور ہر شعر کو اس کی صحیح جگہ پر فٹ کرتے ہیں، نثر کے بعد جب شعر پر نظر پڑے گی تو ایسا معلوم ہوگا یہ بھی اسی کا ایک حصہ ہے اور اس کے معنی و مفہوم بھی اپنی اصلی شکل و صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔

استعداد اور صلاحیت

"دہقان ایک بیج اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالہ کر دیتا ہے اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بار آور ہونے کیلئے قدرتِ الٰہی نے کس طرح اپنا کارخانۂ ہستی مہیا کر دیا ہے — سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے۔ بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا مُنہ کھولدیں — زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے۔ لیکن .... اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ جب ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اُس بیج کے اندر صحیح اور صالح استعداد موجود ہو — اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تمام کارخانۂ نوال و بخشش اس کے لئے بیکار ہوگا — سورج اپنا دھنکتا ہوا تنور رکھتے پر بھی اُسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اپنا تمام ذخیرۂ آب بھی ختم کر ڈالے تب بھی اُسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہ پہونچ سکے گا"

(مولانا ابوالکلامؒ)

تخریب اور تعمیر

"اس عالم اثر و تأثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی اپنا ایک قدرتی مزاج اور طبیعت رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے۔ تعمیر سرتاسر سکون اور خاموشی۔ تعمیر جمع، نظم، ترتیب اور ایجاب ہے، تخریب تفرقہ۔ برہمی۔ اضطراب اور سلب و نفی۔ جمع و نظم کی حالت سکون ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت شورش و اضطراب۔ دیوار جب بنتی تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی، مگر اس کے گرنے میں دھماکہ ہوتا ہے۔ اس لئے تخریب کا عمل قدرتی طور پر تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پُرشور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے لیکن تعمیر کی دلآویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکہ دُور سے بھی سُن لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے۔"

(مولانا ابوالکلامؒ)

ایک اعتراف

از پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی

(ایک طویل نظم سے ماخوذ)

آزادِ محمود اللساں
شیریں سخن شیریں زباں
تحریر میں پُر کاریاں
تقریر میں گل باریاں
افکار میں گُل کاریاں
الفاظ میں چنگاریاں
وہ رہبرِ ہندوستاں
ہندوستاں کا باغباں
تنظیم کا مردِ جواں
تدبیر کا پیرِ مغاں
علم و عمل کا بوستاں
اور عزم کا کوہِ گراں
تہذیب نستعلیق کا
واحد امین بے گماں
کوئی کہاں سے لائے گا
آزاد کی طرزِ بیاں
رحمت کا اک ابرِ کرم
نوکِ قلم میں بجلیاں
ہر لفظ میں تھا خونِ دل
ہر حرف میں تھی صوتِ جاں
دنیا سے مٹ سکتی نہیں
اُس کی زباں میری فغاں
علامۂ دینِ مبیں
تفسیر کی روحِ رواں
عظمت کا لافانی پہاڑ
توقیر کا وہ نورِ جہاں
تھی منجلی جس سے زمیں
تھا مفتخر جس سے زماں
تاریخ کا جس سے وقار
روشن تھے جس سے جسم و جاں
وہ مشترک تہذیب کا
ضامن زمانہ میں کلاں

اک مہرِ استقلال تھا
گاہے نہاں گاہے عیاں
تدبیر میں روح الامیں
تقدیر میں نوشیرواں
تقدیم اور تجدید میں
اک امتزاجِ گل فشاں
تقدیس میں گنگا کا جل
تسنیم کی موجِ رواں
توقیر میں زمزم صفت
کوثر کا آبِ زر فشاں
دل میں عجب دریا دلی
وسعت میں بحرِ بیکراں
اک آگ سینے میں دبی
اک کوہ تھا آتش فشاں
الفاظ میں گر تیر تھے
ابرو کے ہر خم میں کماں
تھی بزمِ دشمن کے لئے
نوکِ زباں نوکِ سناں
اس کُل صفت موصوف کے
اوصاف کا کیا ہو بیاں
آٹھ آٹھ آنسو روئے گا
دن رات اب ہندوستاں
ہر روز تو آتی نہیں
دُنیا میں ایسی ہستیاں
حاصل تھیں اس کو فطرتی
مے نوشیاں سرشاریاں
اب ختم میخانے سے ہیں
سرمست بادہ خواریاں
اب ختم افسانے ہوئے
بدلیں وفا کی سرخیاں
اُس حق نما سردار پر
قربان تھیں سرداریاں

جب تک رہا دل میں رہا
ہو کر وہ سرِّ دلبراں

گلزار کی ہے یہ دُعا
آزاد ہوں جنت مکاں
اور اُن کے قول و فکر کی
تقلید ہو ہم میں رواں
روشن ہمیشہ کے لئے
ہیں اُن کے قدموں کے نشاں
دے ہم کو توفیقِ عمل
وہ خالقِ ہر دو جہاں
اک بات کہنی اور ہے
حائل ہیں گو دشواریاں
یہ جانتا ہوں خیر سے
حق بات میں تھیں تلخیاں
دراصل ہے یہ مرثیہ
تصویرِ جذبات نہاں
تھا مرنے والے کا یہی
اعلان آخر دوستاں
تھی یہ وصیت آخری
پھولے پھلے اردو زباں
سنتے ہو اس کے پیروؤ
غیرت تمہاری ہے کہاں
یہ ٹھان لو اُردو پہ تم
کر دو گے صدقہ اپنی جاں
اہلِ وطن سمجھو مرا
سوزِ دروں دردِ نہاں
کس درجہ معنی خیز ہے
گلزار کی آہ و فغاں
ہو جائے یہ پیارا وطن
ہندوستاں جنت نشاں

اک یادگارِ دل نشیں
آزادؒ کی شایانِ شاں

فیض الرحمٰن اعظمی

مولانا ابوالکلام آزاد کا قلم اور جنگِ آزادی

انقلاب ۱۸۵۷ء ہندوستان کی معاشی، سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی میں ایک تہلکہ اور طوفان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رست خیز میں قومی زندگی کی قدروں کے بہت سے بت توڑے گئے اور کچھ نئے بت ان کی جگہ لینے کے لئے نصب بھی کئے گئے۔ غدر سے پہلے ہندوستان کی معاشی اور ذہنی زندگی میں وہ تہلکے نہیں نظر آتے جو زندگی کے دھارے کو بدل دیں، یا ان کی فرسودہ صدیوں کی بنی ہوئی قدروں کچھ تبدیلی کریں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد دفعتاً نقشہ بدل گیا۔ ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کے احساس سے دیا صدمہ پہونچا کہ اس نے ان کی راسخ عقیدت کو جو وہ اپنی موجودہ تہذیب سے رکھتے تھے متزلزل کردیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حالات کا بہت غور سے مطالعہ کرکے سمجھ لیا تھا کہ اس وقت صرف انگریزی ہندوستان کی سیاسی ابتری کو دور کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ ان کی عہد وسطیٰ کی تہذیب اب فرسودہ ہوچکی ہے اور نئے زمانے کے معاشی، سیاسی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ مغربی تہذیب میں اس ظاہری عظمت و وقار کے علاوہ جو حاکم قوم کی ہر چیز میں محکوم کو نظر آتا ہے جو اندرونی قوت تھی وہ یہی تھی کہ وہ عہد جدید کی علمی روح اور عملی جوش سے معمور تھی، وہ انسان اور فطرت کے مابین صدیوں پرانے رشتے کو بدل رہی تھی اور مادی علوم کے ذریعہ تسخیر کائنات کرکے انسان کی تخلیقی قوتوں کو بیدار بھی کررہی تھی۔ مغربی تہذیب کے ان اثباتی پہلوؤں سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن ہندوستان میں انگریز قوم کی وساطت سے جو نام نہاد مغربی تہذیب پھیل رہی تھی وہ اصلی مغربی تہذیب نہ تھی بلکہ ایک طرح کی وساوری تہذیب تھی جس کے پرزے انگلستان سے بن کر آتے تھے اور جن کے جوڑنے کا کام ہندوستان میں کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ناقص طریقے سے جب ہندوستانی تہذیب کے مزاج کے اندر اس "جدیدیت کے تازہ خون" کو منتقل کیا گیا تو اس کی حیات بخش اور تخلیقی قوتیں بہت کچھ ضائع ہوگئیں اور اس طرح ہندوستانیوں کو اس سے فائدے کے بجائے نقصان ہوا، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس "وساوری تہذیب" نے ہندوستانی تہذیب کو یکسر ختم کردیا۔ ہندوستانی تہذیب ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط پذیر ہونے کے باوجود انگریزی تہذیب کے پہلو بہ پہلو موجود رہی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس کا دائرہ اثر محدود ہوگیا، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غدر کے بعد اگر سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی کوششیں کیں تو دوسری طرف دیوبند کا دارالعلوم بھی قائم ہوا سرسید کی نگاہ میں مسلمانوں کی مادی اور تمدنی پستی تھی اور اسی لئے علی گڑھ کے سامنے عہد حاضر سے ماخوذ ایک واقعیت پسندانہ نقشہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی پستی کا انھیں احساس نہ تھا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کے مستقل معاشی حقوق کا تحفظ تھا، لیکن علماء کا ایک مقتدر گروہ ایسا بھی تھا جو اس رست خیز میں اسلام کے تہذیبی سرمائے کی حفاظت کی فکر میں تھا، جنھیں مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی پستی کا احساس تھا اور جو اسے اس طوفان اور تہلکے میں بھی ابد کی روشنی کی طرح قائم رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید ایک عالی دماغ، روشن خیال مدبر اور مصلح تھے، ان کے دل میں مسلمانوں بلکہ پورے ہندوستانیوں کے لئے درد اور محبت کا جذبہ تھا۔ ان کی تعلیمی اور اصلاحی کوششیں اسی جذبے سے معمور تھیں۔

سرسید کا سیاسی مسلک کے ساتھ ساتھ ایک ادبی مسلک اور مشن بھی تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے ایک جمہوری ادیب اور نقاد کی حیثیت سے سرسید نے اردو ادب میں عقلیت اجتماعیت، مادیت اور حقائق نگاری کی روایت کو فروغ دیا، گو اس طرز کا آغاز تو نصف صدی پہلے فورٹ ولیم کالج کی تالیفات، قرآن کے اردو ترجموں، وہابی تحریک کے رسائل اور مکاتیب غالب سے بہت کچھ ہوچکا تھا۔ سرسید کے رفقاء کرام میں حالی اور شبلی نے اس جمہوری روایت کو اور بھی آگے بڑھایا، حالی نے اردو ادب میں ایک سنجیدہ عقلیت اور سماجی پس منظر کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے شاعری میں سماجی مقصد، توازن اخلاقی اور نیچرل مضامین پر زور دیا۔ اسلوب بیان میں بھی ان کا رجحان اصلاحی تھا۔ حالی کی طرح شبلی بھی اس سلسلے کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ سرسید اور حالی سے ان کا سیاسی شعور کہیں آگے تھا۔ سرسید سے ان کا سب سے بڑا اور بنیادی اختلاف سیاسی تھا، وہ کانگریس کے ہم نوا تھے اور انگریزی سامراجیت کے دشمن۔ انھوں نے اردو میں ہی سیاسی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے کہ اردو ادب میں عہد جدید کے نقیب وہ لوگ تھے جن کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی اور جو انگریزی زبان سے یا تو بالکل ناواقف تھے یا بہت تھوڑی واقفیت رکھتے تھے۔ جنھوں نے بقول آل احمد سرور کالجوں اور مغربی درسگاہوں میں تعلیم نہیں پائی تھی، بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تحصیل علم کی تھی۔ لیکن شبلی، حالی، آزاد اور نذیر احمد علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو عہد جدید کی برکتوں کو اپنے اندر سمونا بھی چاہتے تھے، جو اپنی آنکھیں کھلی رکھنا چاہتے تھے، اور جن کی کاوشوں اور کوششوں کو اصلاحی دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف علماء کا وہ گروہ بھی تھا جو شیخ احمد سرہندی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان رشد و ہدایت کی سیاسی آزادی اور شعور دینی کے لیجار کے احساس کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کررہا تھا۔ سیاسی آزادی کا یہ احساس جو اسلامی عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اہل دیوبند میں ابتدا ہی سے موجود تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس جذبے کو زندہ بنانے کے لئے مالٹا میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، لیکن اس مذہبی طبقے کے مبہم سیاسی جذبات کو واضح شکل اور معین سمت ابوالکلام آزاد کے مساعی جمیل، اور افکار جمیل سے ملی۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا جو رول اور مسلک رہا ہے وہ یہاں میرے مقالے سے خارج از بحث ہے۔ لیکن علمی اور ادبی حیثیت سے مولانا کے افکار و آثار تحریر و تقریر ادب اور صحافت نے اردو ادب پر جو اثرات مرتسم کئے ہیں اور جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی نفسیاتی ترتیب، جذباتی ردعمل اور تفکر میں بھی ہندوستان کی سیاسی آزادی کی جدوجہد کا پرتو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے، ادیب کا سیاسی مسلک اور نظریہ اس کے ادبی نظریے سے یکسر الگ نہیں کیا جاسکتا ادب زندہ شخصیتوں کے ذہن و فکر، جذبات و محسوسات کا مرقع ہوتا ہے شخصیت کے یہی تانے بانے تجربات میں انفرادیت، سچائی اور خلوص کو سماجی تجربے میں فن کارانہ طور پر ڈھالنا آرٹ کا ماحصل ہے انفرادی آزادی کے حصول کے بغیر فن زندہ نہیں رہ سکتا۔ آرٹ کے لئے آزادی کی فضا بہت ضروری ہے یہی آزادی ہے جو فن کار میں عزت نفس، انفرادیت اور خلوص کے جذبے کو پیدا کرتی ہے اور فن کار سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے تجربے کی آزادی کو کسی قیمت پر بھی نیلام نہ کرے۔

مولانا کی انفرادیت نے اردو ادب کو نئی سمتوں اور نئی جہتوں، نئے جلال و جمال سے آشنا کیا۔ یہ انفرادیت اپنے اندر بے پناہ جذبہ اور یقین قوت اور عمل کی طاقت رکھتی ہے۔ مولانا آزاد کی یہ انفرادیت بھی ان کی سامراج دشمنی کا ایک نفسیاتی روپ تھی، ان کی آواز اور لہجے میں انفرادیت کی وہ کھنک تھی جو اردو کے کسی بھی ادیب کے یہاں نہیں ملتی. بقول قاضی عبدالغفار :-

"اردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب یا انشاء پرداز نہیں جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے نقش عوام کی ذہنیت پر چھوڑے ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ انفرادیت ہی وہ جوہر ہے جو ان کے ادب کو انانیتی ادب EGOTISTIC LITERATURE کے قریب لاتی ہے۔ ان کی آواز میں پیغمبرانہ سطوت اور جلال ہے اور ان کی تحریروں میں ایک عجیب طرح کی عظمت، جبروت اور اعتماد نظر آتا ہے۔ اس خودداری اور انانیت کے پیچھے رومانوی ادیب کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ جسے حقیقت سے زیادہ تخیل سے محبت ہوتی ہے۔ وہ زمین کی پستیوں سے نظر اٹھا کر بہت دیر تک کہکشاں اور ستاروں پر نظر جمائے رہتا ہے کہ پھر مشکل ہی سے نیچے آسکتا ہے۔ ابوالکلام کی انفرادیت بھی اسی رومانیت کے جذبے کے شعور سے بنی ہے۔ وہ حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو محرومی، پستی اور افسردگی کے جذبات کے ساتھ کیونکہ ماضی اور مستقبل دونوں ایک رومانوی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں اور حال ایک ایسی عجیب و دہشت ناک چٹان کی طرح سامنے پڑا ہے جو ابھی تک رومانی نہیں بنی۔ ان کے اندر شوق بلند اور تخیل بے پایاں ہے۔ وہ کسی حقیقت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ حقیقتوں کو اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب اس راہ میں دکھ اٹھاتے ہیں تو اپنے دکھ درد کو پھول سمجھ کر چن لیتے ہیں اور اسی افسردگی کو اپنا مزاج قرار دے لیتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک خواب ہے۔ ان کا جہان ایک آئینہ خانہ ہے جو خود ان کی اپنی پرچھائیوں سے معمور ہے۔ اس کے علاوہ پستی، تاریکی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔

ہر رومانوی تڑپ ابوالکلام میں تبدیلی اور آزادی کی خواہش، غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور جذبے اور وجدان کی لے کو تیز کرنے کی آرزو میں ڈھل جاتی ہے۔ اپنے اور اپنے ہم نفسوں کے احساس پر یہ پابندی انھیں گراں گزرتی ہے اور حال سے بے پناہ نفرت جاگ اٹھتی ہے۔ ناآسودگی کا شدید احساس انھیں ہر قید و بند کو توڑ دینے پر اکسانے لگتا ہے اور وہ یہ منزل تخیل کی بے کراں وسعت سے طے کر لیتے ہیں۔

"آہ، تمھاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوئی اور تمھاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ آہ تم ایسے نہ تھے۔ آہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمھارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور کس طرح ہو کہ تمھاری روحیں پلٹ جائیں اور تمھاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے، پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمھاری عقلوں پر ایسا جنون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو، پھر بھی راست بازی کی راہ تمھارے آگے کھلی ہے اور گمراہیوں کے نقش قدم پر دوڑتے ہو۔"

مولانا کے اسالیب بیان میں خطابت کی یہی تاثیر اور جذبے کی یہی آنچ ہے جس سے ان کی صداؤں میں طوفان کا خروش، بادلوں کی گرج، شعلوں کے طراقے، رقاصہ کی موسیقی، سمندر کا سکون، پہاڑوں کی سنجیدگی، آبشاروں کا ترنم اور نغمہ دہر کی غیر مرئی لہریں نظر آتی ہیں۔ ان میں بیک وقت ایک شاعر کی زبان، ایک نثر نگار کا شکوہ، ایک مجاہد کی ضرب، ایک مدبر کا تجربہ، ایک نباض کی تشخیص، ایک سپہ سالار کا حوصلہ، ایک مومن کا یقین، ایک مصور کی مدح خیالی، ایک شہ دماغ کی فکر مستور ہے۔

غالب نے جو کہا تھا کہ ؎

ڈھونڈے ہے اک مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

وہ مولانا پر کس قدر صادق آتا ہے دیکھیے

"آہ کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو لے کر میں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا، اس کی صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ اب تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت دینا چاہتا ہے۔"

مولانا کے ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عزم، استقامت اور اصول پروری انھیں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں امتیاز بخشتی ہے وہی عزم، استقامت اور اصول پروری ان کے ادب میں ایک نئے یقین اور عزم سرفروشی اور والہانہ سرمستی کے جذبات پیدا کرتی ہے اور کبھی کبھی ان کی نگارشات میں وہ درد اور غمگینی کی لہریں بھی اٹھاتی ہے جو اپنے ناساعد ماحول اور حالات سے ٹکراتے ہوئے ہر بڑے آرٹسٹ اور ادیب کے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ہم وطنوں کو اپنی لسان و قلم کے ذریعہ بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے کردار میں وہ صلابت اور ان میں وہ روانی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے جذبات کی صحیح تربیت کر کے انھیں راہ حق پر چلنے کے لئے آمادہ کر سکے، جو انھیں یقین محکم سے تابناک بنا سکے۔ "ترجمان القرآن" میں سورہ یوسف کی تفسیر پر اتنا زور دیا۔ "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کے اوراق میں اپنی اور اپنے خاندان کے اہل صدق و صفا کی راہ حق میں مٹنے کی تمنا کو بار بار زیب داستان بنایا۔ غرض مولانا کا قلم ان مقامات سے گزرتے وقت ایک عجیب والہانہ سرمستی اور جذب و کیف سے سرشار نظر آتا ہے۔

"وہ ارباب صدق و صفا ہمیشہ قید وطن و دیار سے آزاد ہیں۔ خدا کی ساری خدائی ان کا وطن اور ساری زمین ان کا گھرانہ ہے۔"

"حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت اور عشق حق میں سرفروشی و جاں سپاری اور مغروران تاج و تخت اور بندگان مال و جاہ کے مقابلہ میں بے نیازی و سرگرانی۔"

"ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت اور گمراہی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان حق و راستی کو چھوڑ کر سرکشی پر اتر آئے ..... یہی غفلت ہے جسے دین حق دور کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا اور دنیا کی کامرانیوں سے نہیں روکتا۔ مگر ان کے غرور باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی راہیں بند کر دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کی انفرادی زندگی کے سارے فتنوں کا اصل سرچشمہ یہی غرور باطل ہے۔"

اسی لئے وہ بار بار اپنے ہم وطنوں کو یاد دلاتے ہیں کہ آزادی کی جنگ لڑنے سے پہلے اپنے قلب و جگر میں وہ یقین اور عزم اور اپنی سیرت اور کردار میں وہ بلندی اور گہرائی پیدا کرنا ضروری ہے جس کے بغیر حق کی راہ میں قربانی نہیں دی جا سکتی۔

"انسان کی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اور اگر فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لئے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں، جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں تب بھی اس کی رفتار نہیں رکے گی۔ حوادث و وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد و جماعت کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لئے ہر حال میں کامرانی، اس کے لئے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔"

"مولانا کے قلم کی ہر جنبش کلمۂ حق کی داعی رہی ہے اور انھوں نے اپنے سیاسی مسلک کے پیش نظر اپنے ادب و علم کی ہر شاخ اور ہر جہت کو اسے عام بنانے، دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور قومی جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ قلم ان کی تلوار ہے اور قلم سے مولانا نے وہی کام بلکہ اس سے بڑھ کر لیا ہے جو ایک سپہ سالار میدان جنگ میں لیتا ہے۔ انھوں نے خوابوں کی دنیا میں حقائق کی تلخیاں سموئی ہیں اور حقیقتوں کو خوابوں کے دھندلکے ا

الہلال اور اردو صحافت

پروفیسر شمس الدین منیری ایم، اے، بی، ایل

مولانا آزاد نے جب اردو صحافت کے میدان میں قدم رکھا، اس سے پہلے اردو صحافت کا گویا دورِ طفلی تھا۔ پیسہ اخبار لاہور، مولوی محبوب عالم کی ادارت میں نکلتا تھا، یہ نہایت پرانا اور مقبول اخبار تھا مگر یہ درحقیقت خبروں ہی کا اخبار تھا، علمی مضامین سے اسے کوئی تعلق نہ تھا، اس کے بعد وطن لاہور اور وکیل امرت سر کا دور آیا، وطن، وکیل سے زیادہ پرانا تھا اور زیادہ مقبول بھی تھا، اس کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں ایک سنجیدہ اور ذی علم شخص تھے، انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف بھی کی تھیں جن میں جنگ پلونا (ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ) سب سے زیادہ مقبول اور معروف ہوئی۔ اسی کتاب کے ذریعہ سے اردو دانوں کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی، سلطان ترکی اور ان کے شیر دل جنرل عثمان پاشا کے کارنامے معلوم ہوئے، مولوی انشاء اللہ خاں کو خلافت اسلام سے خاص دلچسپی تھی اور حجاز ریلوے کی تحریک میں انھوں نے خاصہ حصہ لیا تھا۔ ان وجوہ سے ان کا اخبار وطن کافی مقبول تھا۔ وکیل اس کے مقابلہ میں پھیکا پھیکا معلوم ہوتا تھا، مگر جب مولانا آزاد نے باوجود صغر سنی وکیل کی ادارت سنبھالی، تو یکایک اس کی ظاہری اور معنوی حیثیتوں میں ایک انقلاب آگیا، اسکی ظاہری حالت بہت سنبھل گئی، نہایت اچھے کاغذ پر چھپنے لگا، کتابت بھی صاف اور خوبصورت ہوگئی۔ معنوی طور پر بھی اس نے نمایاں ترقی کی، اس میں سنجیدہ اور وقیع مضامین چھپنے لگے اور اس کے مقابلہ میں اب وطن دبنے لگا، مگر وطن کا اصلی رقیب وکیل نہیں بلکہ اخبار زمیندار لاہور ثابت ہوا۔ جب مولوی ظفر علیخاں مرحوم نے اس کی ادارت اختیار کی تو انھیں زمیندار کا حریف وطن ہی نظر آیا، انھوں نے اس کی ایسی خبر لی کہ بے چارہ وطن تھوڑے ہی دنوں میں قعر گمنامی میں گر گیا اور یوں کہنا چاہئے کہ بے موت مر گیا۔ دنیائے صحافت میں بوڑھے انشاء اللہ خاں اور جواں سال اور جواں طبیعت ظفر علی خاں کا مقابلہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے دنیائے شاعری میں انشاء اور مصحفی کا۔ مولوی انشاء اللہ خاں پرانے وقت کے ایک سنجیدہ بزرگ تھے، اور خلافت اسلامیہ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حکومت انگلشیہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اور اس کے خلاف کسی تحریک میں شریک ہونا کجا، ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب علی گڑھ کے صرف گریجویٹ ہی نہیں تھے، بلکہ اردو، فارسی ادب کے فاضل بھی تھے، ساتھ ہی نہایت پر جوش اور جنگجو طبیعت رکھتے تھے، انھوں نے جب انگریزی حکومت کے خلاف پنجاب میں جماعت احرار کی تنظیم کی تو مولوی انشاء اللہ خاں کے خلاف گویا صف آرا ہوگئے انشاء اللہ خاں نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس طرح ان میں اور مولوی ظفر علی خاں میں ان بن ہوگئی اور دونوں اخباروں میں ایک دوسرے کے خلاف نوک جھونک ہونے لگی، علامہ شبلی نے جب تحریک احرار کی حمایت کی تو انشاء اللہ خاں نے ان کی بھی مخالفت کی، آخر وطن اخبار مولانا ظفر علی خاں کی تیز و تند نگاری کی تاب نہیں لا سکا اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح بجھ کر رہ گیا۔

مولانا آزاد اگرچہ صحافت سے لگاؤ پیدا کر چکے تھے اور وکیل کے علاوہ الندوہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے، مگر اب تک اس میدان میں کھل کر نہیں آئے تھے، ان کا قیام زیادہ تر کلکتہ میں اپنے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب کے زیر سایہ رہتا تھا، مولانا خیر الدین صاحب عالم ہونے کے علاوہ بڑے پایہ کے صوفی اور بڑے مقبول اور ہر دلعزیز پیر تھے، صرف کلکتہ میں ان کے لاکھوں مرید اور معتقد تھے، اس وجہ سے مولانا آزاد بھی نہایت خوش باش اور رئیسانہ زندگی گزارتے اور بے تکلف دوست احباب کے ساتھ ہر قسم کی آزادانہ صحبتیں رہتی تھیں راقم کے ماموں مولوی غلام محمد صاحب مرحوم بھی مولانا کے اس دور کے خاص دوستوں میں سے تھے اور عرصہ تک ان کے خلوت و جلوت کے شریک رہے، مگر ان کا بیان ہے کہ مولانا خیر الدین صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا کی طرف توجہ کی اور تخلیہ میں ان کو تلقین کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں مولانا کی طبیعت کا رنگ بدل گیا، اور مولانا نے ان صحبتوں کو خیر باد کہا، بلکہ دوستوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا، چنانچہ ماموں صاحب فرماتے تھے کہ ان ایام میں کئی بار وہ مولانا کے یہاں گئے اور ملاقات کے کمرے میں دیر تک منتظر بیٹھے رہے، مگر یا تو مولانا خلوت سے باہر ہی نہیں آئے یا آئے تو سرسری ملاقات کر کے اور خیر و عافیت دریافت کر کے واپس چلے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوستوں کی آمد و رفت بھی مولانا کے یہاں نہیں رہی، اس کے بعد جب مولانا خیر الدین صاحب کا انتقال ہوا، تو ان کے مریدوں نے مولانا کو ان کی جگہ سجادہ نشین بنانا چاہا، مولانا میں اگر دورِ حاضر کے صوفیوں اور خانقاہیوں کی طرح کچھ بھی حرص دنیا ہوتی تو ان کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں تھا۔ ان کے والد مرحوم کے ہزاروں، لاکھوں مرید جاں نثاری کے لئے حاضر تھے، پھر خود مولانا کی شخصیت ایسی جاذب تھی کہ اگر یہ سلسلہ ارشاد و ہدایت مروجہ تصوف کے طریق پر پھیلاتے تو ان کے بھی لاکھوں جاں نثار مرید ہو جاتے اور ان کے قدموں پر زر و جواہر کا ڈھیر لگا دیتے جیسا کہ مولانا نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو لوگوں سے اپنی پوجا کراتا۔ مگر مولانا کی غیور طبیعت نے اس طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر حجرے میں بیٹھ جانے والی زندگی کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ وہ میدان صحافت میں اپنی تمام فطری صلاحیتوں اور علمی قابلیتوں کے ساتھ نکل آئے اور دیکھتے دیکھتے کاروانِ صحافت کے قافلہ سالار بن گئے۔

الہلال افق کلکتہ سے نکلا، اور اس آب و تاب سے نکلا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں مولانا کا ذوق جمالیات اتنا بلند تھا کہ اس سے کم درجہ کی چیز وہ نکال ہی نہیں سکتے تھے، اس کی ظاہری زیبائی و رعنائی ہی دامن کش دل تھی کہ دیکھنے والا اسی پر فریفتہ ہو جاتا تھا، اس کی معنوی خوبیوں کی طرف تو دیر میں توجہ ہوتی تھی، خوبصورت و رنگین سرورق پر مولانا کے نام کے ساتھ "مدیر مسئول و محرر خصوصی" کا فقرہ جاذب توجہ ہوتا تھا۔ آج کل یہ فقرہ رسالوں اور اخباروں میں عام طور پر مستعمل ہے، مگر بہت سے لوگوں کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اردو زبان میں مولانا ہی نے پہلے پہل اس فقرہ کو داخل کیا۔ ان سے پہلے لوگ اس سے آشنا نہیں تھے اور خدا جانے اپنے دور صحافت میں مولانا نے ایسے ایسے کتنے الفاظ و فقرے اردو زبان و ادب میں داخل کئے، جو آج کل سکۂ رائج الوقت بن گئے ہیں۔ مولانا نے جریدہ الہلال کی ظاہری صورت میں ایک انقلاب انگیز تجربہ یہ بھی کیا کہ اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا۔ اور گو لوگ اس وقت تک اردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے تھے اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے، مگر الہلال کا ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا۔ الہلال میں کاغذ بھی نہایت اعلیٰ سفید گلیزڈ استعمال کیا گیا۔ اور اس میں تصاویر کا بھی خاص اہتمام تھا۔ تصویروں کے بلاک نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے، اکثر نوجوان ترکوں کی تصویریں الہلال میں نہایت دیدہ زیب الفاظ میں چھپی تھیں، خصوصاً انور پاشا کی تصویر جو انجمن اتحاد و ترقی اور ترکی نوجوان تحریک کے روح رواں تھے، مختلف موقعوں پر اور مختلف زاویوں کے لحاظ سے ہوتی تھی اور اس کے نیچے مولانا اس شعر کو لکھ کر تصویر میں اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے۔ ؎

تراچنانکہ توئی ہر کسے کجا داند بقدر طاقت خود می کنند استدراک

پھر ان تمام خوبیوں اور زیبائیوں کے ساتھ الہلال نہایت پابندی وقت کے ساتھ نکلتا تھا، اور مدتوں نکلتا رہا۔ ایسی رہیں الہلال کی معنوی اور باطنی خوبیاں تو ابتدا ہی سے اس کے مضامین میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی تھی کہ لوگ ہفتہ بھر اس کے لئے چشم براہ رہتے تھے اور جہاں جہاں یہ رسالہ آتا تھا اس کے پہونچتے ہی ایک مجمع ہو جاتا تھا اور لوگ اس پر گرے پڑتے تھے۔ یہ راقم کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ ایک شخص بلند آواز سے الہلال پڑھتا تھا اور سب حلقہ باندھ کر سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔

الہلال نے اردو زبان میں ایک خاص ادبیت کی بنا ڈالی اور اردو صحافت کا ایک نیا اور نہایت رفیع الزمان دبستان قائم کر دیا۔ مولانا کی تحریروں میں ایک ایسا جادو ہوتا تھا کہ موافق و مخالف سب اس پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔ مولانا اپنے جام بلوریں میں ایسی شراب دوآتشہ پیش کرتے تھے کہ پینے والا سرمست دبے خود ہو جاتا تھا۔ مولانا کی تحریر میں یہ وصف کیوں تھا، اس کا تجزیہ اور تحلیل مشکل ہے اچھے ادب سے لطف اندوز ہونا ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، جو لوگ اس کے وجوہ و اسباب تلاش کرتے رہیں وہ ادب پر ظلم کرتے ہیں۔

مولانا کی تحریر میں بلا کا زور بیان اور جوش و خروش ہوتا تھا، اس اعتبار سے اردو زبان ہی کیا، دنیا کی بہت سی زبانوں میں ایسی پر زور اور پر جوش تحریریں نہیں ملیں گی۔ الہلال کے پڑھنے والے تھوڑی دیر کے لئے ایسے سرمست اور بے خود ہو جاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں جا کر کھو گئے اور جب یہ نشہ کم ہو بھی جاتا تھا، جب بھی مولانا کی تحریر کی لذت دیر تک کام و دہن کو محسوس ہوتی رہتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا الفاظ کے بڑے جادوگر تھے، انھیں اس میں کمال تھا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں اپنی تحریر میں استعمال کریں جن کا اثر مسحور کن ہو، ان کے کلام کا اثر اور جوش و خروش بس صرف الفاظ کا جادو تھا۔ راقم کو ان حضرات کے خیال سے اتفاق نہیں ہے جب تک لکھنے والے کے دل میں کوئی کیفیت نہ ہو، صرف الفاظ کی جادوگری سے دوسروں کے قلوب کو متاثر نہیں کر سکتا۔ یہ ایک کلیہ ہے، جس کے مستثنیات بہت مشکل سے ملیں گے، وہ پرانی مثل کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے، مولانا کی پر زور اور پر جوش تحریریں یقیناً ان کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی تھیں، وہ جو کچھ دل میں محسوس کرتے تھے وہی ان کی زبان و قلم سے الہلال کے صفحوں پر مترشح ہوتا تھا۔ ان کے لفظ لفظ سے ان کے دلی خلوص کا پتہ چلتا تھا۔ ان کی نقل کرنے والوں میں بہت سے ذی علم لوگ بھی تھے۔ مگر ان کے قلوب اس کیفیت سے خالی تھے اس لئے ان کے کلام میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکی۔

(بقیہ صفحہ ۹۴)

رنگینیاں عطا کی ہیں، انھوں نے جذباتی لہروں میں طوفان اور تہلکہ مچایا ہے اور ان کی تربیت کی ہے جنگ آزادی لڑنے اور جیتنے کے لئے سرفروشی کی تمنا پیدا کی ہے اور اس راہ میں آہنی دکھ درد کو خوبصورت پھول سمجھ کر اٹھانے کا جذبہ بھی بخشا ہے، یہ کام انھوں نے اپنی نثر کے ذریعہ کیا ہے ان کی نثر میں ان کی صاعقہ بردوش شخصیت تڑپ رہی ہے جو ہر غم کو انگیز کرتی ہے اور بلند حوصلگی عطا کرتی ہے اور اردو ادب کو سنوارنے میں مولانا کا یہ کم بڑا حصہ نہیں ہے کہ انھوں نے نثر کو نثریت سے آزاد کیا۔ ان کی نثر حکیمانہ ہونے سے زیادہ کچھ اور بھی ہے، وہ محض تاریخ، فلسفہ اور سیاست کا اظہار نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کی اپنی انفرادیت کی تڑپ اور انانیت کی آواز ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن اسلوب کے لحاظ سے وہ تخیل کے آذر کہے جا سکتے ہیں جو ہزاروں بت تراشتے اور لاکھوں صنم کدے آراستہ کرتا ہے، ان کی نثر میں عبرانی شاعرانی کا سا جوش پایا جاتا ہے جیسے ایک نقاد نے صحرا میں ایک تناور درخت کے جلنے سے تشبیہ دی تھی، ملاحظہ کیجئے۔

"اپنی سرگزشت اور روئیداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں، ایک نمود حباب اور جلوۂ سراب کی تاریخ قلمبند ہو تو کیوں کر؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتے ہیں۔ طوفان نے درخت گرا دیئے سیلاب نے عمارتیں بہا دیں، عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کئے، خرمن و برق کا معاملہ۔ آتش و خس کا افسانہ، ان کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے، میری سوانح عمری بھی انھیں میں مل جائے گی، نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس۔"

اپنی ذہنی مشکلات اور معنوی کوائف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:۔

"جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا، جس گوشہ میں پناہ لی، وہ زندان ہوس و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو اس کا ذکر کیجئے، ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔"

مولانا کی نثر کی یہی خصوصیت ہے جو انھیں ایک مغنی آتش نفس کا سوز و ساز عطا کرتی ہے اور جس میں ان کی صاعقہ بردوش شخصیت کی انفرادیت اور انانیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس مغنی آتش نفس نے اپنے ادب سے ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہلچل مچا کر جو کام لیا ہے، وہ شاید تلواروں سے بھی نہیں لیا جا سکتا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم کہا کرتے تھے کہ مجھے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری نے سکھائی ہے بقول قاضی عبدالغفار مرحوم۔

"اگر اردو زبان فنا بھی ہو جائے تو دنیا کی دوسری زبانیں اس لٹریچر کو اپنے لئے متاع عزیز بنائیں گی اور ہر عہد کی ادبیات کا فاضل جب ہندوستان کے ادب کا تحقیقاتی مطالعہ کرے گا تو یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی قومی زندگی اور آزادی کی جدو جہد میں مولانا کے ادب نے جو حصہ لیا ہے اسے نظر انداز کر سکے۔"

مولانا آزاد کی نثر نگاری

از عبدالوحید رحمانی بنارسی

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے تھے جن کی نظیر صدیوں میں پیدا نہیں ہو سکتی آپ بہت بڑے سیاسی مفکر، قومی رہنما، اور مذہبی عالم تھے اور ان حیثیات سے آپ محتاج تعارف نہیں۔ لیکن مولانا کی ان حیثیتوں کے علاوہ ایک اور حیثیت بھی ہے جس کا ابھی کافی طور پر اظہار نہیں ہوا ہے یا اگر ہوا ہے تو اس میں مولانا کی حقیقی رتبہ کا اعتراف نہیں کیا گیا، میری مراد مولانا کی نثر نگاری ہے جس میں اُن کا زوردار طرزِ بیان اور پُرشوکت اسلوب اُردو کے اسالیب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

مرزا غالب نے اردو کو مسجع اور مقفّٰی عبارتوں کی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے اظہارِ خیالات کا عام ذریعہ بننے کے قابل بنا دیا، مولوی محمد حسین آزاد کے قلم جادو رقم نے اسے نزاکت و سادگی بخشی، مولوی نذیر احمد نے اسے سنجیدہ اور متین بنانے کی کوشش کی اور حالی و شبلی کی مساعی جمیلہ نے اسے یورپ کی مہذب و شائستہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا۔ ان تمام اہل قلم حضرات کے باوجود اُردو ایسے معلی کسی اور کی آمد کی منتظر تھی جو اسے شہرت دوام اور قبول عام کا تاج پہنائے اور ارض ادب کے ہر ذرہ پر اس کی قبولیت کے تخت بچھائے اور انہوں نے قصر ادب اُردو کے دروازہ پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایک ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ کہنہ مشق ادیبوں کو محوِ حیرت کر دیا اور سب کی نگاہیں حیرت سے بے اختیار اس کی طرف اُٹھ گئیں اس کے انداز تحریر کو کوئی سمجھا اور کوئی نہیں سمجھا لیکن واہ واہ سب کرتے رہے بالآخر مولانا حسرت موہانی کو کہنا پڑا ؎

سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت
گویا ہیں ابوالکلام آزاد

ہم مولانا آزاد کی ادبی زندگی کو عام طور پر تین مختلف دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا سنہ ۱۹۱۲ء تک یعنی اجرائے الہلال کے زمانہ تک، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولانا "الندوہ" اور "وکیل" وغیرہ کے ایڈیٹر تھے پھر حیاتِ سرمد ہے جو آپ نے اٹھارہ برس کی عمر میں لکھی تھی اس کے متعلق خواجہ حسن نظامی کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے "باعتبار ظاہر اُردو زبان میں اس سے اعلیٰ اور شاندار الفاظ آج تک کوئی جمع نہیں کر سکا اور باعتبار معانی یہ سرمد کی زندگی درت کی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ مقامات درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ ہے" دراصل یہ ابتدائی اور آئندہ کی تیاری کا زمانہ تھا جسے ہم ادبی زندگی کا کوئی خاص دور نہیں کہہ سکتے تاہم اس دور کی انشا پردازی صاف غمازی کر رہی ہے کہ جس قلم کی یہ گل کاریاں ہیں وہ آگے چل کر کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس کا اسلوب بیان اور طرز نگارش کیا کچھ انقلاب نہیں نہیں پیدا کرے گا۔

دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۲۲ء تک یعنی الہلال کے اجراء سے لیکر آپ کے علی پور جیل میں چلے جانے تک اس دور کی یادگار الہلال و البلاغ کی مجلدات "تذکرہ"، قولِ فیصل یعنی وہ بیان جو علی پور جیل میں جاتے وقت آپ نے عدالت کو دیا تھا اور ایک کتاب مسئلہ خلافت اور جزیرہ عرب ہیں، یہ وہ دور ہے جہاں آکر ابوالکلام اپنی بے پناہ ادب آفرینی اور تبحر علمی کی بدولت ایک ہی وقت میں اردو زبان کے حریف شکن ادیب، اسلامی ہند کے امام اور ہندوستان کے سربرآوردہ لیڈر بن گئے تذکرہ میں مولانا نے اپنی زندگی کا حال گل و بلبل اور سرو و قمری کے استعاروں میں لکھا ہے لیکن یہ اشارے مفصل بیان سے واضح ہیں۔ چند سطریں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں

"جس راہ میں قدم اُٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا، ایک تیغہ ہو تو ذکر کیجئے، ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے، نظر ایک تھی مگر جلوؤں سے تمام عالم معمور تھا، ہر کشش نے اپنا تیر چلایا ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی، ہر فسوں ساز نے اپنا افسون محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش ربا نے مرتے پہ بھی دام اُلفت میں اسیر اور اپنے ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

دانے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یکسر بند ہو برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی وہ بڑھتی ہی گئی۔

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے
کار از دوا گذشتہ و افسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پہ رشک آیا تو سربلندی و سرافرازی کے لئے دل خون ہوا کبھی سبزہ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار اور خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی، آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی بے رنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آگئی۔ غرضیکہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی، بجلیاں کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشت غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ پہونچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ صدا
در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

تیسرا دور ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کی یادگار الہلال ۱۹۲۷ء اور ترجمان القرآن ہیں اور اگر بارِ خاطر نہ ہو تو رام گڑھ کانگریس کے خطبۂ صدارت کو بھی اس میں شامل کر لیجئے۔ اگر سیاسی پہلو سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اُردو ادب کا یہ بہترین سرمایہ ہے اور عطف و اضافت کے بغیر ہلکی پھلکی زبان میں بہترین نمونہ ہے

آپ کی ادبی زندگی کے پہلے دور کی نسبت دوسرے اور تیسرے دور زیادہ واضح اور نمایاں ہیں دوسرے دور میں مولانا کی تحریروں میں بھاری بھرکم الفاظ کی کثرت اور بیان کی روش میں خطیبانہ جوش ہے، عطف و اضافت کا التزام اور عربی و فارسی کی نادر اور پُرشکوہ ترکیبیں بہت ہیں لیکن تیسرے دور میں زبان حتی المقدور سہل اور صاف اختیار کی گئی ہے اور دوسرے دور کا مشکل اور دیر فہم طرز بیان ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ الہلال کے زمانے میں آپ کے مخاطب رہنمایان قوم اور علما تھے اور جب آپ کا خطاب عام لوگوں سے ہونے لگا تو آپ کا بیان حد درجہ سلیس اور سادہ ہو گیا چنانچہ ترجمان القرآن اس کی ایک روشن مثال ہے اس میں عربیت نام کو بھی نہیں اور روانی و سادگی اور سلاست کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اس کو بآسانی سمجھ سکتا ہے اور اس کا منشا بھی یہی تھا۔

مولانا کی نثر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت مربوط ہوتی ہے ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی سی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہوتا ہے اور اگر ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو ساری فصاحت خاک میں مل جائے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کی تحریر میں حذف و اضافہ و تغیر و تبدل سے بعض اوقات بہت حسن و خوبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن مولانا کے ہاں الفاظ کی نشست و برخاست کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ رد و بدل سے سوائے قباحت اور بے نمائی کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا، یہاں مبتدا، خبر فعل اور متعلقات فعل میں ایک خاص ربط اور ہم آہنگی ہوتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ آپ اس درجہ پابند ہو کر لکھتے ہیں کہ مزید حسن و خوبی کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑتے آپ کی طرز نگارش کی یہ خوبی ہے کہ پڑھتے وقت دماغ پر بالکل گراں نہیں گذرتی۔ مشکل سے مشکل الفاظ و تراکیب اگر کوئی شخص استعمال کرتا ہے تو بسا اوقات طبیعت پر گراں گذرتے ہیں لیکن یہاں وہ اس ربط و نظم سے آتے ہیں کہ مشکل سے مشکل انشا نہایت آسان معلوم ہوتے ہیں۔ شاید نیاز فتحپوری نے اسی چیز کو دیکھ کر لکھا تھا "آپ کا لب و لہجہ، آپ کا انداز بیان واللہ مجھ سے تو وداع جان چاہتا ہے اگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں دے تو میں اس کو سرِ وقت چھیڑا کروں۔" ع

کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

آپ کی ترکیبیں اس قدر مترنم اور شگفتہ ہوتی ہیں کہ جو لوگ ان کا مطلب نہیں سمجھتے وہ ان کے صوتی حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نثر نہیں بلکہ لکھتے لکھتے نثر میں شاعری کرتے ہیں اور آپ کا ایک ایک فقرہ مصری کی ڈلی اور شہد کا گھونٹ معلوم ہوتا ہے بعض اوقات بہت طویل جملے لکھتے ہیں مگر کیفیت ترنم کی وجہ سے یہ طوالت نہ پڑھنے والوں پر بار ہوتی ہے اور نہ ہی ناگوار خاطر۔ فصاحت، بلاغت، لطافت و نزاکت، سلاست و روانی، غرض وہ کونسا حسن ہے جو اس لفظ کے معانی میں نہیں اور کونسا نغمہ ہے جو بربط کی اس تار میں پوشیدہ نہیں ؎

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

مولانا کی تحریروں میں ابتدا سے تا انتہا کوئی سبک اور بے وقار لفظ نہیں ملے گا باوجود اس کے کہ ساری زندگی سیاسی ہنگاموں میں گذری لیکن کیا مجال جو ذاتی اغراض اور جماعتی تعصبات آپ کو گرے ہوئے الفاظ کے استعمال پر مجبور کر سکیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی ہی جماعتی تعصبات سے بہت بلند تھی چہ جائے کہ تنگ نظری و خفیف نفسی سے آپ کا دامن آلودہ ہو۔

مولانا کے دماغ میں معانی اور مضامین و الفاظ کے کتنے خزانے پوشیدہ ہیں کہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتے۔ بعض انشا پردازوں کے جملے ادبی مضامین کو نہایت خوبصورت اور دلفریب انداز میں لکھتے ہیں۔ لیکن علمی یا فلسفیانہ مضامین میں الفاظ کی زینت و آرائش کو برقرار رکھتے ہوئے خوب اچھی طرح ادا نہیں کر پاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون اپنی اصلی بلندیوں سے نیچے گر جاتا ہے اور اس میں تاثیر کی قوت باقی نہیں رہتی، لیکن مولانا کی تحریروں میں موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے آپ کو مخصوص اور خوبصورت سے خوبصورت الفاظ ملیں گے۔ آپ کے ہاں خشک سے خشک موضوعات میں بھی شوکت بیان اور رنگینی تحریر پائی جاتی ہے۔ خود الہلال کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔

کامیاب انشا پرداز وہی ہو سکتا ہے جسے الفاظ کے استعمال کا زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہو۔ کیونکہ الفاظ بجائے خود اتنے فصیح اور غیر فصیح نہیں جتنا اُن کا محل استعمال اور اُن کی نشست و برخاست اُن کو بنا دیتی ہے۔ مولانا آزاد میں یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

انشا پردازی کا ایک اور کمال یہ ہے کہ موضوع زیر بحث کا کوئی گوشہ ناتمام نہ رہ جائے صرف الفاظ کی رنگینی اور تراکیب کی ندرت ہی سے کام نہ لیا جائے بلکہ مستحکم اور ٹھوس دلائل و براہین لائے جائیں تاکہ پڑھنے والوں کے دلوں میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مولانا اس صفت میں بھی قادر الکلام ہیں۔

مولانا کی تحریروں اور نگارشات میں ایک واضح خوبی جوش و تاثیر ہے۔ ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور نتیجہ یہ ہے اس خلوص کا جس سے مولانا کی تمام تحریریں بھری ہوئی ہیں۔ یعنی جو کچھ آپ لکھتے ہیں وہ آپ کے دل کی آواز ہوتی ہے، دوسرے آپ اسے کامل یقین اور اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اس لئے آپ کا ایک ایک لفظ جوش و خروش میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، جوش و تاثیر کا عنصر آپ کے ہاں اس قدر غالب ہے کہ آپ کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ واقعات کی تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح فن نثر نگاری میں آپ کی تحریر کے ڈراما کی ایک حیثیت ہو جاتی ہے، ہر لفظ، فقرہ یا خیال ایک ایکٹر معلوم ہوتا ہے جس میں قوت بھی ہوتی ہے اور حرکت بھی۔ مثلاً اگر آپ کسی بزم کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محفل عیش و نشاط منعقد ہے اور سامعہ و باصرہ اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اگر رزم کی طرف آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کی تلواریں بے نیام ہیں اور ہر ایک مجاہد آگے بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دے رہا ہے گو کسی حد تک مبالغہ کو بھی اس میں دخل ہوگا لیکن بسا اوقات مبالغہ ہی تحریر کا حُسن بن جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ طبیعت پر شاق گذرے دل چاہتا ہے کہ کچھ اور ہو۔

آپ کی تحریروں میں بناوٹ اور تصنع کو مطلق دخل نہیں بلکہ پورا پورا خلوص ہے لفظوں اور فقروں میں جگر کے خونیں ٹکڑے، اور سینے کے داغ چھپے ہوئے ہیں، آپ جو بات کہتے ہیں دماغ سے نہیں دل سے کہتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پُرسوز باطن کے اجزا لبوں سے باہر آ رہے ہیں، آپ کی تحریر سلگتی ہوئی آگ، بھڑکتا ہوا شعلہ، اُٹھتا ہوا سیلاب، پھیلتا ہوا طوفان، چمکتی ہوئی برق، گرجتی ہوئی رعد اور برستا ہوا بادل ہے جن کے پردہ میں یقین و ایمان کی پختگی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

"سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سر بفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی پھرتی ہیں، زلزلہ آتا ہے تو فقیروں کی جھونپڑیوں کے ساتھ قصر شاہی کے ستون بھی متزلزل ہو جاتے ہیں، آندھی چلتی ہے تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگرے ہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کر موجیں مارتا تھا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے، کبھی کبھی

زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک اور بوئے گل کی موج ہو جاتی ہے کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کے چلتا تھا ایسا بھی ہوا ہے کہ نسیم خوشگوار بن کر چلنے لگا ہے"

چنانچہ آپکی شاندار اور پُرشکوہ تحریر سے متاثر ہو کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے فرمایا تھا کہ "میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی"

مولانا موصوف کی بعض تحریروں میں طنز بھی پایا جاتا ہے اور آپ کا نشانہ طنز جدیدیت علم و دانش کا زعم باطل اور فرنگیت ہوتے ہیں آپکے طنز کا انداز نمایاں طور پر سرپرستانہ اور بے پروایانہ ہوا کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ دنیا بھر کو پائے حقارت سے ٹھکرا رہے ہیں۔ اور ہر چیز ہیچ پوچ ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ کی طنز میں ایک جبروتی شان ہوتی ہے آپکے ہاں ایک خطیبانہ جوش و تلاطم ہے اور آپنے اپنی طنزیات میں خطابت کو بہترین طریقہ سے سمویا ہے آپکے طنز سے ایک ایک فقرہ اور خیال میں قوت و بیداری کے جوہر پائے جاتے ہیں۔

طنز کی بہترین مثالیں آپ کے مضامین "حدیث الغاشیہ" اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے "خط و کرب" اور "لذت والم" کی بحث میں بکثرت ملتی ہیں۔ بخوف طوالت ان کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ جابجا اُردو' فارسی' اور عربی اشعار کا استعمال اس برجستگی اور خوبی سے فرماتے ہیں کہ خود شعر کی اہمیت پہلے سے دوچند ہو جاتی ہے اور اگر اسے غلو اور عقیدت سے تعبیر نہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ کسی شاعر کا شعر استعمال کر کے آپ اُس پر احسان کرتے ہیں' آپ شعر نہیں کہتے لیکن شعریت کی روح کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کتنے نثر و نثر مولانا کے حافظہ میں محفوظ ہیں کہ لکھتے وقت ایک ایک دو سطروں کے بعد مختلف اشعار کو نگینوں کی طرح جڑتے چلے جاتے ہیں۔ مولانا کی انھیں باتوں سے متاثر ہو کر بہت سے انشا پردازوں نے مولانا کی طرز نگارش کو اختیار کرنے کی کوشش کی مگر وہ لوگ اس میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ جو زورِ بیان' ہمہ گیری اور برجستگی مولانا کے ہاں ہے وہ کسی سے بن نہ پڑی۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی علمی کم مایگی بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا طرز نثر نگاری آپ کی ذات سے صفت نہیں اور آپ اس رنگ میں منفرد ہیں اور پھر اعادہ مطالب کے واسطے جس قدر مختلف انداز بیان آپ کے ہاں موجود ہیں اُردو کے کسی انشاپرداز کے ہاں شاید ہی موجود ہوں خیالات کے آمد کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عنانِ قلم کو کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک اور چیز جو مولانا کی تحریروں میں کہیں کہیں ملتی ہے وہ یہ تھی کہ آپ الفاظ اور فقروں کی نشست برخاست کچھ اس طرح کرتے تھے کہ سننے یا پڑھنے والے کا ذہن و دماغ پرسش کی بجائے پرستش کی طرف مائل ہو جاتا تھا اور اُس میں آپکے داعیانہ انداز فکر اور طنز نگاری کو بہت حد تک دخل ہے۔ پڑھنے والا آپ کے الفاظ و فقرات کی دروبست سے مسحور ہو کر دلائل کے استحکام سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ آپ کی عبارت میں ایک خاص قسم کی تقدیس جھلکتی ہے۔

پھر جب مولانا نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو مولانا کی مسلسل نظربندیوں اور گرفتاریوں نے آپ کو قلم و کاغذ کی بساط سے ہٹا کر ایک ایسے خارزار میں پہونچا دیا جہاں معاملہ دار و رسن کا درپیش تھا اور ادب کا یہ صاحبِ کمال آرٹسٹ اپنی سیاسی قیادت کی ناموری میں گم ہو گیا۔ دنیا نے گمان کیا کہ اب مولانا کی تحریر میں وہ بات نہ ہوگی جو الہلال و البلاغ کے زمانے میں تھی اور آپ کے ذوقِ نگارش پر سیاسی گرد و غبار کی بہت سی تہیں جم چکی ہونگی مگر سنہ ۴۵ء میں جب مولانا آزاد احمدنگر کے قلعہ سے باہر آئے تو اپنے ساتھ اپنے خطوط (غبار خاطر) کا ایک مجموعہ لائے اور اس میں مولانا کے سحرآفریں قلم نے ادب و لطافت کی جو گلکاریاں کی تھیں اُس نے ملک کے ادیبوں کو ایک بار پھر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور سب کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مولانا خواہ قلم و کاغذ کی بساط سے کتنے ہی دور کیوں نہ رہیں اُن کے اسلوب بیان اور طرز نگارش میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسی چیز کو قاضی عبدالغفار مرحوم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں

"اب جو کم و بیش ۲۵ سال کے بعد میں نے سُنا کہ مولانا کے بعض مکتوبات کتاب کی شکل میں شائع ہو رہے ہیں تو یہ گمان ہوا کہ سیاسی زندگی کے اس طویل اور طوفانی ہنگامہ میں مولانا کے ذوقِ نگارش پر گرد و غبار کی نہ معلوم کتنی تہیں جم گئی ہونگی لیکن غبار خاطر کے چند صفحات پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

جس ساز کے تاروں کو میں نے سمجھا تھا کہ ٹوٹ گئے ہونگے اُن کی آہنگ کو تو میں نے کچھ اور دلنواز پایا' ان کے اندر زندگی اس طرح بولتی ہوئی پائی اور وجدانِ لطیف اسی طرح کارفرما پایا جس طرح کہ ۲۵ سال پہلے وہ قلم کو نغمہ اور کاغذ کو رنگ عطا کرتا تھا۔ دنیائے ادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ ان نازک اور باریک تاروں کی موسیقی میدان سیاست کا مقابلہ کر لے۔ غبار خاطر نے میرے اندیشوں کو جھٹلا دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ ادب کی وہ رنگین روح جس نے البلاغ و الہلال اور تذکرہ کے صفحات پر اس دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا" میں ارباب نظر کے لئے گوش و نظر کی ایک جنت آباد کی تھی اب بھی اپنی شعریت سے ایک ذرہ محروم نہیں اور افکار سیاسی کا غبار اس ذوقِ نگارش کے کسی گوشہ کو چھو بھی نہیں سکا"

جب ہم غبارِ خاطر کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں تو مولانا کی نفسیات کا جو نقشہ سامنے آتا ہے تو اس میں سب سے زیادہ نمایاں پہلو وہ ہے جہاں ہم خود مولانا کے قلم سے ان کی فطرت کی تصویریں متحرک دیکھتے ہیں اس خانہ میں مولانا کی جو ذہنی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اس کے بہت سے نام رکھے جا سکتے ہیں' خودداری' انانیت' کم آمیزی' اور اسی بنا پر آپ ہر معمولی واقعہ میں بھی اپنے لئے امتیاز کا کوئی خاص پہلو نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے ذوقِ نگارش کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قید کی پابندیوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیازی پہلو پیدا کر لیا شروع تو اس طرح کرتے ہیں کہ

"قید خانے باہر کی دنیا کے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوب کبھی مکتوب الیہم تک بھی پہونچ سکیں گے یا نہیں' تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھائی تھیں کہ قلم اُٹھا لیا تو پھر رُکنے کو جی نہیں چاہتا"

اور اس ذوقِ نگارش کا بیان ختم اس انداز سے کرتے ہیں کہ

"لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا' کبھی بال کبوتر سے' ہمارے حصہ میں عنقا آیا"

بات تو سیدھی سادھی ہے اور کہنا صرف یہی ہے کہ یہ مکتوبات اس یقین کے ساتھ نہیں لکھے گئے تھے کہ وہ کبھی مکتوب الیہ تک پہنچ سکیں گے لیکن مولانا نے اس معمولی سی بات میں بھی اپنے طرز نگارش کے لئے امتیاز کا ایک پہلو پیدا کر لیا۔ یہ کوئی سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ حقیقتاً مولانا کے افکار کی اس انانیت و انفرادیت کا ایک عکس ہے جو ہر بات پر انگلی اٹھا کر کہتی ہے کہ اس بات کو یوں نہ کہو جیسے عوام کہتے ہیں۔

مولانا کی تحریروں میں جہاں کہیں سوز و گداز کا کوئی پہلو نمایاں ہو گیا ہے تو اسے اس طرح شاعرانہ انداز میں واضح فرماتے ہیں:-

"جب رنگ کا جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے"

پھر اسی کیفیت کو اپنے فلسفیانہ انداز میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ

"اس بارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو، یہاں زلالِ رسائی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا جو درد کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا"

غرض مولانا کی تحریر اور تقریر سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آپ کا راستہ دوسروں سے پہلے بھی الگ تھا اور اخیر تک الگ رہا۔

"کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد یورپ کے کسی ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو نہ معلوم کتنی انجمنیں علمی اور ادبی آپ کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنے پریس آپ کی تصانیف کے لئے وقف ہوتے مگر یہاں صدیوں کی غلامی نے دوسری چیزوں کی طرح قدر شناسی کا جوہر بھی کھو دیا"

اردو ادب کے تذکرے اس ادیب کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں اگر کسی نے ذکر بھی کیا ہے تو اس نے آپ کے کارناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے اور بس۔ افسوس ہمارے نوجوان میکالے، بیکن، شکسپیر اور گبن وغیرہم کی تصانیف پر نہایت فخر سے قلم اٹھاتے ہیں لیکن کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے وطن کے اس قابل قدر ادیب کے کارناموں کی طرف توجہ مبذول کرے جس پر سینکڑوں شیکسپیر اور میکالے نچھاور کئے جا سکتے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نذرِ عقیدت

از جناب عزیز احمد عزیز بنارسی

دکھا دیا چشمِ عصرِ نو کو جمالِ خیر الانام تو نے
شرابِ وحدت سے بھر دیا ہے ہر ایک تشنہ کا جام تو نے

لیا ہے اربابِ علم و فن سے خراج تو نے سلام تو نے
کلام کو بھی نیا تکلم دیا ہے اے ابوالکلام تو نے

رہیں گی اب تشنہ لب نہ روحیں رہیگا اب بے سکوں نہ کوئی
بہا دیا ہے قدم قدم پر وہ چشمۂ فیضِ عام تو نے

کلامِ باری کا کوئی نکتہ ہو یا سیاست کی کوئی منزل
کیا ہے آسان ایک پل میں ہر ایک مشکل مقام تو نے

چمن کا ہر پھول ہر شگوفہ فسانہ گو ہے ترے ہنر کا
نسیم نازاں ہے جس روش پر دیا وہ طرزِ خرام تو نے

دلاورانِ وطن کی صف میں نظر پڑا ہے جہاں بھی رخنہ
قدم اٹھایا ہے اس طرف اے مجاہدوں کے امام تو نے

کہاں وہ تاراجیٔ خزاں اب سجا ہوا ہے تمام گلشن
چمن کا جب سے لیا ہے آزاد ہاتھ میں انتظام تو نے

فضا ہے سارے چمن کی غمگیں تمام جلوے ہیں شب بداماں
نگارِ صبحِ رخِ حرم بنا دیا کہاں پر قیام تو نے

عزیزِ سینہ فگار کیوں ہے شکستہ دل نا امید محزوں
وفورِ غم میں بھلا دیا کیا ترانۂ ابوالکلام تو نے

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ایک خودنوشت سوانح
تذکرہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تصنیفات میں ایک اہم کتاب "تذکرہ" ہے جو اپنی فرطِ شہرت کے لحاظ سے کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ مولانا کے مخصوص و منفرد اسلوب تحریر و طرزِ نگارش کا بہترین ظہر ہے۔ اس میں اُن کے خاندان کے شیوخ و اکابر کے حالات کے ساتھ ضمناً اتنی بہت سے دینی و تاریخی مباحث آگئے ہیں جن کی وجہ سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

ایک علمی بحث قرآن کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے پر ہے جو کتاب کے صفحہ ۱۸۰ سے ۱۸۸ تک چلی گئی ہے۔ جس زمانہ میں مولانا شبلیؒ سے سیرۃ نبویہؐ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے۔ انھوں نے مولانا شبلیؒ سے عرض کیا کہ اس میں ایک باب "قرآن اور سیرت محمدیہؐ" قرار دیجئے، اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کرکے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں۔ فرمایا کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے۔ اس پر مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے کہ مولانا شبلیؒ کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر کام شک و تذبذب کے بعد کرتے تھے۔ ندوہ کے کاروبار میں جو اُلجھنیں پیدا ہوئیں، جو پریشانیاں اٹھانی پڑیں، جن دقتوں کا اُن کو سامنا کرنا پڑا، وہ اُن کی اسی افتادِ طبع کا نتیجہ تھا، بہرحال مولینا ابوالکلام نے وقت کے مشہور صاحبِ سیرت و مغازی سے مایوس ہو کر خود اس میں اپنا وقت صرف کیا، اور ایک مستقل سیرۃ نبویہؐ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کردی، جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا، نئے نئے دروازے کھلتے گئے، اُمید سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی، اور کتاب مرتب ہو گئی، لیکن ان کی زندگی کی یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے کہ اُن کا کوئی تصنیفی و تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا، اسی میں اُن کی سیرتِ قرآنیہ بھی ہے جس کی طرف اُن کو اپنی ساری عمر توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس اہم اور مقدس کتاب کا مسودہ محفوظ ہے یا اُن کے اور علمی اندوختوں کی طرح یہ بھی دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔

اس کا کوئی حصہ نہ کبھی الہلال میں شائع ہوا نہ کسی اور علمی رسالہ میں، اس لئے اس کے متعلق قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بہرحال قرآن سے توغل و اشتغال کی بنا پر قرآن کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت لکھنے کا حق انہی کو تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم قرآن کا جو ذوق بخشا تھا اس کا نتیجہ یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔

سیرت و مغازی پر معلوم نہیں عربی و فارسی تو درکنار خود اُردو میں اِدھر چالیس برس میں کتنی کتابیں تصنیف ہو گئیں جن میں مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین کے علاوہ مولینا عنایت رسول چریاکوٹی کی بُشریٰ۔ مولانا تھانویؒ کی نشر الطیب، مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر، مولانا گیلانیؒ کی النبی الخاتم اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی فتح اللہ الاسلام والمسلمین بطول بقائہ کی رسول کریمؐ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن اس وسیع ذخیرہ میں کسی کو نفسِ قرآن حکیم سے سیرتِ نبویہؐ کے اخذ و استنباط کا خیال نہیں پیدا ہوا۔

عربی میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے، حالانکہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث سب کے پیشِ نظر رہی ہوگی، ایک مرتبہ کسی صحابی نے حضرت عائشہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے برجستہ فرمایا، کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد پہلے بزرگ ہیں جن کو اس کا خیال پیدا ہوا اور اپنے عزم و ہمت سے انھوں نے اس کو پورا بھی کیا، اُن کی اس اقدمیت اور اوّلیت پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، جتنا ثواب بھی مرتب ہو، کم ہے۔

فرقہ مہدویہ

اس میں ضمناً مہدوی فرقہ کے بانی سید محمد جونپوری المتوفی سنہ کا حال بڑے والہانہ انداز سے لکھا ہے۔ یہ شہنشاہِ اکبر سے پہلے نویں صدی میں گذرے ہیں، یہ زمانہ ہندستان میں سخت بدامنی و طوائف الملوکی کا زمانہ تھا سینکڑوں چھوٹی بڑی بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی، جو احکام شرع کے اجراء و قیام کی ذمہ دار ہوتی، جاہل صوفیوں کے بدعات و منکرات نے لوگوں کو اور زیادہ گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سید صاحب موصوف نے احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا، ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر تھی، کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ — سلاطین وقت نے اُن سے بیعت کی سید محمد علوم رسمیہ کے ساتھ زہد و درویشی اور ورع و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پیرؤوں میں بھی اکثر بزرگ بڑے ہی پاک نفس، اور خدا پرست لوگ تھے، اس فرقہ کی بنیاد پڑی تھی تو درحقیقت صداقت و حق پرستی پر یعنی دعوت و تبلیغِ حق و احیائے شریعت و قیام فرضِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا اصل مقصد تھا۔ بعد میں اس میں بہت سی نئی باتیں اور حدِ غلو سے بھی گذرے ہوئے اعتقادات شامل ہوگئے جس کی طرف انتساب بہت بڑا گناہ بن گیا۔ جس کو بدنام اور مطعون کرنا ہوتا، اس کا انتساب اس فرقہ سے کردیتے تھے، اور غریب مطعون اور نشانۂ ملامت بن جاتا۔ اسی ظلم ناروا کے سلسلہ میں بہت سے ایک زمانہ میں بہت سے لوگ شکار رہے تھے۔ ان کا حال مولانا نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے:

کتاب کا بڑا حصہ اصحابِ دعوت و عزیمت کے تذکرہ کے سلسلہ میں آٹھویں صدی کے صاحب السیف والقلم آیۃٌ من آیات اللہ، مجاہد جلیل حافظ تقی الدین احمد ابن تیمیہ حرانی کے حالات و سوانح کے لئے وقف ہے دیکھئے کس زور شور سے ان کا ذکر کرتے ہیں، فرماتے ہیں، آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب دعوۃ عامۂ امت، و تجدید شریعت و احیاء السنۃ بعد موتہا و اخماد البدعۃ بعد شیوعہا و ارتفاعہا کی روح القدس نے آیۃ من آیات اللہ و حجۃ قائمۃ من حجج اللہ، شیخ المصلحین، و ملاذ المجددین، سند الکاملین و امام العارفین، وارث الانبیاء و قدوۃ الاولیاء حضرت شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وجودِ مبارک میں ظہور کیا۔ اور عہدِ اوّل تمام ممالک دعوت و تجدید کی ریاست و نیابت اور تنبیت

مقام اس مجددِ اعظم کے سپرد کیا گیا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مؤلفِ تذکرہ کی نگاہ میں اس امام وقت کی کتنی عظمت اور اس کی مافوق العادۃ شخصیت اور اس کے مجاہدانہ کارناموں کا ان کے قلب و دماغ پر کتنا اثر تھا۔ وہ علامہ کی جد و جہاد سے لبریز زندگی سے بے حد متاثر تھے۔ اور ان کو مجددین و مصلحین امت میں ایک نشانِ امتیاز کا مالک سمجھتے تھے، انہی کے نقشِ قدم پر خود بھی چلے، اور عام امت کو بھی چلنے کی دعوت دی۔

ہندوستان میں علامہ ابن تیمیہ کو سب سے پہلے مولانا شبلیؒ نے رُوشناس کرایا اور اس پر ایک زبردست مضمون لکھا۔ جو الندوہ میں شائع ہوا ہے۔ اور بعد میں ان کے مقالات کے مجموعہ میں بھی آ گیا، ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دُوسرے بزرگ ہیں، جنھوں نے علامہ کی طرف اعتنا کیا، اور ان کے حالات اس کتاب میں گو ضمناً ہی سہی، بڑی تفصیل سے لکھے اور اب تو بحمداللہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے تاریخِ دعوت و عزیمت کے سلسلہ میں علامہ اور اُن کے بعض جلیل القدر تلامذہ مثلاً حجۃ الاسلام علامہ ابن قیم اور ابن رجب وغیرہ کے حالات میں پوری ایک کتاب دار المصنفین کی طرف سے شائع ہو گئی ہے۔

تذکرہ کا اندازِ تحریر اتنا عالمانہ، اتنا محققانہ، اتنا مورخانہ، اتنا باوقار، اتنا ساحرانہ اتنا مؤثر اور دل کش ہے کہ قاری بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ کاش مولانا اپنی صحافتی و سیاسی و ملی اور قومی سرگرمیوں سے ہٹ کر ساری عمر یہی کرتے رہتے، اور کچھ نہ کرتے تو علم و ادب کی کتنی بڑی خدمت انجام پا جاتی، اور اُردو کا خزانہ ان کی کاوشِ فکر کے کتنے جواہر پاروں سے پُر ہو جاتا۔ اس وقت بے اختیار مولوی عبدالحق بی اے بابائے اُردو کی رائے یاد آ رہی ہے۔ جو انھوں نے ایک موقع پر لکھی ہے۔ کہ دو آدمیوں کی ادبی خدمات سے محروم ہو جانے سے اُردو ادب کو بڑا شدید نقصان پہونچ گیا۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار جو اُردو کے بہترین نثار، صاحبِ طرز و انشا پرداز اور باکمال مترجم تھے، ان کی ذات سے ملک و ملت کو فائدہ پہونچا یا نہیں، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن علم و ادب کو تو شدید نقصان پہونچ گیا۔ قدرت نے انکی تخلیق علم و ادب ہی کے لئے کی تھی، لیکن ہماری زبان کی یہ بد قسمتی تھی کہ انھوں نے اپنا استعمال دوسرے کاموں کے لئے کیا جن کے لئے ہندوستان میں آدمیوں اور کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی بہرحال اس اہم اور ہر طرح کے دینی و مذہبی و تاریخی معلومات و مباحث و مسائل سے لبریز کتاب کی بہ حیثیت تصنیف بھی سُن لیں جو ایک معجزہ سے کم نہیں۔

یہ کتاب مولانا نے محض بطور تفریحِ دماغ کے قلم برداشتہ لکھدی تھی، اس میں مصنفانہ ترتیب و تہذیب نہیں ہے۔ نہ مولانا نے اس کا اہتمام کیا، نہ اس کے لئے ان کو فرصت ہی تھی، اور نہ اُن کی نگاہ میں اس کی کچھ زیادہ وقعت۔ فضل الدین احمد صاحب مولانا کے ایک خاص عزیز تھے۔ البلاغ پریس کے مہتمم و منیجر تھے۔ مولانا کے مزاج میں ان کو بڑا دخل تھا۔ وہ جو بھی فرمائش کرتے تھے۔ مولانا کی عنایت خاطر وہ پوری ضرور کرتے تھے۔ یہ کتاب بھی انہی کی فرمائش اور شوق و اصرار سے لکھنا شروع کی تھی۔ مقصد تو فضل الدین احمد کا ان کی ذاتی سوانح عمری تھا جس کا تقاضا ان وقتوں میں سب کا بڑا شوق تھا لیکن مولانا نے اس کا آغاز اپنے ماوری و پدری سلسلہ کے اکابر و شیوخ کے حالات و سوانح سے کیا۔ اور وہ چھپتا چلا گیا۔ اگر فضل الدین احمد ان کے ذاتی حالات کے لئے مُصر نہ ہوتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ سلسلہ دراز کہاں جاکر رُکتا۔ اور پھر یہ پورا تذکرہ کتنی جلدوں میں آتا۔ مولانا جس قدر اوراق لکھتے جاتے تھے۔ فضل الدین احمد صاحب کے پاس بھیجتے جاتے تھے اور آئندہ سلسلۂ تحریر قائم رکھنے کے لئے ایک سادہ صفحہ پر پچھلی آخری سطر یا اس کے چند الفاظ بطور یادداشت کے لکھ لیتے تھے۔ درمیان میں ہنوز دوسری تصنیفات و تالیفات اور تحقیق و مطالعہ کا سلسلہ جاری رہتا، جن میں تفسیر ترجمان القرآن زیادہ اقدم تھی جب کبھی دماغ آرام لینا چاہتا اور تفسیر وغیرہ کا سلسلہ کسی مزید تحقیق کے لئے رکتا، تو دو چار گھنٹے کے لئے پھر اس طرف متوجہ ہو جاتے اور سادہ ورق کے انہی چند الفاظ سے آگے لکھنا شروع کر دیتے، یہ علم و حافظہ و استحضار کا وہ کمال ہے۔ جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، مولانا کو اس کے چھپنے چھپانے کا سر دست کوئی خیال نہیں تھا اور پھر اس مشغولیت و مصروفیت کے عالم میں وہ اس کے چھپنے اور پھر منظرِ عام پر لانے کا خیال کر بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن فضل الدین احمد صاحب اس کے چھپوانے کے لئے بے قرار تھے۔ اور انھوں نے مولانا کی نظرِ ثانی اور اُن کی مرضی اور اطلاع کے بغیر البلاغ پریس میں اس کو چھپوانا شروع کر دیا، جب اخبارات کے ذریعہ یکایک اس کی طباعت کا مولانا کو رانچی میں جہاں وہ نظر بند تھے علم ہوا، تو سخت برہم ہوئے، اور اصرار کرکے اس کی طباعت کا سلسلہ موقوف کرا دیا۔ اور لکھا کہ ہرگز ہرگز کتاب شائع نہ کی جائے، فضل الدین احمد صاحب مولانا کے بڑے چہیتے تھے۔ بھلا وہ کب ماننے والے تھے۔ مولانا کی اس ناراضامندی اور غصّہ و غضب سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، اور اپنا اصرار قائم رکھا اور کسی نہ کسی طرح خوشامد کرکے مولانا کو بالآخر راضی ہی کر لیا۔ اور کتاب دوبارہ پورے اہتمام کے ساتھ چھپنا شروع ہو گئی، کتاب بہت ضخیم تھی، اور سامانِ طباعت حد درجہ گراں اور نایاب مجبوراً بعض فصلیں اور بڑے بڑے قیمتی فٹ نوٹ نکال دیئے گئے، جو بجائے خود مستقل مضمون کا کام رکھتے تھے اس وقت دوسری جلدوں کے لئے اُٹھا رکھے گئے۔

تذکرہ کی جو جلد ہمارے پیشِ نظر ہے وہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد جس کے پہلے حصّہ میں مولانا کے خاندانی حالات کا بقیہ حصّہ ہے اس کے پریس میں جانے اور چھپنے کی افسوس ہے کہ سرے سے نوبت ہی نہیں آئی، اور ظاہر ہے کہ مولانا جب پہلی ہی جلد کے چھپنے کے مخالف تھے تو بقیہ جلدیں کیا چھپتیں، اس کے بعد مولانا زندگی کے دوسرے مشاغل اور کاروبار میں مصروف ہو گئے، اور سارا علمی و تصنیفی پروگرام جو انتہائی اہتمام اور شوق و ولولہ کے ساتھ جلدی تھا نامعلوم مدّت کے لئے ملتوی ہو گیا، اور پھر ساری عمر دوبارہ اس طرف توجّہ کرنے کی انکو فرصت ہی نہ مل سکی، جب ان کی عزیز ترین تفسیر تک نا تمام رہ گئی۔ جو اگر پوری ہو گئی ہوتی تو وہ محض جیسا کہ ان کا پلان تھا تفسیر ہی نہ ہوتی، قرآن کی پوری انسائیکلوپیڈیا ہوتی تو تذکرہ کے مکمل ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی تھی، بہرحال دوسری جلد کے دوسرے حصّہ میں خود مولانا کی سوانح عمری تھی —— جو فضل الدین احمد صاحب وقائع و حالاتِ زندگی کے متعلق سوالات کرتے گئے ہیں، اور مولانا جوابات دیتے گئے ہیں، اس طرح سے یہ بھی درحقیقت مولانا ہی کی خود نوشت سوانح عمری ہے جو سوانح عمری تو کم جیسا کہ مولانا کا ذوق تھا، اس سے کہیں زیادہ اُس دَور کی پُوری علمی و ادبی و سیاسی تاریخ ہوگی، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ماتبقی مسودہ کس عالم میں ہے۔

جس خود نوشت سوانح عمری کا آج کل شہرہ ہے۔ وہ مولانا کی قلم بند کی ہوئی نہیں ہے، پروفیسر ہمایوں کبیر کے دست و قلم کی رہینِ منت ہے۔ اور حیرت انگیز طور پر وہ بجائے اُردو کے انگریزی میں ہے جس کو شاید مولانا نے زبانی ڈکٹیٹ کیا ہے۔ اور انھوں نے انگریزی میں لکھ دیا ہے بہرحال وہ مولانا کی نظرِ ثانی کی سعادت حاصل کر چکی ہے اور اس لحاظ سے مولانا پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ان سب میں مستند اور قابلِ اعتبار ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی سوانح عمری کے لئے اُردو ہی موزوں تھی، کاش کہ وہ اُردو ہی میں لکھی جاتی۔ اور مولانا سے پھر اس پر نظرِ ثانی کرائی جاتی اور اس پر جو حک و اضافہ ہوتا، اس کو بطور یادگار ہمیشہ کے لئے محفوظ اور کسی عجائب خانہ میں رکھوا دیا جاتا۔ اور اس کی نقل کراکے چھپوایا جاتا۔ بہرحال اس وقت تک مولانا کی کوئی معتبر اور جامع سوانح عمری نہ ہونے کی حالت میں، یہ انگریزی ہی کی سوانح عمری بہت غنیمت ہے، اور

پرستارانِ آزاد کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ، لیکن وہ اُردو جاننے والے حلقہ بگوشوں کے کس کام کی، یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس کا ان کے پاسِ خاطر سے کبھی اُردو میں بھی ترجمہ ہو جائے، لیکن یہ ہے کس قدر تعجب انگیز بات کہ اُردو کے ایسے صاحب طرز انشا پرداز کی سوانح عمری جس نے اپنے منفرد اسلوبِ تحریر سے اُردو کو الہامی اور رُوحانی زبان کا درجہ دیدیا ہو بجائے اس کی خاص زبان کے انگریزی میں لکھی جائے، جس سے اس کا دُور کا بھی کوئی تعلق نہ رہا ہو، یہ تو ایسا ہی ہے کہ لندن میں بیٹھ کر شیکسپیر کی سوانح عمری عبرانی یا عربی میں لکھی جائے، یا والمیک اور کالی داس کے وقائع زندگی، ہندی کو چھوڑ کر فرانسیسی یا پرتگالی میں قلم بند کئے جائیں یا مخاطب تو عربی داں ہو، اور گفتگو اُس سے پالی زبان میں کی جائے، سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا نے اس غرابت کو انگیز کیسے کیا، اور اگر انگیز کیا اور اس کے ساتھ پسند بھی کیا، تو اس میں کیا خاص مصلحت ان کے پیشِ نظر تھی، جبکہ وہ انگریزی کو ناپسند بھی کرتے تھے، مولانا کا مخاطب تو اُردو داں ہی طبقہ تھا اور وہی مولانا کی تقریر اور تحریر سے متاثر بھی ہوا، لیکن اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بہر حال یہ سوانح عمری جو مستقبل قریب میں بہت آب و تاب سے شائع ہو گی چاہے اس کا انتساب مولانا ہی سے ہو۔ اور اس کا ایک ایک حرف جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے مولانا کی نظر سے گذر بھی چکا ہو، لیکن اُس پر کسی طرح مولانا کی خود نوشت سوانح عمری کا اطلاق نہیں ہو سکتا، نہ وہ اس اعتنا و توجہ و اعتبار کی مستحق ہے جتنی کہ ان کی کوئی اُردو کی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی۔

مولانا کی خود نوشت سوانح عمری کسی معنی میں اگر ہو سکتی ہے تو وہی ہو سکتی ہے جسکو فضل الدین احمد نے مرتب کیا تھا۔ اور جو بد قسمتی سے مسودہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

مرزا فضل الدین احمد کو درحقیقت ضرورت ان کے حالات کی تھی، لیکن مولانا لکھنا نہیں چاہتے تھے، اور کوشش انھوں نے اپنی حد تک اسی کی کی کہ بات ٹل جائے، پہلی جلد کی طباعت اختتام کو پہونچی، تو اس خیال سے کہ اور جلدوں کی طباعت کی نوبت آئے یا نہ آئے، اور پھر اس کے لئے زحمتِ انتظار کہاں تک کھینچی جائے، انھوں نے اس میں شامل کرنے کے لئے مولانا سے ذاتی حالات قلم بند کرنے کی پھر درخواست کی، لیکن مولانا بالکل خاموش ہو گئے، مگر فضل الدین احمد صاحب کا اصرار برابر قائم رہا۔ جب بہت زیادہ مجبور ہوئے اور سمجھے کہ اب جان بچانی مشکل ہے، تو اپنے دلِ زار کی حکایتِ خونچکاں لکھنی شروع کی، مگر بیس ہی صفحوں میں ختم کر دی اور آخر میں لکھ دیا کہ اب میں اس سے زیادہ اپنا حال نہیں لکھ سکتا، لیکن انھوں نے جو کچھ بادلِ ناخواستہ حوالہ قلم بند کیا تھا۔ توقع کے خلاف تمام تر استعارات و تشبیہات کے رنگ میں کیا کیسر شاعری تھی، جس سے خود مرزا فضل الدین اور مولانا کے ہزاروں عقیدت مندوں کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی، جو ان کے مفصل اور سادہ حالات و وقائع زندگی کے لئے تشنہ تھے۔ فضل الدین احمد صاحب نے انہی اوراق کو جن پر سوانح عمری کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کتاب کے آخر میں شامل کر دیا، جن سے ادب و زبان کا لطف تو بلاشبہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اگر ان سے مولانا کے کسی قسم کے بھی حالات معلوم کرنا چاہیں تو ہزار تلاش و جستجو کے بعد بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مولانا کی اگر کوئی خود نوشت سوانح عمری موجود ہے تو تذکرہ کے آخر کے یہی چند اوراق ہیں ان پر کوئی بڑی عمارت کھڑی کرنی بہت مشکل ہے، اس سے زیادہ اور واضح حالات تو انھوں نے غبارِ خاطر میں لکھے ہیں، اس میں انھوں نے پورے ایک خط میں اپنی زندگی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، لیکن اب اس کا منضبط کرنا ان کے سوانح نگاروں کا کام ہے، ایک خط ابھی حال میں قومی آواز کے کسی سنڈے ایڈیشن میں کسی گمنام صحافی کے نام شائع ہوا ہے، اس میں بھی ان کے بچپن، اور طالب علمی کے کسی قدر حالات آگئے ہیں، اُن کو بچپن میں شاعری کا بھی ذوق تھا اور کلکتہ کے مشاعروں میں بڑے شوق و ذوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزلیں پڑھتے تھے، لیکن ان کو سن کر لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ انہی کی کہی ہوئی ہیں، انہی میں ایک غالب کے شاگرد شوخ رام پوری بھی تھے، انھوں نے کسی بہانہ سے اُن کی شاعری کا امتحان لیا اور یہ کامیاب ہو گئے، تو ان کو بڑی حیرت ہوئی اور کہا، کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو اور سخن گوئی کا یہ عالم ہے۔ خدا کی قسم کسی طرح عقل باور نہیں کرتی صحافی نے جو غالباً مولانا مہر تھے، غالب کے متعلق کچھ باتیں دریافت کی تھیں۔ اسی کے سلسلہ میں اپنے متعلق بھی یہ چند سطریں لکھدیں۔

لیکن اُن کا یہ ذوقِ شاعری جو تمام تر کلکتہ کے مشاعروں کا رہینِ منت تھا اور صرف غزل گوئی تک محدود تھا، ہمیشہ کے لئے اُن کے ذوقِ نثر نگاری و انشا پردازی کے آگے دب گیا۔ اُن کے جو دو چار شعر محفوظ رہ گئے ہیں، وہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پایہ سے بہت فروتر ہیں ـــ اور انھوں نے بہت اچھا کیا، کہ شاعری کے پیشہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

شاعری چھوٹی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اور بہت سے کمالات سے نواز دیا۔ اور پھر شاعری علم و فضل کے لئے کچھ ایسی ضروری چیز بھی نہیں، کہ اس کی کمی محسوس کی جا سکے اور پھر وہ نثر میں درحقیقت شاعری ہی تو کرتے تھے، جس کو پڑھ کر بڑے بڑے شعرا اپنی شاعری بھول گئے ـــ مولانا حسرت موہانی کا یہ مشہور شعر اسی تاثر کا نتیجہ تھا۔

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر ✽ نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا نظم میں شاعری نہیں، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ساحری کرتے تھے اور بالکل خداداد بات تھی، جو کسب سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، تقلید تو بہت سے لوگوں نے کرنی چاہی مگر کامیاب کوئی بھی نہیں ہوا۔ بلکہ بہت سے اس نقل میں بگڑ ہی گئے۔ جس طرح اب تک مولانا محمد حسین صاحب کی آبِ حیات کے رنگین اسلوبِ نگارش کا تتبع نہیں کیا جا سکا، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے معجزانہ اسلوبِ تحریر کا بھی تتبع کسی سے نہ ہو سکا۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

صادق بستوی

اے بہارِ گلشن و نازِ چمن
اے فدائے قوم و شمعِ انجمن
تو بہ صادق لکھو سالِ وفات
اے عمادِ عظمت و شانِ وطن
۱۹۵۸ء

دیگر بہ صنعتِ توشیح

صادق بستوی

شریف النفس عالی ذات املے
غیور و پاک طینت نیک نامے
عظیم المرتبت عالی نسب بود
زعیم ملک و ملت بوالکلامے



دلائل السنن والآثار حصہ اوّل

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کا گراں قدر تبصرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اما بعد میں نے مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی زیدی مجدہم کی مبارک تصنیف دلائل السنن والآثار حصہ اول کو ابتدا سے اخیر تک حرفاً حرفاً پڑھا اور اس سے قبل حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور نے بھی بالاستیعاب اس کتاب کو دیکھا تھا اور کہیں کہیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی تھی۔ ماشاء اللہ کتاب مذکور اپنے مقصد میں نہایت کامل اور مفید ہے جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ہندوستان میں اس مقصد کے لئے کوئی ایسا مجموعہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ عربی اور فارسی میں بھی کوئی ایسا مجموعہ جس میں اہل زیغ وعناد اور ملاحدہ کے شبہات اور اعتراضات متعلقہ علم حدیث وسنن کو اس طرح واضح طور پر دفع کیا گیا ہو اور سب ابحاث کو ایک جگہ جمع کرکے پوری روشنی ڈالی گئی ہو آج تک تصنیف نہیں کیا گیا مصنف مد اللہ ظلہ العالی نے حسب ضرورت زمانہ نہایت عرق ریزی اور محنت سے امور متعلقہ ضروریہ کو حسب طریقہ فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت جمع اور مرتب فرمایا ہے اور اہل زیغ وعناد کے نزغات ووساوس کو جڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء آمین ثم آمین۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کریم کارساز مصنف کی کوششوں کو اپنی قبولیت کاملہ سے نوازے اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع عظیم عطا فرمائے۔ یہ کتاب مقبول ہو، واللہ ولی التوفیق والسداد وبیدہ القبول فی المبدأ والمعاد

(ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ)

نوٹ: کتاب مذکور بوجوہ اب تک شائع نہیں ہوسکی اور نہ بظاہر جلدی شائع ہونے کی کوئی امید ہے۔ اس لئے مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کسی مکتبہ یا کسی ادارہ کو کتاب کی اشاعت کا خیال ہو تو وہ مندرجہ ذیل پتہ پر خط وکتابت فرمائیں

مولانا نجم الدین اصلاحی سدھاری اعظم گڑھ

امام الہندؒ کا طرزِ خطابت و تقریر

از مولانا عبدالشاہد شروانی

"حضرت مولانا آزادؒ کا طرزِ خطابت و تقریر ایک مستقل موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ پیش نظر مقالہ میں مولانا عبدالشاہد شروانی صاحب (علی گڑھ) نے ایک مشاہد و مبصر کے انداز میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔" ادارہ

یوں تو مولانا ابوالکلام آزاد اپنے تدبر و تفکر، علم و فضل، ادب و انشاء، سیاست و ذہانت اور ہدایت و ارشاد میں ہند و بیرونِ ہند کے علماء و اکابر میں وہ ممتاز و بلند مقام رکھتے تھے کہ ابھی تک ان کے زمانہ و عہد میں کوئی دوسرا نہیں پہونچ سکا مگر ہندوستان کے عوام میں انہیں مقبولیتِ عظیمہ اُن کی بے مثال خطابت ہی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔

تحریر و صحافت کا جہاں تک تعلق ہے وہ روشِ خاص جس پر مولانا چلے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم رہے۔ مقلدین و معاندین دونوں نے اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن

این گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھنے والوں نے اسے منہ چڑانا سمجھا اور لکھنے والوں نے اپنی کوتاہ قلمی اور مولانا کی اعجاز رقمی کا اقرار کیا۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے برمحل حوالے، جابجا اقوال و اشعار کا برجستہ استعمال، عبارت کا تسلسل اور عمدگیِ مطالب کے ساتھ ندرتِ بیان مولانا کی تحریر کی وہ خصوصیت رہی جسے کوشش و سعی کے باوجود دوسرے حاصل نہ کرسکے۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم جیسے پختہ کار و کہنہ مشق شاعر کو کہنا پڑا ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر ٭ ٭ ٭ نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

اُردو کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم چیخ اٹھے:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہوچکا ہوتا تو یا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر منتخب ہوتی یا اقبال کی نظم"

پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے مسلّم ادیب و مشہور انشاء پرداز تو یہاں تک کہہ بیٹھے:۔

"الفاظ نبوت والوہیت کا جامہ پہنے ہوئے ہوتے ہیں"

مولانا موصوف عنفوانِ شباب ہی سے تحریر و تقریر کے میدان میں اشہبِ زبان و قلم کو سرپٹ دوڑانے لگے تھے۔ جن لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو مذہبی، علمی اور سیاسی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی اعجاز بیانی اور سحر آفرینی کے قائل ہیں۔

نصف صدی قبل کے ایک عینی مشاہد کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

"مجلس ندوۃ العلماء اپنی امتیازی صفات کی بنا پر روشن خیال علمائے ہند کی قیادت کر رہی تھی، ملک میں نمائندگی کا حق صرف اس جماعت کو حاصل ہے، اپنے بہترین نصب العین کی وجہ سے اس کے سالانہ جلسے اپنی نظیر آپ ہوا کرتے تھے۔ اس کا ایک سالانہ اجتماع ہے ......

صدارت کے لئے موجودہ دنیائے اسلام کی ایک عظیم الشان ہستی علامہ رشید رضا مرحوم ایڈیٹر المنار (مصر) کے نام کا غلغلہ مچا ہے اور تشریف آوری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ دارالعلوم کے طلبہ چشم براہ ہیں۔ جذباتِ مسرت و فرطِ جذبات سے لکھنؤ کا ذرہ ذرہ استقبال بنا ہوا ہے ...... کہ اہلاً و سہلاً کے نعروں سے لکھنؤ کی فضا گونج اٹھی، جوشِ اشتیاق سے فٹن کے گھوڑے کھول دیئے جاتے ہیں اور "حضرت علیہ" کے ہم علم بردار کو سر آنکھوں پر قیام گاہ پہنچایا جاتا ہے۔

ندوۃ العلماء کا اجلاس ہو رہا ہے، اس عالمِ بے بدل کو اس بات کا احساس ہے کہ علمائے ہند کے بہترین دل و دماغ یہاں موجود ہیں، اس لئے جب وہ تقریر کرتا ہے تو "بازارِ عکاظ" کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جواہرات ہیں جن کو بڑی بے دردی سے بکھیرا جا رہا ہے، جوشِ بیان کا یہ عالم ہے کہ جیسے ایک بادل برس رہا ہو، اور کچھ بجلیاں ہوں جو خرمنِ ہوش و عقل پر گر رہی ہوں، گو سامعین کا اکثر حصہ تقریر سمجھنے سے قاصر ہے لیکن طرزِ بیان سے سبھی مسحور ہیں۔ کامل ۲½ گھنٹے کے بعد جب خطیبِ مصر بیٹھتا ہے جنھوں نے سمجھا وہ خطاب کی سحر طرازیوں سے مسحور ہیں اور جنھوں نے نہیں سمجھا وہ اپنے قصورِ علم و فہم پر شرمسار اور ترجمہ کے متمنی ہیں ...... کہ ایک نوجوان، علامہ شبلی صاحب (جو اس مجلس کے روحِ رواں تھے) کے پاس آکر عرض کرتا ہے کہ اگر تقریر کا ترجمہ ہوجاتا تو افادیتِ عام ہوجاتی، علامہ اس جرأت پر متحیر، رشید رضا کی تقریر کا بلا توقف ترجمہ!

اس تصور سے اس بے باکی پر کچھ حیرت و برہمی ہوئی مگر نوجوان کے اصرار پر اجازت مل جاتی ہے، نوجوان اسٹیج پر آتا ہے تقریر کا ترجمہ اور مفہوم بیان کرتا ہے مگر!

اپنے اعجازِ بیان اور جوشِ روانی سے سارے مجمع کو مسخر کرلیتا ہے، خطاب کی عشوہ طرازی دورِ جام دیتا ہے جس نے رندوں کو ایک مستقل کیف میں مبتلا کردیا ہے الفاظ برقِ خرمن سوز کی طرح سامعین کے عقل و خرد پر گر گر کر انہیں بے خود کر رہے ہیں، کئی گھنٹے تقریر کرنے کے بعد اترتا ہے تو آگے بڑھ کر علامہ شبلی اس کو چپٹا لیتے ہیں۔

اس نوجوان کا نام احمد ہے۔ کنیت ابوالکلام"

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم اپنے ایک مکتوب میں خود مولانا ابوالکلام کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بات میں بات" جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں اب تک تازہ ہے آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں حالانکہ تیس برس گذر گئے، سید رشید رضا کی عربی تقریر کا ترجمہ آپ سنا رہے ہیں، کان سن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہو کر میں نے اسٹریچی ہال (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں) ان کی عربی کی آرزو کردی تھی"

خطابت کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ مقرر حاضرینِ مجلس پر اس طرح چھا جائے کہ انھیں "طاعت کردن و گردن نہادن" کے سوا چارۂ کار نہ رہے۔ مخالفین و معاندین بلکہ آمادگانِ شر و فساد کو بھی تصرف

مجال انکار و دم زدن نہ رہے بلکہ وہ مسحور و مبہوت ہو کر رہ جائیں اور ان پر بھی معتقدوں اور عقیدت مندوں کی طرح وجد طاری ہو جائے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا مختلف مواقع پر بارہا تجربہ ہوا ہے کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ان کے لگائے ہوئے نعرے کو لگاتے اور چار چار پانچ پانچ گھنٹے خاموشی و سکون سے مسلسل تقریریں بیٹھے وجد کرتے روتے اور سر دھنتے دیکھا ہے۔

شاہ صاحب کی شان خطابت کا مظاہرہ ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کے جلسہ اردو پارک دہلی میں پورے طور پر ہوا جبکہ وزارتی مشن لندن سے ہندوستان آیا ہوا تھا اور دوران جنگ کا وعدۂ آزادی ہندوستان دنیا کو دکھانے کے لئے پورا کرنا چاہتا تھا، تمام جماعتوں کے لیڈروں سے سلسلۂ ملاقات و گفتگو جاری تھی، مجلس احرار اسلام اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے مشترکہ جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا تاکہ وزارتی مشن کے سامنے غیر لیگی مسلمان اپنا نقطۂ خیال پیش کر سکیں، اس جلسے میں ملکی نمائندوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی نمائندگان پریس بھی آئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی شاہ صاحب کی تقریر سننے کے شوق میں اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ پہونچے تھے، سر اسٹیفورڈ کرپس بھی غیر لیگی مسلمانوں کی نمائندگی دیکھنے کے لئے جلسہ گاہ کا چکر لگا رہے تھے، دہلی میں اتنا شاندار اجتماع کسی کانفرنس میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اردو پارک میں جہاں تک نظر جاتی تھی انسانوں کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ جنوری ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے میں میجر شاہ نواز، کرنل ڈھلن اور سہگل، آزاد ہند فوج کے سالاروں کی رہائی پر جو عظیم الشان جلسہ گاندھی گراؤنڈ میں ہوا تھا اس کے بعد دہلی کی سیاسی تاریخ میں اتنا بڑا جلسہ آج تک نہیں ہو سکا۔ تقریباً دو ڈیڑھ لاکھ کا اجتماع تھا، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریروں کے بعد شاہ صاحب نے چار گھنٹے تقریر کی جس میں مولانا ابو الکلام آزاد پر اظہار اعتماد اور مسٹر محمد علی جناح پر عدم اعتماد، متحدہ ہندوستان کی حمایت اور نظریۂ پاکستان کی مذہبی و سیاسی طور پر مخالفت کی گئی تھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے عام رجحان کی بنا پر کتنا خطرناک موضوع تھا، لیکن شاہ صاحب کی سحر آفریں تقریر نے "مولانا آزاد زندہ باد" اور "متحدہ ہندوستان زندہ باد" کے متفقہ نعرے لگوائے، پاکستانی سورما جلسہ کو درہم برہم کرنے کی سازش بنا کر آئے تھے اور اپنے تمام حربوں کے ساتھ موجود تھے مگر مخالفت میں ایک آواز بلند نہ کر سکے۔

مولانا آزاد کا کمال خطابت یہ تھا کہ وہ عوام و خواص دونوں کو متحیر بنا دیتا تھا اور نہ صرف وقتی جذباتی طور پر بلکہ مستقل طور پر دلائل و براہین کی روشنی میں ساکت و صامت کر دیتا تھا۔

مولوی نصر اللہ خاں عزیز بی اے ادبی و صحافتی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، مدیر اور کوثر کے مدیر کی حیثیت سے ہر ادب دوست کے جانے پہچانے آدمی ہیں وہ خطبات آزاد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"ابو الکلام کی خطابت کا اندازہ صرف وہ خوش قسمت لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس جادو بیاں مقرر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے، بعض لوگ ان کو ہندوستان کا ڈماستھینز کہتے ہیں، کچھ بد مذاق انہیں گلیڈ اسٹون اور سسرو سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ ابو الکلام کی عظمت کو ڈماستھینز اور سسرو اور گلیڈ اسٹون کی خطابت کے ساتھ ملا دینا ابو الکلام کی خطابت کی توہین ہے اور بلا شائبہ ریب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس پائے کا مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا، ذرا ابو الکلام کے خطبے کو پڑھو اس میں بجلی کی کڑک، رعد کی گرج، دریا کی روانی، سبزہ زاروں کی طراوت، پہاڑوں کا شکوہ، گلستانوں کا جمال، ناہید کا نغمہ کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا کہ احساس محسوس کرے گا میں وادئ کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔

میں نے مولانا ابو الکلام کی سب سے پہلی تقریر اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں سنی۔ ایک اکہرے بدن کا سفید رنگ کا نوجوان گویا کسی نے ہاتھی دانت کا انسانی قالب بنا کر اس میں روح پھونک دی ہے، سبز اونی رومال عمامے کی صورت میں سر پہ بندھا ہوا، گویا عرب کے کسی اجتماع

سے کوئی آتش بیاں خطیب مجمع کو مبہوت کرنے ہندوستان میں آگیا ہے یا پھر حسن بیان مجسّم ہوکر صفحہ آفریں ہے۔ اسی روز رات کو دوسری تقریر موچی دروازے کے باہر ہوئی، میں نے اسے بھی سُنا۔ تیسری تقریر گجرات میں، چوتھی امرتسر میں سُنی، ہر موقع کا تاثر آج تک یہ ہے کہ گیس کے ہنڈوں کی روشنی پر رقص کرتا ہوا مضامین تازہ کا ایک سیلاب ہے جو اسٹیج سے ایک غیر معلوم چشمے سے اُبل رہا ہے۔ اور وسیع مجمع پر ابرِ بہاری کی طرح محیط ہے، سننے والے دم بخود دل ہی دل میں وجد کر رہے ہیں۔ "فرمودات" کی حقانیت، استدلال کی پختگی، زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت، اور اندازِ بیان کی پاکیزگی دل اور دماغ، عقل اور جذبات دونوں کی صفوں کو یکساں مسخر کرتی جارہی ہے۔

امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے، مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے، یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی، خطیب تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا، میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کرکے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سُنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔"

امام الہند کے زمانۂ شباب میں تقریر کا ایک واقعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب نے بیان فرمایا کہ ۱۹۲۳ء میں دھوراجی (کاٹھیاواڑ) میں خلافت کمیٹی کا جلسہ تھا، مولانا شوکت علی مرحوم مولانا نثار احمد کانپوری مرحوم وغیرہ شریکِ سفر تھے مولانا آزاد کی تشریف آوری کا اعلان ہوچکا تھا، اتفاق سے مولانا نہ پہونچ سکے، دھوراجی سے دو تین میل دور اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اشتیاق میں ہزاروں انسان استقبال کے لئے پہنچ چکے تھے، مولانا شوکت علی کو جب خاص کارکنوں سے معلوم ہوا کہ یہ بے پناہ ہجوم مولانا آزاد کے استقبال کے لئے آیا ہوا ہے اور مولانا کے نہ آنے پر نہ تو جلسہ کی کامیابی کی امید ہے نہ خلافت کمیٹی کے لئے چندہ ہو سکے گا تو مولانا شوکت علی نے یہ داؤ کھیلا کہ مولانا آزاد سے خواجہ صاحب کی مشابہت (شکل) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موصوف کو مولانا کے لقب سے خطاب کرتے ہوئے گاڑی میں اپنے برابر بٹھالیا اور شاندار جلوس کے ساتھ قصبے کو روانہ ہوئے۔ قصبے میں جو استقبالیہ دروازے بنائے گئے تھے مولانا کے نام کے دروازے تعداد اور سجاوٹ دونوں میں بڑھے ہوئے تھے: ہاتھ چومنے والوں اور نعرے لگانے والوں نے بلکے بھر زخمی مولانا آزاد کو پریشان کردیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے تعارف کراتے ہوئے موصوف کو مولانا آزاد ہی بتاتے تھے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے تنگ آکر اس کی تردید کرنی چاہی تو شوکت صاحب نے اس زور سے نوچا کہ میں بلبلا گیا۔

جب کہ جلسے میں مولانا کی تقریر سُننے کے لئے لوگ ہمہ تن گوش اور سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے۔ شوکت صاحب نے خواجہ صاحب سے اصرار کیا کہ آج کی تقریر مذہبی تقریر ہو اور اس میں آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کا کثرت سے حوالہ دیا جائے۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ جب میں تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو انسانوں کے سمندر کا جوش و خروش دیدنی تھا، فلک شگاف نعروں نے زمین و آسمان ہلا دیئے تھے۔ مولانا کے نام کی تاثیر دیکھئے کہ تقریر ایسی شاندار ہوئی کہ ہزاروں روپئے کی بارش ہوگئی اور مجمع بے حال اور بے قابو ہوکر نعرے لگاتا رہا۔ اسی واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ جہاں مولانا کے نام کی جگہ اُن کا دہن و کام استعمال ہوتا ہوگا وہاں کیا گزرتی ہوگی؟

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں، آنکھوں کی التجائیں

خوش قسمتی سے مجھے بھی اس راہ میں کچھ مواقع ملے ہندوستان کے بہت سے خطیبوں کو بارہا سنا ان سب میں نواب بہادر خاں حیدرآبادی مرحوم اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ممتاز نظر آئے، آخر الذکر کو پانچ پانچ گھنٹے مسلسل بولتے دیکھا ہے، بچے بوڑھے، جوان عورت، مرد سبھی کو مسحور پایا ہے، ۲ را اپریل ۱۹۴۷ء کو ایشیائی کانفرنس کے کھلے اجلاس میں اختتامی اور صدارتی تقریر کرتے ہوئے بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو مشہور خطیبۂ ہند کی پہلی بار تقریر سُنی ۶۸ سال کی عمر، ہفتہ بھر کی بیمار اور کانفرنس کے اہتمام میں مصروفیت اور تھکن کے باوجود جوشِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ لاکھوں کا مجمع آہ اور واہ کر رہا تھا، تمام مجلس پر بلا کا سکوت طاری تھا۔ تقریر انگریزی میں تھی لیکن نہ سمجھنے والے بھی مبہوت تھے، آواز کی گرج محفل پر بجلی بن کر گرتی تھی، کبھی سننے والوں کے لب پر آہ و بکا تھی تو کبھی کلماتِ تحسین و آفریں، اس سے پہلے انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر شہریار، پنڈت جواہر لال نہرو، اور مہاتما گاندھی بھی تقریر کر چکے تھے لیکن یہ کیفیت مجمع پر کسی وقت بھی طاری نہیں ہوئی تھی۔

ان سب خطیبوں سے جب امام الہند کا مقابلہ کرتا ہوں تو یہی کہتے بنتا ہے ؎

ترا اے نو بہارِ باغِ عالم واہ کیا کہنا،
نہ ایسا رنگ پھولوں میں، نہ ایسے پھول گلشن میں

ہندوستان کی تقسیم کے بعد فسادات کا طوفان اور بھونچال دارالسلطنت دہلی اور پنجاب پر خصوصاً اور اکثر اطراف ملک پر عموماً جس طرح آیا وہ ابھی کل کی بات ہے، یہ طوفان اتنا زبردست تھا کہ امام الہند جیسے کوہِ وقار شخصیت کو بھی گوشۂ عافیت سے نکال کر میدانِ خطابت میں بہا لایا۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں "جب دہلی میں محشرستان کا سماں تھا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جامع مسجد میں پناہ گزیں تھے" اس وقت امام الہند نے اپنا عہد توڑ کر قوم کو خطاب کیا، جمعہ کی نماز کے بعد شری راج گوپال آچاریہ گورنر جنرل ہندوستان کو ساتھ لے کر آئے پہلے راجہ جی نے پھر موصوف نے خطاب فرمایا، تقریر کے بعد بندھے ہوئے بستر کھل گئے اور بھاگتے ہوئے قدم جم گئے، آج دلی میں جو مسلمان نظر آرہے ہیں ان میں بڑی تعداد انہیں لوگوں کی ہے جنھوں نے امام الہند کی تقریر سُننے کے بعد راہِ فرار سے مُنہ موڑا،

مُشتے نمونہ از خروارے :-

"یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گُم کردیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے، چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہوجانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ رخصت نہیں ہوگئے، اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو سال قبل عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا

ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم

ولا ھم یحزنون ؁

(جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم)

ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں، یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے پہلے تم کبھی اس حالت میں نہ تھے ....

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا، یہ بادلوں کے پانی کا سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے، یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس پہلے کا پُرانا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان!

لا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین

آج کی صحبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس قابو میں رکھو، اپنے گرد و پیش، اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں، یہ تو دل کی دوکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زباں ز نطق فرو ماند، رازِ من باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

عظیم اور عہد آفریں شخصیتوں کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے بلند ہو کر آنے والے دور کے تقاضوں کو محسوس کر لیتی ہیں۔ ان کی نگاہوں میں وہ ساری حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ جس سے زمین پر چلنے والا ایک عام انسان بے خبر ہوتا ہے۔ مولانا آزاد انہیں لوگوں میں سے تھے جو اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والے زمانے کے دل کی دھڑکنیں محسوس کر لیتے ہیں۔ مولانا عالمگیر انسانیت کے علمبردار تھے انھوں نے اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی اس منزل کی طرف رہنمائی کی جہاں نہ کوئی ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان سب لوگ صرف انسان ہوتے ہیں۔ آزادی سے پہلے مولانا کے پیغام کی جتنی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ ضرورت آج آزادی حاصل کرنے کے بعد ہے۔

ڈاکٹر سری کرشن سنہا ——— وزیر اعلیٰ بہار

جیل کے جھروکوں سے

از مولانا اسد اللہ خاں صاحب

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۳۰ء کے موسم گرما میں کلکتہ سے اسیر ہو کر فرنگی سارجنٹوں کی حفاظت میں بذریعہ ریل گڈھ مکتیسر اور وہاں سے بذریعہ کار میرٹھ جیل لائے گئے اس وقت حضرت مولانا کانگریس کے ڈکٹیٹر تھے۔ اس گرفتاری سے چند روز پیشتر بھی میرٹھ تشریف لائے تھے۔ اس وقت اہل میرٹھ نے مولانا کے شایان شان استقبال کیا تھا اور مولانا کا نا سبجی جلوس بڑی شاہراہوں پر نکالا تھا۔ میرٹھ کے حلوائیوں نے اس مسرت میں اپنی دوکانوں سے مٹھائی کے تھال کے تھال لٹا دیئے تھے۔ جلوس کے بعد برف خانہ کے میدان میں پبلک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں حضرت مولانا نے پورے جوش و جلال کے ساتھ اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں تقریر فرمائی تھی اسی تقریر کے سلسلہ میں میرٹھ مجسٹریٹ کی جانب سے وارنٹ جاری ہوا اور آپ کو میرٹھ جیل میں لاکر بند کر دیا گیا۔

آپ مطالعہ کتب یا تحریری کام میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے تھے میرٹھ جیل کی ۱۱ نمبر بارگ اے۔ بی کلاس کے سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص تھی اس بارگ میں اس وقت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مرحوم قاضی نجم الدین صاحب مرحوم، چودہری چرن سنگھ اور آنجہانی پنڈت پیارے لال شرما وغیرہ موجود تھے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی صبح شام کچھ وقت اس بارگ میں گذرتا تھا۔ آپ جس وقت تک اس بارگ میں رہتے تھے پوری بارگ کے حضرات مولانا کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور سب کی نظریں اور پوری توجہ حضرت مولانا کے سراپا پر مرکوز رہتی تھیں اور حقیقی طور پر شمع اور پروانوں کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ اس بارگ کے سب سے بزرگ اور محترم لیڈر پنڈت پیارے لال شرما مولانا کے سامنے ہمیشہ دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے کبھی انھوں نے مولانا کی جانب پیٹھ نہیں کی مولانا کی موجودگی میں چار چار گھنٹہ تک کبھی سگرٹ نہیں پی۔ حالانکہ آپ سگرٹ کے بیحد عادی تھے اور پانچ منٹ بھی بغیر سگرٹ کے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ شرما جی حضرت مولانا کے واسطے ترکاری خود اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔

حضرت مولانا کی مجلس میں اکثر و بیشتر علمی و تاریخی واقعات پر تبصرے ہوتے تھے۔ حاضرین جس قسم کا بھی سوال کرتے تھے حضرت مولانا بلا تکلف ان کا تحقیقی جواب دیتے تھے۔ اگر انقلاب فرانس کا کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب اس طرح دیتے تھے کہ گویا آپ خود ہی انقلاب فرانس کے بانی ہیں، واقعات مع تاریخ اور انقلابیوں کے نام بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے پتنگ اور پتنگ بازی کی تاریخ یہ سمجھ کر پوچھی کہ شاید مولانا اس کے متعلق کوئی جواب نہ دے سکیں گے لیکن مولانا نے اس سوال کا بھی جس تحقیق کے ساتھ جواب دیا اس کو سنکر حاضرین دنگ اور مولانا کی ذہانت اور وسعت معلومات پر محو حیرت ہو کر رہ گئے۔ اس قسم کے سوالات نوجوان طبقہ خصوصیت سے کرتا تھا۔ خاصکر مسٹر کشن چند ایم اے جو فلاسفر کے نام سے بھی موسوم تھے اور آجکل ہندپارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ چنانچہ مسٹر کشن چند نے میرٹھ کالج کی لائبریری سے فلسفہ کی ایک مشہور انگریزی کتاب منگوائی جو میرٹھ کالج میں ولایت سے منگوائی گئی تھی۔ اور وہ تصنیف تھی جس کی ہندوستان میں اس وقت صرف چند ہی جلدیں آئی تھیں۔ مسٹر کشن چند نے اس کتاب کا مطالعہ کیا لیکن اس کتاب کو وہ باوجود اپنی عظیم قابلیت اور ہمہ دانی کے کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے اس کتاب کے متعلق اپنے چند نوجوان ساتھیوں سے ذکر کیا اور آخرکار یہ طے کیا کہ کل مولانا سے اس کتاب کے متعلق گفتگو رہے گی۔ چونکہ حضرت مولانا ہر علم اور اہم علمی کتابوں کے متعلق اپنے وسیع معلومات رکھتے تھے اور ہر موقع پر فرماتے تھے کہ ہاں میرے بھائی میں نے اس کتاب کو فلاں جگہ دیکھا ہے اور اس میں یہ یہ لکھا ہے چنانچہ یہ نوجوانوں کا گروہ مولانا کی خدمت میں گیا کہ دیکھیں مولانا آج اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا اس دقیق کتاب کا ایک حرف بھی نہ سمجھ سکیں گے اور پھر ہمیں تفریح لینے کا موقع ملے گا۔

چنانچہ کشن چند نے مولانا کو جاکر یہ کتاب دی اور کہا کہ مولانا جی اس کتاب کو بتایئے کہ یہ کیا ہے اور اس میں کیا لکھا ہے ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مولانا نے اس کتاب کو اول تا آخر دیکھا اندر رکھ لیا اور فرمایا کہ میرے بھائی اسے میرے پاس چھوڑ دو میں اسے کل کسی وقت دیکھ کر بتاؤں گا کہ اس میں کیا لکھا ہے چنانچہ اگلے دن جب مولانا صاحب گیارہ نمبر بارگ میں آکر بیٹھے۔ یہ لوگ مولانا کے پاس پہنچے اور کتاب کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہاری سمجھ میں کیا چیز نہیں آئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو اس کو کچھ بھی نہیں سمجھے۔ مولانا نے ان کو اس کتاب کا مضمون اول سمجھایا اور اس کے بعد اس پوری کتاب کی حقیقت بتادی اور اس پر اپنی رائے کا بھی اظہار فرمایا اور فرمایا کہ مصنف نے اس کتاب میں فلاں فلاں جگہ ٹھوکر کھائی ہے اور وہ فلاں جگہ خود نہیں سمجھا وہ یہ سمجھا ہے اور اصل یہ ہے۔

حضرت مولانا کی اس وضاحت کے بعد جب کشن چند نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو اب پوری کتاب سمجھ میں آگئی۔ اس وقت ان لوگوں کو حضرت مولانا کی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ ترین ذہنیت پر بے حد حیرت ہوئی۔

حضرت مولانا کی رہائش گاہ اسپتال کی باؤنڈری میں تھی اور جیل کے دستور کے خلاف حضرت مولانا کا بنگلہ رات دن میں کسی وقت بھی بند نہیں ہوتا تھا۔ مولانا اکثر رات کے آخری حصے میں ۴ بجے کے قریب اسپتال میں روزانہ ٹہلا کرتے تھے۔ اسوقت آپ اکثر عبا پہنا کرتے تھے۔ یہ ناچیز بھی گیارہ نمبر بارگ سے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا اس لئے مولانا کے اس انداز خرام کو روزانہ اسپتال کے اندر سے دیکھتا تھا مولانا اس وقت بھی قرآن کریم کی آیات تلاوت فرماتے رہتے تھے کبھی عربی یا فارسی اشعار پڑھتے ہوئے گشت کرتے رہتے تھے۔ صبح کے سہانے وقت میں مولانا کا ترنم و لہجہ نہایت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا بیخودی کے عالم میں ہیں۔ اور اسی عالم میں جو کچھ زبان پر آرہا ہے مست ہو کر پڑھ رہے ہیں۔ مولانا تقریباً چار ماہ میرٹھ جیل میں رہے اس کے بعد آپ کو گونڈا جیل میں بھیج دیا گیا۔ جب تک آپ میرٹھ جیل میں رہے آپ کا صبح خیزی و جہل قدمی کا یہ مشغلہ برابر جاری رہا۔

میرٹھ جیل کا جیلر اس وقت ایک شخص تھا جو نہایت ظالم اور سنگدل تھا وہ قیدیوں پر بے حد سختیاں کراتا تھا لیکن مولانا کے آنے کے بعد اس کی استبدادیت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی اس لئے کہ حضرت جیل کے کسی قیدی کے ساتھ جیل اتھارٹی کی کسی سختی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سیاسی نظربند پر سختی کرتے دیکھ کر نہایت

برافروختہ ہوئے اور جیل اتھارٹی کو بُری طرح ڈانٹا - مولانا کی ان باتوں سے جیلر بہت پریشان تھا - غالباً اسی کی کوشش سے مولانا کو میرٹھ سے گونڈا بھیجا گیا جیل سپرنٹنڈنٹ اس وقت ایک مسلمان مسٹر کرنل رحمان تھے - وہ مولانا کا بہت احترام کرتے تھے اور ایک دو مرتبہ اپنے خاص مہمانوں کو بھی جو باہر سے آئے تھے مولانا سے ملاقات کرانے جیل میں لائے - لیکن مولانا کسی سے ملنا زیادہ پسند نہ کرتے تھے - مولانا کی یہ بات جیل میں بھی بار ہا دیکھی کہ جب کوئی بڑا افسر ہندوستانی یا انگریز جیل میں آتا اور مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تو مولانا یا تو بات کم کرتے تھے اور یا اس کا جواب اردو میں دیتے تھے - میں نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں حضرت مولانا مرحوم کو صرف ایک مرتبہ فیض پور کانگریس سیشن کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی میں تجاویز پڑھ کر سناتے دیکھا - لیکن اُن پر بھی تقریر یا وضاحت اُردو ہی میں فرمائی -

غرض امام الہند جب تک میرٹھ جیل میں رہے عام قیدیوں کو آپ کے دم سے بے حد راحت رہی جہاں کسی قیدی کو افسران جیل نے کچھ کہا جھٹ آکر مولانا سے شکایت کر دیتا تھا - مولانا کی قیام گاہ کے قریب ہی تنہائی کی کوٹھریاں تھیں جن میں زیر عمر رضا کار بند رہتے تھے مولانا روزانہ صبح شام ان کی خبر گیری رکھتے تھے اور اکثر اپنے کھانے میں سے بچا کر ان کو ترکاری اور روٹی دیتے رہتے تھے اس سے مولانا کی رحمدلی اور چھوٹوں پر شفقت کا اندازہ بھی ہوتا -

جب تک مولانا جیل میں نظر بند رہے جیل حکام کے ظلم و جور پر اوس پڑی رہی جیل کی فضا میں مسرت و شادمانی چھائی رہی ساری جیل کی بارکوں میں صبح و شام انقلاب زندہ باد اور مولانا آزاد کی جے کے نعرے بلند ہوتے رہتے اور ہر سیاسی قیدی کا حوصلہ بیحد بلند رہا -

---

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے

مذہبی رجحانات کی ایک جھلک

از حکیم سید محمد الیاس کھوڑی

آہ دنیائے علم و سیاست کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مگر الہلال، البلاغ، تذکرہ، اور ترجمان القرآن۔ آج بھی زبانِ حال سے مولانا کے اوصافِ کاملہ کے مدح خواں ہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ کتنی آنے والی نسلیں اس زندۂ جاوید یادگار سے نفع اُٹھائیں گی،

ملک کے گوشہ گوشہ میں مولانا مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کی صدائیں آج بھی گونج رہی ہیں الہلال و البلاغ کی صدائیں نہ صرف کانوں تک پہونچیں بلکہ دل و دماغ کے پردوں پر دستک دے رہی تھیں کہ اے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنے والے اربابِ علم تصوف، اے رہنمایانِ کرام، اے متلاشیانِ آزادی، آزادی کی یہ پُر کٹھن وادی تمہیں اپنی طرف بُلا رہی ہے تاکہ غلامانِ زندگی کی بیڑیاں کاٹی جا سکیں، اس آواز کا یہ اثر تھا کہ ہزارہا مشتاقانِ آزادی میدانِ عمل میں آئے، اتحامِ اقوام کو ذریعہ بنا کر مقصدِ آزادی کے حاصل کرنے میں مصائب و تکالیف برداشت کیں، اس ایک آواز نے ملک میں ہمہ گیری اختیار کی ۔ مولانا مرحوم کا خداداد دماغ پوری رہنمائی کرتا رہا ملک کے رہنے والوں کی بے چینی بڑھتی گئی، آزادی کے متوالوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پورے ملک میں پھیل گیا۔ سامراجی طاقتوں کیلئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی باگ بھارت کے سپوتوں کو دیدے۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ ۱۴ اگست کی شب میں آزادی کا یہ چاند سرزمینِ ہند پر چمکا۔ اگر ایک طرف مولانا مرحوم دُنیاوی سیاست میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اُلجھے ہوئے مسائل کے سُلجھانے میں اپنی مثال آپ تھے تو دوسری طرف مذہبی ضیا پاش شعاعیں مولانا کے سطحِ دماغ کو منور کر رہی تھیں، خداداد ذہانت کا یہ عالم تھا کہ قرآنِ کریم کی جس آیت پر قلم اُٹھایا بیساختہ لکھنا شروع کر دیا۔ دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ معارف و حقائق کی یہ بارش القا کا یقین دلاتی ہے۔ اور بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے۔ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا مرحوم ارکانِ اسلام کی پابندی میں انضباطِ اوقات کا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ مولاناؒ نماز کی بھی کافی پابندی فرماتے تھے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ دہلی میں کانگریس سیشن ہوا تھا غالباً سبھاش چندر بوس صدرِ اجلاس تھے مولانا بھی شرکتِ اجلاس کی غرض سے تشریف لائے تھے میں بھی اجلاس میں شریک تھا، پنڈال کے قریب ایک ٹینٹ صرف نماز پڑھنے کے لئے نصب کیا گیا تھا۔ مولاناؒ نے مجھ سے فرمایا میں ایک کام آپ کے سپرد کرتا ہوں وہ یہ کہ جب جماعت تیار ہو مجھے مطلع کر دیں۔ عموماً اجلاس کے اوقات میں دو ہی نمازیں پڑھی جاتی تھیں عصر و مغرب چنانچہ میں مولانا کو مطلع کر دیا کرتا تھا خواہ کتنے ہی اہم مسائل کیوں نہ پیش ہوں مگر مولاناؒ فوراً نماز کے لئے تشریف لاتے تھے۔ مولانا کے آتے ہی نماز شروع ہو جاتی تھی اکثر احباب کی خواہش ہوئی کہ مولانا نماز پڑھائیں، مولانا نے ہر بار انکار فرمایا کہ میرے بھائی جب امام صاحب موجود ہیں خود ہی پڑھائیں گے۔ کیونکہ عارضی طور پر امام صاحب مقرر کر دیئے گئے تھے۔ احباب کی دلی خواہش یہی تھی کہ مولانا ایک نماز ضرور پڑھا دیں مگر کوئی طریقہ نظر نہ آتا تھا کہ جس سے مولانا کو مجبور کیا جاتا۔ اس موقع پر میں نے ایک جرأت کی وہ یہ کہ جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو میں نے امام صاحب سے عرض کیا کہ میں مولانا کو اطلاع کرنے جاتا ہوں آپ اُس وقت تک قنات کی پشت پر رہیے جب تک نماز شروع ہو جائے آج مولانا ہی سے امامت کرانی ہے کیونکہ اجلاس کا بھی وہ آخری دن تھا پھر اس قسم کا موقع ملنا بھی مشکل تھا چنانچہ امام صاحب نے میری بات مانی میں نے مولانا کو اطلاع دی۔ مولانا عین اس وقت تشریف لائے جبکہ اذان ہو رہی تھی، بات تقریباً سب ہی طے تھی مولانا حسبِ معمول صفِ اوّل میں بیٹھ گئے اذان ختم ہو گئی لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے مگر مصلّی پر امام صاحب نہیں تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ امام صاحب کہاں ہیں جواب دیا کہ یہاں نہیں ہیں، اس موقع پر میں نے عرض کیا حضرت آپ کی موجودگی میں کس کی جرأت ہو سکتی ہے کہ نماز پڑھائے تمام نمازیوں کی بھی خواہش ہے کہ آپ ہی امامت فرمائیں اس جرح و قدح میں تقریباً چار پانچ منٹ گزر گئے۔ آخر مولاناؒ مسکراتے ہوئے مصلّے پر تشریف لے گئے پہلی رکعت میں وَالْعَصْرِ اور دوسری میں اِذَا جَآءَ تلاوت فرمائی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی امامت میں جو لطف آیا وہ بآسانی نہ بھلایا جا سکے گا۔ اسی طرح میرٹھ کانگریس سیشن میں مولاناؒ کی نمازوں کی ادائیگی کا یہی اہتمام رہا اجلاس میں خواہ کتنے ہی اہم مسائل کیوں نہ پیش ہوں مگر حضرتؒ نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور شام کے اجلاس میں عموماً نمازِ عصر سے فارغ ہو کر تشریف لاتے تھے، میرے کچھ احباب نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو چائے پر مدعو کیا، انتظام پنڈال کے قریب رسٹوران میں کیا گیا تھا۔ وقتِ مقررہ پر تقریباً تمام ممبران تشریف لے آئے مگر مولانا کو تشریف لانے میں دیر ہو گئی، معلوم ہوا کہ مولاناؒ نماز ادا فرما رہے ہیں۔

حضرت امام الہند رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۵۱ء میں جب مرکزی دار العلوم دیوبند میں تشریف لے گئے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم، مولانا حکیم سید محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ کھٹوری رکن مجلسِ شوریٰ۔ حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی معیت میں دار العلوم کی سیاحت فرما رہے تھے جب راستہ میں قرأت کی ایک درسگاہ سے گزرے۔ مولاناؒ کے کان میں قرأت کی آواز پڑی آپ درسگاہ کی طرف لپکے اور درسگاہ کے دروازہ پر جا کر چھڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ کھڑے ہو گئے اور بہت خاموشی سے قرارت سُنتے رہے۔ آنکھیں تر تھیں، جب رکوع ختم ہو گیا تو قاری صاحب نے احتراماً اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا مولاناؒ نے فرمایا کہ اپنی جگہ پر تشریف رکھئے اور دوبارہ پڑھیے چنانچہ کافی دیر تک سُنتے رہے۔ اسی طرح جب باب الظاہر سے فارغ ہو کر نیچے اُترنے کے لئے زینہ پر پہونچے تو حضرت مہتمم صاحب نے بطور معذرت مولاناؒ سے فرمایا کہ آج آپ کو کافی تکان

ہو گئی ہے۔ مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں، مگر میں آپ سے اس کا بدلہ لے لوں گا اگر آپ میری تکان دور کر دیتے ہیں تو قرآن شریف کا ایک رکوع سنوا دیجئے چنانچہ باب الظاہر سے اُتر کر درگاہ کی سیر کراتے ہوئے مدرسۃ القراء حضرت مولانا حافظ قاری حفظ الرحمن صاحب کی درسگاہ میں لے جایا گیا۔ مولانا آزاد کمرے میں داخل ہو کر قاری صاحب کے سامنے بیٹھ گئے قراءت کی مشق سننے لگے اثناء درس میں مولانا نے فرمایا قاری صاحب ذرا تدریس بند کر کے ایک رکوع سنا دیجئے، قاری صاحب نے سورۂ ملک کا پہلا رکوع شروع کیا، مولانا آزاد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جب رکوع ختم ہوا مولانا نے فرمایا بارک اللہ انا ذکرہ فی القرآن نغمہ زیجزاک اللہ۔

مدرسہ کے مالی نے پھولوں کا جو ہار مولانا کو پیش فرمایا تھا مولانا نے قاری صاحب کو عطا فرمایا۔ مولانا آزاد کے مذہبی رجحانات کا بیّن ثبوت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے ہمیشہ روح رواں رہے، زندگی کے آخری لمحات تک جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور جمعیۃ علماء کی تحریک میں خصوصی رہنمائی فرماتے رہے۔ نیز جمعیۃ علماء ہند اور مسلمانانِ ہند کے اہم معاملات میں مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کو اپنے خصوصی مشوروں سے مستفید فرماتے رہے۔ اور مجاہدِ ملت ہمیشہ مولانا آزاد کے دستِ راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی لئے مولانا "مجاہدِ ملت" پر اعتمادِ کلی فرماتے تھے۔

اس جامع کمالات شخصیت کی جُدائی سے جو ملک و ملت کو نقصانِ عظیم پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے، میں اپنی ان بے ربط سطور کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لہ، اللھم ارحمہ۔ اللھم ارفع درجاتہ، آمین۔

ایک قلمی تصویر

(۱۹۴۲ء کی تحریر سے ماخوذ)

خواجہ حسن نظامی

سرو قد، دریانہ بدن، گورا رنگ۔ ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ۔ سفید چھوٹی داڑھی، آواز سریلی اور بلند۔ مزاج میں تمکنت اور وقار۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت، دلی کے رہنے والے ہیں۔ ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں۔ مگر پیری مُریدی کے زیادہ دل دادہ نہیں ہیں۔ قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی۔ حافظہ کی قوت بے مثال۔ تصور کی طاقت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ نازک مزاجی میں تاناشاہ۔ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے بیرونی ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ مسلمانوں میں مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور یورپین مؤرخ سوچتے ہیں کہ اُن کو یورپین کیوں کر ثابت کیا جائے۔

اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں تاہم ظاہرداری اور نمودکاری سے بیزار ہیں مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے۔ بلکہ سر اسٹیفورڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں، جواہرلال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیوں کہ جو دل میں ہوتا وہی زبان سے کہتے ہیں۔ حالانکہ نئے زمانہ کی سیاست میں یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندوستانی ہیں۔ جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں۔ اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں "غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لئے بہت ہی مفید ہے۔"

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے ایک رازدار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعے کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبرِ اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔ سوائے اُن کے جو ان کی بادشاہی کو اپنی ذات کے لئے نقصان رساں سمجھیں۔۔۔۔۔۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندوستان کے لئے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔ ان کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا، اگر دوسرے سیاسی چراغ بھی روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بظاہر سفید داڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل نوجوان ہیں۔

ہند پارلیمنٹ کی ایک یادگار سرگزشت

١ ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو ایوانِ عام میں وزارتِ تعلیم کے مطالبات زیرِ بحث شروع ہوئی۔ تو شری پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس نے حسبِ معمول اُردو کی مخالفت کی۔

ٹنڈن جی

مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن نے وزارتِ تعلیم پر یہ کہتے ہوئے حملہ کیا کہ اس نے "ہندی کی اشاعت کے لئے صحیح پالیسی اختیار نہیں کی۔"

ہماری قدیم تہذیب ہی صرف ہماری قومی زبان کی بنیاد ہو سکتی ہے ۔ ملک میں دو قومی زبانیں نہیں ہو سکتیں، خواہ یہاں کتنے ہی مختلف مذاہب ہوں۔"

انھوں نے شکایت کی کہ وزارت ایسے اداروں کو امدادی عطیے دیتی ہے جن کا مقصد ہندوستانی یا اُردو کا پرچار ہے، لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا جیسے اداروں کی ہمت افزائی نہیں کرتی یہ تجویز کہ اُردو... رسم الخط ہندی کے ساتھ رائج ہو بے معنی اور خطرناک ہے، اُردو تو ایک مصنوعی زبان ہے۔

جس وقت ٹنڈن جی نے کہا کہ ہندوستانی پرچارنی سبھا کو ایک ڈکشنری مرتب کرنے کے لئے ۶۰ ہزار روپیہ دیا گیا ہے حالانکہ اس سوسائٹی کا مقصد ہندوستانی کا پرچار کرنا ہے نہ کہ ہندی کا ۔ تو وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد نے ٹنڈن جی کو ٹوکا اور کہا کہ امداد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی سفارش پر دی گئی ہے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں، مولانا نے یہ بھی بتایا کہ ناگری پرچارنی سبھا کو بھی ایک معقول گرانٹ دی جا رہی ہے۔

ٹنڈن جی کو تسکین نہیں ہوئی

انھوں نے فرمایا کہ اُن کی رائے میں قومی زبان کے لئے ایک آزاد بورڈ بنایا جائے جس میں ناگری پرچارنی سبھا اور دکشنی بھارتیہ ہندی پرچارنی سبھا کے نمائندے شریک کئے جائیں، پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو ہندی کے لئے ایک الگ وزارت قائم کی جائے جس میں ایسے لوگ رکھے جائیں جو ہندی کے پرچار کے لئے پورے دل سے کام کریں تاکہ دس یا گیارہ سال کے بعد ہندی سماج کے ہر شعبہ کا ایک لازمی جزو بن جائے، اُن کی رائے ہے بغیر اس کے وزارتِ تعلیمات ہندی کے پرچار کا کوئی حقیقی کام نہیں کر سکتی۔

سیٹھ گووند داس

نے وزارتِ تعلیم پر یہ الزام لگایا کہ وہ "ہندوستانی" ہو گئی ہے، اس میں انگریزی کی بدبو آتی ہے اور (اس کی وجہ سے) اُردو بھی ترقی کر رہی ہے، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ہندی کا پرچار کرنے والے فرقہ پرست ہیں، سیٹھ صاحب نے کہا کہ فرقہ پرست تو وہ لوگ ہیں جو ہندوستانی کلچر کے دھارے کے خلاف انگریزی یا اُردو کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں، حقیقت میں ان ہی پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کرنا چاہئے۔

انھوں نے کہا کہ :-
اُردو ملک کی تقسیم کی بنیاد ہے، اور تنبیہ کی کہ اُردو کی علاقائی حیثیت کو تسلیم کرنا THIN END OF THE WEDGE ہوگا (یعنی ایسا کرنے سے اندیشہ ہے کہ اُردو والے انگلی پکڑ کے پھر پورا پنجہ نہ پکڑ لیں!)........

(ازراہِ کرم) سیٹھ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ وہ علاقائی زبانوں کی ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

وزیر تعلیم و رکن مجلسِ عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے ان بے بنیاد الزامات کا مدلل جواب بہت تفصیل سے دیا اور فرمایا!

" ہندی والوں کو اُن کا لسانی تعصب لے ڈوبے گا
افسوس! جو اُردو زبان اسی ملک کی پیداوار ہے آج اُس کے لئے ہمارا دماغ تنگ ہو گیا ہے۔
اُردو کسی مذہب یا گروپ کی زبان نہیں بلکہ سب کی زبان ہے، اگر اُردو کو مسلمانوں کی زبان فرض بھی کر لیا جائے تو کیا اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ باشندوں کے ادارہ کو امداد دینا اعتراض کی بات ہے؟
میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے ۔ میں بے غرض ہوں اور جس میں غرض نہ ہو اُسے تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی ۔ "

(ابوالکلام آزاد)

(انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار خصوصی کا بیان ہے کہ مولانا آزاد نے ایوان میں جس طنطنہ اور طمطراق اور خطیبانہ آن بان کے ساتھ اپنے محکمہ پر کئے ہوئے اعتراضات کے جوابات دیئے اس سے اس دور کی یاد تازہ ہو گئی جبکہ مولانا آزاد جد و جہد کے دور میں کانگریس کی نمائندگی فرمایا کرتے تھے" مولانا آزاد نے وزارت تعلیم سے متعلق مطالبات زیرِ بحث ایوانِ عام میں بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اُن کی وزارت نے ہندی کو سرکاری زبان بنانے میں کچھ کم کوششیں نہیں کی ہیں، اگر زبان کے معاملہ میں فرقہ پرستوں نے تنگ دلی اور لسانی تعصب کا ثبوت دیا تو ہندی پندرہ سال کے اندر اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکی۔

مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہہ دیا کہ اُردو دشمنی کا جذبہ ہندی والوں کو لے ڈوبے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اُردو اسی ملک کی زبان ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، یہ زبان بولتے ہیں اور اگر اس زبان کو مسلمانوں کی زبان بھی مان لیا جائے تب بھی یہ زبان ہندوستان کی آبادی کے اُس حصہ کی زبان ہوئی جس کی تعداد ۴½ کروڑ ہے۔ جب مولانا نے مسٹر ٹنڈن کی لایعنی باتوں کو پُر فریب تخیل سے تعبیر کیا تو ایوانِ عام میں اچھا خاصہ ہنگامہ ہو گیا بعض ممبروں نے اس ترکیب کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اکثر نے یہ کہا کہ یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں جنھیں غیر پارلیمنٹری کہا جائے تاہم مولانا آزاد نے فرمایا کہ مجھے اپنے الفاظ پر اصرار نہیں ہے ۔ مشاہدین کا بیان ہے کہ جب تک مولانا آزاد کی تقریر جاری رہی ٹنڈن جی اور سیٹھ گووند داس اپنی اپنی کرسیوں پر اُچھلتے رہے

[illegible]

[illegible]

نقیبا شریف حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ پر کچھ لکھنا کیا ۔ جیسے نہیں علم معاذاللہ نہیں، وہ آفتاب تھے جس کی کرنیں دنیا میں پھیلیں، اُن کا علم اُن کی فراست کسی ایک گوشہ تک محدود نہ تھی وہ صحیح معنی میں محیط العلم تھے ۔ مگر حضرت آزادؒ کے مرقد پر حاضر ہوا ہوں تو اُن ہی کے الفاظ میں اگر گلدستہ نہیں بنا سکا تو چند پتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں سمیٹ لیا ہے کہ خالی ہاتھ مرقدِ آزاد پر کیا جاؤں ۔ ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ہمہ گیر شخصیت

از
مولانا
مقبول
احمد
سیوہاروی

اگر ہمیں یقین ہو کہ ایک صدی کے گریہ پیہم سے ابوالکلام مل سکتے ہیں تو ہم ایک صدی تک روتے رہیں — لیکن کر ایسی ہمہ گیر شخصیت، صدیوں میں بھی پیدا نہیں ہوتی ۔

مولانا آزاد کیا تھے ——— ؟

مولانا آزاد کیا نہیں تھے ——— ؟ وہ ایک عظیم المرتبت محدث اعلیٰ مؤرخ، بے مثال فقیہ، عدیم النظیر ادیب، سیاست کے شہسوار رفتار وگفتار کا نمونہ، اخلاق و کردار کا مجسمہ اور وقت شناسی لاجواب تھے ۔

فروری ۱۹۱۰ء کے رسالہ نظام المشائخ میں مولانا کا ایک مضمون مسرمد شہید پر نکلا تھا ۔ یہ سب سے پہلا مضمون تھا جسے میں نے دیکھا اور مجھے ایک قلبی تعلق مولانا کی ذات سے ہوا ۔ یہ مضمون نہ تھا بلکہ خواجہ حسن نظامی رح کے الفاظ میں مقاماتِ سرمدیت پر ایک محققانہ اور البیلا خطبہ تھا ۔ خواجہ صاحب نے تعارفی نوٹ میں لکھا تھا ۔

"آزاد مسلمانوں کے اس دورِ آخر میں اگلے وقتوں کی ذہانت و ذکاوت کا مجسم ظہور ہیں ۔ اگر مسلمانوں کی قدرداں حکومتیں باقی ہوتیں تو ہم جیسے بے نوا لوگ آزاد تک کہاں پہونچ سکتے، کیوں کہ ان کے گرد نامداروں کا حلقہ ہوتا ۔"

۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقعہ پر میں نے انہیں دیکھا جبکہ وہ کوچہ چیلان میں نواب ... عالی جناب حکیم کراچی کے مکان پر خواجہ صاحب سے ملنے تشریف لائے ۔ دبلے پتلے منحنی زرد چہرہ نپولین کی شکل کی مشابہ ۔ مگر آنکھیں اتنی پُرکشش دلآویز کہ نگاہ سے نگاہ ملانا مشکل تھا ۔

تحریکِ خلافت میں متعدد مرتبہ قریب سے دیکھنے، شرکتِ مجالس اور گفتگو کا اتفاق ہوا ۔ کلکتہ جانا ہوا تو سیٹھ صدیقی کی ہمراہی میں حضرت کی خدمت میں حاضری اور سیرۃِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں مشورہ کی عزت حاصل کی ۔

نینی تال میں بحالیِ صحت کے لئے تشریف لائے تو خان بہادر شیخ عبدالقیوم احمد نینی تال کے چند سربرآوردہ لوگوں کی خواہش ہوئی کہ مولانا سے ملاقات کی صورت نکالی جائے ۔

مولانا نواب صاحب رام پور کی کوٹھی میں مقیم تھے میں نے حاضر ہو کر ان

حضرات کی تمنا ظاہر ... [illegible]

اس ملاقات میں مولانا نے اُن ... [illegible]

کو کالم ... کی شہرت پہونچے ۔

... [illegible]

... [illegible]

... [illegible]

مولانا کی ہمہ گیر شخصیت

... [illegible]

... [illegible] ... ۔

... [illegible]

حل بیان نے ثبوت فرمایا ... [illegible]

... ہزاروں کتابیں ... [illegible] ۔

حافظ محمد ابراہیم صاحب ... [illegible] ... کے ہاں مولانا کا قیام تھا ۔ شام کے وقت روزانہ گول چبوترہ پر نشست رہتی تھی ۔ حقہ کا دور چلتا تو کبھی کبھی مولانا بھی ایک دو کش لگا لیتے ۔

ایک دن طبیعت خوش تھی ۔

برادر محترم مولوی فخرالدین صاحب سے شرکیہ مجلس بیان فرماتے ہیں کہ مولانا نے حقہ کی تاریخ بیان کرنی شروع کی ۔ حقہ کب سے شروع ہوا؟ کس نے ابتدا کی؟ پہلی شکل کیا تھی؟ پھر کیا تبدیلی ہوئی، عہد بعہد کی تبدیلیاں کیونکر ہوئیں، ڈیرہ تھا ... [illegible] ... ہندوستان میں کیسے کھیا ... کس نے کیا مذمت کی ؟

سننے والے حیران تھے کہ ایک محدث، ایک فقیہ، ادیب، اور صحت ریاست دماں مدبّر مفکر، حقہ کی تاریخ کا بھی ماہر ہے !!

جامعہ ملیہ، قرول باغ میں قاضی محمد عمر جعفری پھلواری شہری آئے، اتفاقاً حضرت مولانا بھی تشریف لے آئے ۔ قاضی محمد عمر سے تعارف ہوا ۔ جعفری کی نسبت سکر خاندانِ جعفری پر تقریر شروع کر دی ۔ ضمنی طور پر جون پور کی تاریخ بھی بیان فرمادی ۔ قاضی محمد عمر کو اپنے کشہر المعا ... اور ذہین ہونے پر ناز تھا مگر دیکھنے

والوں نے دیکھا کہ قاضی محمد عمر مولانا کو ایسے تحیر سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی کو سکتہ ہو جاتا ہے اور وہ تکتا رہ جاتا ہے۔ مولانا تشریف لے گئے تو قاضی محمد عمر صاحب نے کہا۔ میں جعفری ہوں مگر آج مجھے جعفریوں کی صحیح تاریخ معلوم ہوئی ہے۔

کلکتہ میں عید الفطر کے موقعہ پر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ملاقات عید کے لئے مولانا کی کوٹھی پر گیا۔ اسی دن عید ملاپ کی تقریب بطور میلہ کے اسپلینڈ کے میدان میں منائی جا رہی تھی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت یہ عید ملاپ تو "بدعت" ہے۔ مولانا نے بدعات پر جو تقریر فرمائی وہ راقم الحروف کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے بدعات کا سرچشمہ کب سے پھوٹا۔ بدعات کا بانی کون تھا؟ بدعات کی شدت کس زمانہ میں ہوئی، اس سلسلہ میں مذکوق جزکسی کے حالات بھی بیان فرمائے۔ پھر کتابوں کے حوالے بقید صفحہ وسطر سننے والوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ پرشکوہ الفاظ اور نورانی ترکیبوں کا القاء ہو رہا ہے جیسے ایک پیکر علم اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔

راقم الحروف کی ملاقات امرتسر میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ہوئی۔ مولانا آزاد کا تذکرہ آگیا۔ فرمانے لگے ہم مولوی لوگ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مولانا آزاد نے پیغمبری کا دعویٰ نہیں کیا ورنہ ہم ان کے بے پناہ دلائل کا جواب مشکل سے دے سکتے۔ مولانا بخاری کے اس جملہ کا نظارہ راقم الحروف نے اہل حدیث کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ غازی جمال پاشا المصری حکومت حجاز کے مندوب تھے۔

صدارت مولانا آزاد کی تھی مگر مولانا مجلس عاملہ کانگریس میں مصروف تھے جس کا اجلاس دتی میں ہو رہا تھا۔

کلکتہ میں تار پر تار آ رہے تھے کبھی شام تک پہونچوں گا کبھی صبح کا وعدہ آخر اجلاس کا آخری دن بھی آ گیا مگر مولانا تشریف نہ لا سکے، اور مولانا ثناء اللہ عارضی صدارت فرماتے رہے۔ ختم اجلاس پر مولانا کا تار آیا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں اور ایک تقریر فرمائیں گے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اُس وقت کا ہجوم قابل دید تھا مگر مولانا نے عین اُس وقت کہ لوگ گوش بر آواز تھے فرمایا کہ میں اس وقت مستعد نہیں ہوں اور تقریر بعد مغرب ہوگی۔ اس وقت ایک مشہور عالم نے کہا مولانا مستعد نہیں ہیں یہ تو ہم ہی جیسے لوگ ہیں کہ ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔

شام کو تقریر شروع ہوئی۔

میں نے مولانا کی سیاسی تقریریں سُنی تھیں یہ مذہبی تقریر تھی اور تبلیغ پر تھی جس میں مولانا نے قرآن پاک کا پس منظر، اور اہمیت واضح فرمائی تھی اور جس جس عہد میں جن زمینوں اور جن مقاصد کے تحت مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کئے گئے اُن کی تاریخ تھی۔ سلسلہ تقریر میں مولانا نے عوام سے پلٹ کر علماء کی طرف خطاب فرمایا اُس وقت تقریر کا رُخ تبلیغ کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی وضاحت پر تھا۔

مجھے مولانا کے وہ چبھتے ہوئے فقرے اب تک یاد ہیں کہ یہ کتابوں کے پلندے اور کتب خانوں کی الماریاں (علماء) جو ہمارے سامنے ہیں یہ بھی نہیں جانتیں کہ تبلیغ خارجی کسے کہتے ہیں اور تبلیغ داخلی کس کا نام ہے۔

کچھ دیر بعد تقریر کا رُخ پلٹ گیا اور مولانا کا خطاب پھر عوام کی طرف ہو گیا مگر بڑے سے بڑے عالم کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ مولانا کے اس چیلنج کا جواب دیدیتا۔

مولانا بخاری نے جو کچھ کہا صحیح کہا تھا کہ بڑے بڑے عالم مولانا کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے مولانا کی مذہبی تقریر یا تو میں نے کلکتہ میں سنی یا پولیٹیکل کانفرنس آگرہ میں دوران خلافت میں سُنی تھی۔ جبکہ پوری تحریک اور استقامت کو سورۂ والعصر کی تفسیر میں بیان فرمایا تھا۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصابر کی تشریح مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ تک کرتے رہے تھے۔

مولانا کی اس تقریر میں انگریزی اور عربی علوم کے ماہر شریک تھے جنھوں نے متفق اللفظ اعتراف کیا تھا کہ آج مولانا جیسا مفسر قرآن ہندوستان میں کیا دوسرے ممالک میں بھی نہیں ہے۔

مولانا کا آخری جملہ لکھے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا جس میں فرمایا تھا کہ اگر پورا قرآن نازل نہ ہوتا اور فقط سورۂ والعصر نازل ہو جاتی تو دنیا کی ہدایت کے لئے کافی تھی۔

ذوقِ شعر اور حافظہ

مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ فیضی تو جب کبھی تھا، تھا۔ لیکن اس دور میں مولانا آزاد جیسا حافظہ کسی کا نگاہ سے نہیں گزرا، انھوں نے جس کتاب کو بھی توجہ اور غور سے پڑھ لیا ہے اس کی عبارتیں بقید صفحہ وسطر حافظہ میں محفوظ ہیں۔

یونٹی کانفرنس الٰہ آباد

ساغر صاحب نے راقم الحروف سے ذکر کیا۔ یونٹی کانفرنس الٰہ آباد میں حضرت مولانا صبح کے وقت جمنا کے کنارہ پر تشریف لے جاتے اور طلوع آفتاب کا منظر دیکھ کر مسرور ہوتے، ایک دن میں ہمراہ تھا فرمایا طلوع آفتاب کا منظر بھی کتنا دل افروز ہے۔ اور عجیب ترنم سے طلوع آفتاب پر فارسی کے اشعار پڑھنے لگے۔ ہر شعر پر فرماتے۔ یہ فلاں شاعر کا شعر ہے جس نے اپنی یادگار میں اتنا کلام چھوڑا۔ فلاں سنہ میں پیدا ہوا فلاں سنہ میں مرا۔

کبھی عربی اشعار ترنم فرماتے اور طلوع آفتاب کی شرح بیان فرماتے۔

اُردو اشعار کے بارہ میں فرمایا کہ اُردو کے تو آپ خود شاعر ہیں۔

ساغر صاحب کا بیان ہے کہ میں شاعر ہوں اور دواوین کا مطالعہ میرے لئے ضروری ہے۔ لیکن جو اشعار مولانا نے سُنائے وہ میری نظر سے نہ گذرے تھے اور سب متقدمین کے تھے۔

ساغر صاحب نے ایک دوسرا واقعہ بیان کیا۔

کلکتہ میں مولانا کے مہمان تھے، آغا حشر مرحوم کشمیری سے ملنے گئے تو کچھ دیر ہو گئی اور کھانے پر مولانا انتظار فرماتے رہے، واپس آئے تو مولانا نے دیر کا سبب دریافت کیا عرض کیا معاف فرمائیے۔ آغا حشر متکلم فلم کے بارہ میں کچھ فرما رہے تھے، دیر ہو گئی۔ مولانا نے تعجب سے پوچھا کیا متکلم فلم کے متعلق آغا حشر بھی کچھ جانتے ہیں۔

اور پھر ایک مختصر تقریر متکلم فلم پر فرمائی۔

ساغر صاحب کا بیان ہے کہ میں نے آغا صاحب کے خیالات بھی سُنے تھے مگر مولانا نے جو نکتے بیان فرمائے آغا حشر کو ان کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔

مولانا آزاد بڑے عالی دماغ نکتہ رس اور مجسمہ ذکاوت تھے۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے مولانا کے بارہ میں رائے دریافت کی تو مولانا کشمیری نے متقدمین کی طرح ماقلّ ودلّ یہ جواب دیا کہ ابوالکلام ازکی الناس ذکی ترین آدمی ہیں۔

گیا اجلاس جمعیۃ علماء میں شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ میں کس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کروں ہندوستان میں ایک ابوالکلام تھے وہ آج کل جیل میں ہیں۔ شاہ صاحب جیسے جلیل القدر اور جامع کمالات کے یہ جملے ہمیں بتاتے ہیں کہ مولانا کس درجہ کے سیاست داں اور کس درجہ کے مدبّر تھے۔

کانگریس کی مجلس عاملہ اور مولانا آزاد کی ذکاوت کا اب سے کچھ برسوں پہلے بھولا بھائی

ہندوستان ... اور کسی کی فراست ... تو مولانا آزاد اسے چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں۔

خصوصیت کلام و تحریر

مولانا کی خصوصیت کلام و تحریر یہ تھی کہ وہ جتنے شاندار طریق تحریر کے مالک تھے اتنے ہی تقریر پر بلند مرتبہ رکھتے تھے، تقریر فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتب کتاب ہے جسے نہایت روانی سے پڑھا جا رہا ہے جس میں نہ ایک جملہ زیادہ ہے نہ کم۔

مولانا کی تحریر میں ایسی شوخی، اتنی جاذبیت اور ایسا ربط ہوتا تھا کہ کیسا ہی علمی اور تحقیقی مضمون کیوں نہ ہو (جس میں عموماً پھیکا پن ہوتا ہے) پڑھنے والا مسلسل پڑھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ کسی علم و فن پر گفتگو کیجئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نے ہمیشہ اسی فن کا مطالعہ فرمایا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا۔

جس زمانہ میں ہم میرٹھ جیل میں تھے مولانا بھی رفیق جیل تھے اور ترجمان قرآن کی تدوین فرما رہے تھے۔ مولانا ہم سے علیٰحدہ تھے اور تنہا تھے۔

ہمارے ساتھ کچھ وکلا تھے، ان میں بعض وکیل انگریزی کی اعلیٰ ڈگریاں رکھتے تھے اور آئین CON ASTITUTION پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے مولانا بھی تشریف لاتے اور کبھی کبھی کوئی کتاب مطالعہ کے لئے لے جاتے، وکلا میں ایک وکیل بڑے شوخ تھے کہنے لگے انگریزی کی اتنی ادق کتابیں لے جا کر مولانا اپنا رعب جماتے ہیں، ان کتابوں کو تو بعض وقت ہم بھی دشواری سے پڑھتے ہیں۔ مولانا تشریف لائے اور نئی کتاب لینے لگے تو ان میں شوخ مزاج وکیل نے کہا۔ مولانا!! فلاں کتاب جس کا آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں مضامین کے لحاظ سے کیسی ہے؟

مولانا کی فراست بھلا اس طنز کو کیوں کر برداشت کر سکتی تھی اس کتاب کی بعض غلطیاں بقید صفحہ و سطر بیان فرمانے لگے چہرہ پہ ناگواری کا اثر تھا پھر فرمایا یہ کیا کتابیں ہیں، آئین تو ہم خود بناتے ہیں، اور جس کتاب کو مطالعہ کے لئے لے جانا چاہتے تھے رکھ کر واپس تشریف لے گئے۔ وکیل صاحب اور دوسرے تمام سند یافتہ حیران تھے۔ پھر سب لوگ مولانا کی خدمت میں گئے اور ہزاروں منت و سماجت کے بعد کتاب دے آئے۔

مسٹر راج گوپال آچاریہ نے اپنے پیغام میں جہاں یہ کہا ہے کہ مولانا آزاد وسیع النظر وسیع الدماغ سیاسی رہنما تھے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ "انگریزی کی سخت سے سخت اور دشوار سے دشوار کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔"

خیالات اُمنڈ رہے ہیں، خصائص بے شمار ہیں مگر اخبار کا دامن تنگ ہے اور دوسرے بھی حصہ دار ہیں، اس لئے قلم روک لیا ہے اور کسی دوسرے وقت کا انتظار ہے۔

دامان نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

"تاہم چلتے چلتے اتنی بات کہہ دینے کو اور جی چاہتا ہے کہ مولانا کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر حرم مکہ میں شامل درس ہے یعنی جس ذات پاک کے کلام کی تفسیر مولانا نے فرمائی ہے اسی کے گھر میں اسے پسند کر لیا گیا ہے اور اس سے مولانا کی عظمت اور قبولیتِ کامل کا پتہ چلتا ہے۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

لے سفرنامہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔


عمر بڑھتی ہے
لیکن بال ہیں کہ
سفید نہیں ہوتے
Loma
Loma
لوما
باوں کو قدرتی طور پر کالے سیاہ کرنے میں
عالمگیر مقبولیت حاصل کرنے والا
کسی بھی حالت میں سر کے بال کتنے ہی سفید ہو گئے ہوں
لوما انہیں یقین کے ساتھ سیاہ کئے بغیر نہیں رہے گا
لوما
بالوں کو بڑھانے والی قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا
ہے اور اس کی خوشبو نہایت مست اور روح پرور ہے۔
سول ایجنٹ :- ایم ایم کھمبات والا - احمد آباد ۱
ایجنٹ سی نروتم اینڈ کمپنی - منگلداس روڈ بمبئی نمبر ۲
ٹیلیفون نمبر 30575
لوما ایجنسی کے لئے ایم ایم کھمبات والا احمد آباد کو لکھئے

سفری عادتیں

- صفائی کا درجہ خدائی کے دوسرے نمبر پر ہے۔ آؤ! ہم صفائی کی عادت پیدا کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم خوراک کے ٹکڑے۔ پھلوں کے چھلکے اور پانی وغیرہ پلیٹ فارموں یا ڈبّوں میں نہ پھینکیں۔ انھیں کوڑا کرکٹ دان میں پھینکیں۔
- پلیٹ فارموں پر جابجا تھوکنا بیماری پھیلاتا ہے۔ پھر یہ بُری عادت بھی شامل ہے۔ اس کے لئے تھوکدان استعمال کرنا چاہیئے۔
- فلٹر شدہ ٹھنڈے پینے کے پانی کو دوسرے کاموں میں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔
- سیٹ پر پاؤں رکھ کر بیٹھنے کی عادت ترک کر دینی چاہیئے۔ ڈبّے میں بیٹھے دوسرے لوگوں کے لئے یہ ناراضگی کا موجب ہے اور یہ عادت اچھّی بھی نہیں ہے۔
- اپنے بھاری سامان کو بریک وین میں بک کرانے سے ہمارے ساتھی مسافروں کو اور ہمیں خود بھی ڈبّوں میں کشادہ جگہ مل سکے گی۔
- ریلوے گاڑی کے ڈبّوں میں کسی ساتھی مسافر کے منع کرنے پر سگریٹ بیڑی پینا جرم ہے۔ کسی کے منع کرنے پر یا ڈبّے میں بھاری رش ہوتے پر یا کھڑکیاں دروازے بند ہوتے پر ہمیں سگریٹ بیڑی نہیں پینا چاہیئے۔
- ریلوے آپکا قومی سرمایہ ہے۔ اس کا تحفظ ہم ریلوے پراپرٹی کو نقصان پہونچانے یا توڑ پھوڑ کرنے والے لوگوں کو گرفتار کروانے میں امداد دیکر کرسکتے ہیں ایسے لوگوں کو پکڑ کر فوراً وردی میں ڈیوٹی پر ریلوے اسٹاف کے حوالہ کر دینا چاہیئے۔ یا ایسے واقعہ کی فوراً اطلاع کر دینی چاہیئے۔ غیر سماجی عناصر جو غیر ضروری طور پر خطرہ کی زنجیر کھینچیں اُن کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہیئے۔

سنٹرل ریلوے کی طرف سے جاری کیا گیا

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد

تاجدارِ فکر و قلم

کی یاد میں

اُردو صحافت کے تاثرات عقیدت

امام الہند کی تعزیت خود اپنے قلم سے

" اپنی حالت دیکھتا ہوں تو روز بروز صحت جواب دے رہی ہے ۔ ضعف و اضمحلال بڑھتا جاتا ہے ۔ نہیں معلوم مشیتِ الٰہی کیا ہے اور کونسا وقت آنے والا ہے ۔!

اگر پیامِ اجل سر پر آپہونچا (وان اجل اللہ لآت) تو آہ ! کس سے کہیئے اور کون جانتا ہے کہ اس مشتِ خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپردِ خاک ہونگی فیضانِ الٰہی نے اپنے فضل مخصوص سے علوم و معارف کے کیسے کیسے دروازے اس عاجز پر کھولے ہیں جو بند کے بند رہ جائیں گے ۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نہ شناخت دریغ

(بشکریہ حاجی محمد اسحاق صاحب ۔ صدر مسلم پبلک لائبریری مرادآباد)

ماہنامہ بُرہان دہلی

عام پیرایہ بیان میں لوگ کہتے ہیں کہ مولانا علوم قدیمہ وجدیدہ کے متبحر عالم تھے۔ سحر طراز انشا پرداز' بلند پایہ ادیب جادو فشاں خطیب تھے۔ فہم و تدبر۔ ذہانت و فطانت اُن کے اوصاف و کمالات طبعی کا تکمۂ زریں تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب عنوانات مولانا کی اصل شخصیت کی ترجمانی اور عکاسی سے قاصر ہیں وہ بذات خود ایک تاریخ تھے اور تاریخ ساز بھی۔ وہ مستقل ایک عہد تھے اور عہد آفرین بھی۔ انھوں نے اپنے دماغ اور زبان و قلم سے ایک عہد پیدا کیا جس کی ہمہ گیری اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ اُس سے مذہب بھی متاثر ہوا اور ادب بھی۔ سیاست بھی اُس سے اثر پذیر ہوئی اور تہذیب و ثقافت بھی۔ اُن کا قلم ابر بہاراں بھی تھا اور برق شرر فشاں بھی۔ علم و حکمت اور شعر و ادب کے میدان کی طرف نکل گیا تو فروغ نظر اور ایمان و یقین کے لالہ و گل کو پیغام نشوو نما دیتا گیا اور چٹیل میدانوں کو گل و گلزار بناتا گیا۔ اور اگر اُس نے مذہب اور سیاست کی طرف رُخ کیا تو فکر و نظر اور احساس و شعور کی دنیا میں طوفان برپا کر گیا' جو گوشہ نشین تھے وہ اس آواز کو سُن کر گھروں سے نکل پڑے جن پر غلامی کی غفلت و مدہوشی کا تسلط تھا وہ جوش و ولولۂ عمل سے سرشار ہو کر زندگی کا ایک نیا خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کرنے لگا وہ ہر بزم اور ہر محفل میں پہونچا اور ہر جگہ صدر انجمن اور میر محفل ہو کر رہا' مذہب' سیاست اور ادب' تہذیب اور معاشرت ان میں سے کوئی ایسی منزل نہیں ہے جس کی طرف اُس نے رُخ نہ کیا ہو اور اس میں اپنے اجتہاد و تحقیق' سنجیدہ فکر اور نظر بلند کے لازوال نقوش نہ چھوڑ گیا ہو۔

ایک شخص آج کل کے رسمی طریقہ تعلیم سے ناآشنا ہونے کے باوجود محض اپنی خداداد غیر معمولی ذہانت اور ذاتی مطالعہ و تحقیق سے کس قدر اونچا ہو سکتا ہے مولانا اُس کی بُرہان مبین اور دلیل روشن تھے اور اس طرح کی عبقریت (GENIUSNESS) کی مثالیں دنیا میں کم ملیں گی۔ چنانچہ جس طفل نوخیز نے سولہ برس کی عمر میں اُردو کی اخبار نویسی سے اپنی زندگی شروع کی تھی وہ نوجوانی میں ہی اس قدر بلند اور سرفراز ہو گیا کہ جس محفل میں سن رسیدہ ملک کے اکابر و عمائد بیٹھے تھے وہاں بھی وہ کرسی صدارت پر متمکن نظر آتا تھا۔ اکابر علماء نے اس کو "امام الہند" کہا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس نے تحریک آزادی کے سب سے زیادہ نازک دور میں انہی کی قیادت میں جد و جہد کی آخری منزلیں طے کیں اور پھر آزاد ملک میں سب سے پہلا مرکزی وزیر تعلیم بھی وہی بنا۔ یہ ایک محکمہ تو محض رسمی طور پر تھا ورنہ اس کا ناخن تدبر و فہم ملک کی پوری سیاسی گتھیوں کے ہی سلجھانے میں مصروف رہا' چنانچہ آج یہ شخصیت ہم میں موجود نہیں ہے تو ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اس کا ماتم بپا ہے' علما رو رہے ہیں کہ اُن کا سرتاج اُٹھ گیا' علوم و فنون کے ماہر اشک فشاں ہیں کہ ایک عظیم الشان اسکالر جاتا رہا۔ وزیر اعظم نہرو ماتم کناں ہیں کہ اب مشورہ اور رائے کس سے لیں گے۔ غور کرنا چاہیئے کہ کسی ایک شخصیت کے جامع اور ہمہ گیر ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ ہر شخص بلا تفریق مذہب و ملت اپنے خاص نقطۂ نظر اور مذاق طبع کے تحت' اس کو مجموعہ کمالات و اوصاف سمجھے اور اس کی وفات پر اشک فشاں و گریہ کناں ہو۔

اگرچہ ملک کی آزادی کے بعد سے مولانا گوشہ نشین ہو گئے تھے اور عوام سے رابطہ باقی نہیں رکھا تھا لیکن اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ مولانا اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ ملک کے خاص حالات میں اُن کا پبلک میں آنا اور تقریریں کرنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس سے تھوڑے بہت نقصان ہی کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ملک کی خدمت کا صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ خاموشی کے ساتھ ملک کی تعمیری خدمات انجام دی جائیں اور اس سلسلہ میں پنڈت نہرو کو زیادہ سے زیادہ قوت بہم پہونچائی جائے اور اپنے صحیح مشوروں سے اُن کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس سیاست پر وہ آخر وقت تک عمل پیرا رہے جو کچھ اُن کو کہنا ہوتا تھا وہ پنڈت نہرو سے کہلاتے تھے اور جو کچھ انہیں کرنا ہوتا تھا پنڈت جی سے کراتے تھے' مولانا کے کیرکٹر کی یہ بھی اہم خصوصیت تھی کہ اُن کو اپنی زبان اور دل و دماغ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ خود اُن کے بقول انھوں نے سالہا سال کی مشق کے بعد اپنے اندر یہ کمال پیدا کر لیا تھا کہ کسی کی مدح و ذم کا اُن پر مطلق کوئی اثر نہ ہوتا تھا اور ہمیشہ اپنی صوابدید کے مطابق کام کرتے تھے۔ جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بھرپور تقریر کرتے تھے اور جب بولنے کو مضر جانتے تھے تو بالکل چپ سادھ لیتے تھے۔ مولانا کے مخالفین نے بُرا بھلا کہنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ مولانا کی پیشانی پر غیظ و غضب کی ایک شکن بھی نہیں پڑی اور کبھی خلوت میں بھی کسی بڑے سے بڑے مخالف کا ذکر بدی کے ساتھ نہیں کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی موجودگی میں کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ شرافت نفس کا یہ عالم تھا کہ زبان کبھی گندہ اور فحش لفظ سے آشنا نہیں ہوئی۔ غیور اور خود دار اس پایہ کے تھے کہ والد مرحوم کی استخواں فروشی ہرگز گوارا نہیں کیا حالانکہ اس ذریعہ سے بلا کسی محنت و مشقت کے لاکھوں کما سکتے اور ایک وسیع و متمول طبقہ کے مرشد روحانی بن سکتے تھے۔ مولانا پر سخت قسم کی عُسرت و تنگدستی کے دور بھی آئے لیکن کیا مجال کہ زبان کسی کے سامنے اظہار احتیاج کے ننگ سے آلودہ ہوئی ہو یہ وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اس زمانہ میں علماء اور مشائخ اور عباد و صلحا تک میں عموماً ناپید ہیں پھر اور لوگوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مولانا اکابر زعمائے ملت کی پُرانی نسل کی آخری یادگار تھے اس لئے مولانا کی وفات ایک شخص اور ایک بڑے آدمی کی موت نہیں بلکہ پورے ایک عہد' ایک دور' ایک قرن کی موت ہے مسلمانان ہند کی تاریخ عہد حاضر کا ایک باب ختم ہو گیا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا کل شئی ھالك الا وجھہٗ۔ اس دُنیا کی ریت یہی ہے جو آیا ہے اس کو جانا ضرور ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مدینہ بجنور یوپی

آج ہندوستان کا چپہ چپہ نہیں بلکہ ساری اسلامی دُنیا اور سب امن پسند عالم مولانا کی جُدائی کو محسوس کر رہے ہیں اور بالاتفاق کہہ رہے ہیں کہ آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال نے وہ خلا پیدا کر دیا ہے جو پُر نہیں کیا جا سکے گا اور یہ صحیح بھی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کے قلم میں سحر' جس کے لبوں میں اعجاز اور جس کی فکر کی بلندیوں کی کوئی انتہا نہ ہو' جس کو علوم قدیمہ وجدیدہ پر عبور کامل ہو' اور جو میدان عمل میں کسی ہلکی سی لغزش سے بھی آشنا نہ ہوا ہو' اُس کی جگہ کا پُر کرنا آسان بات نہیں ہے۔ ایسے مردان حق بلاشبہ صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے سانحہ پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے لیکن دُنیا کی ہر شے فانی ہے ہر ذی روح کو موت آنی ہے اور سب کو اُسی طرف لوٹ کر جانا ہے جو یہاں بھیجتا ہے۔ زندگی اور موت اُسی کے قبضہ میں ہے جس نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا ہے صحیح کرتا ہے اس لئے بالآخر صبر ہی سے کام لینا ہے اس کے سوا چارہ نہیں۔

اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں صبر کی طاقت عطا فرمائے۔

صدق جدید لکھنؤ

آج وہ اٹھ گیا۔

۱۔ جو اردو ادب و انشا میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا اور جس کا اس میدان میں کوئی سہیم و شریک نہ تھا اور جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

۲۔ جو اردو زبان کا ایک بہترین مقرر و خطیب تھا۔

۳۔ جو مدتوں دین و قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت و ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

۴۔ جو ملکی سیاسیات کی صفِ اول میں ۴۴ - ۴۵ سال سے رہا کرتا تھا۔

۵۔ جس نے اردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

۶۔ جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی، کہنا چاہیے کہ اب آخری یادگار رہ گیا تھا۔

۷۔ جو اب ایک پیکر شرافت بن گیا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے خدا معلوم کتنے بے سہاروں کا سہارا بنا ہوا۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

مبارک سہارنپور

ابوالکلام ۔ جو مُردوں کی بستی میں پوری آدھی صدی تک زندگی کے پیغام کو ضائع کرتا رہا۔ تاریکیوں کے بے کراں ہجوم میں اپنی شمع جلاتا رہا، غلام ذہنیتوں کو ٹھوکے دے دیکر، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر، کچوکے دے دیکر اکساتا رہا، ہندوستان کی سیاست اور ادب پر، ثقافت اور تہذیب پر، علم اور مدنیت پر ایسے نقوش بناتا رہا جو دستبرد زمانہ کے سامنے کبھی بے بس نہیں ہونگے، کبھی نہیں مٹیں گے کبھی مدھم نہیں ہونگے ۔ ارباب وطن نے اس کے ذہن و فکر کی روشنی سے فیض اٹھایا۔ ہندوستان نے اپنے اس سپوت کی گراں بہا خدمات سے افتخار و عزت حاصل کی، پورے ملک کے رگ و پے اور بیدار دلوں نے اس کی رہنمائی میں کامرانی اور فلاح کی منزلوں کو چھو لیا، لیکن جس قوم کا وہ فرد تھا جس ملت کی وہ آبرو تھا جس قافلہ کا وہ سالار تھا، اس نے اغماض اور اعراض کا، گمراہی اور ہٹ دھرمی کا، بے وفائی اور بے یقینی کا افسوسناک برتاؤ اس کے ساتھ روا رکھا اور طنز و تشنیع کا پورا ترکش صفا و صدق سے بھرپور اس کے سینے پر خالی کر دیا ۔ وہ جہالت اور رسم پرستی کے معابد میں صداقت و مذہب کی شمع فروزاں جلانا چاہتا تھا لیکن پوری ملت نے نہ صرف تاریکیاں اور گمراہیاں اپنے لئے پسند کر لیں بلکہ خود اس پر گمراہی اور ظلمت پسندی کا الزام لگانے کی عبرتناک جرأت کا ثبوت بھی دیا۔

ابوالکلام ۔ جو جمال الدین افغانی کے بعد ایشیا کی روح کا آخری ترجمان تھا جو ولی اللّٰہی تحریک اور ابن تیمیہ کی بصیرتوں کا آخری وارث تھا ۔ ابوالکلام ۔ جو شمس الائمہ سرخسی اور مجدد الف ثانی کی پُرجلال و پُرعزیمت ارواح کا جیتا جاگتا پیکر تھا ۔ ابوالکلام ۔ جو صورِ قیامت تھا ۔ جو صدیوں کے بتوں کو توڑ دینے والا بت شکن تھا جو بصیرتوں کا حامل اور ذہانتوں کا مجسمہ تھا ۔ نہیں جو خود بصیرت اور خود ذہانت تھا ۔ ایک دور مر گیا۔ ہندوستان کے سر سے وقار کا تاج الٹ گیا، انسانیت کے سر سے موت نے چادر کھینچ پھینکی ۔ ہندوستان فریاد بلب ہے اسے سکون کی ضرورت ہے مسلمان یتیم ہیں، انھیں وارث کی ضرورت ہے، ذہانت اپنے سرچشمہ کو ڈھونڈھتی ہے اور سیاست اپنے مرکز کو۔

”سب یتیم ہیں، سب تہیدست ہیں، سب محروم ہیں!“ اس کے بعد!

قومی آواز لکھنؤ

جس دور میں مولانا اٹھے ہیں علما رمیں دو گروہ تھے ۔ ایک سرسید کے ساتھ تھا ۔ یہ جدید علوم و فنون کے ساتھ ساتھ برکات دولتِ برطانیہ کا مرید تھا ۔ دوسرا گروہ ان علمار کا تھا جو قوم پروری کے جوش میں برطانی حکومت کے ساتھ ہر مغربی چیز کو، یہاں تک کہ مغربی علوم و فنون کو بھی لعنتی قرار دیتا تھا ۔ پہلا گروہ قدامت پرستوں کی اندھی تقلید کی دھجیاں اڑاتا، دوسرا گروہ ان کی مغرب زدگیوں کی ہنسی اڑاتا، نوجوان آزاد نے ایک تیسری راہ نکالی جو دونوں سے آگے جاتی تھی اس میں مغرب دشمن علمار کی قدامت پرستی پوری شان سے جلوہ فگن تھی لیکن ساتھ ساتھ زمانہ کی ضروریات کا مکمل لحاظ رکھا گیا تھا ۔ اس میں علمار دیوبند کی قوم پروری پوری آب و تاب سے موجود تھی، لیکن سرسید کی مغربی علوم پسندی کو بہت احترام کے ساتھ قبول کیا گیا تھا ۔ مولانا جدیدوں میں سب سے زیادہ جدید تھے تو قدیموں میں سب سے زیادہ قدیم ۔

”علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں کبھی کوئی تقسیم نہیں ۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے میں نے اپنی راہیں خود نکال لیں ۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں“

اپنے اس انداز فکر کی وجہ سے عجیب و غریب جگہ حاصل کر لی مولانا نے ۔ سرسید گروہ کے لوگ کہتے تھے کہ اگر یہی قدامت ہے تو کیوں نہ قبول کی جائے اور دیوبند والے محسوس کرتے تھے کہ اگر یہی مغرب زدگی ہے تو اس کا احترام کرنا چاہیئے ۔ نہ انھوں نے تضحیک کا نشانہ بنایا نہ انھوں نے فتوؤں کا ۔ دونوں نے آنکھوں پر بٹھایا ۔ اس طرح نوجوان آزاد سرسید گروہ میں آزادی کی طلب اور دیوبند میں عہد جدید کے تقاضے لے کر پہونچا اور یہ سب کچھ عالمانہ فکر، فلسفیانہ تجزیہ اور موسیقی سے بھرپور تحریر کے ذریعہ

ذرا دیکھئے مولانا کے قلم کی شان ۔ اُس نے جدید خیالوں کی بھی دھجیاں اڑا دیں

”ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اُس کا نام رکھا ہے سرسید کی پالیسی ۔ یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بُت ہوتا تھا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتاؤں کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ دنیا کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اُس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں“

یہ مولانا ہی کی ذات تھی جس نے سرسید گروہ میں قوم پرور اور قدیم علمار کے گروہ میں زمانے کے تقاضوں کو پہچاننے والے پیدا کئے ۔ آگے چل کر ان ہی دونوں کے سنگم پر خلافت کی تحریک کی بنیاد پڑی جو آندھی اور طوفان کی طرح ہندوستان کے ایک گوشے سے اُٹھ کر ساری فضا پر چھا گئی ۔ اس میں علی گڑھ کے مسٹر اور دیوبند اور فرنگی محل کے علمار بھی شامل ہوگئے ۔ اس طرح مولانا آزاد عہد آفریں شخصیت بن گئے ۔

الکلام پٹنہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ علوم و معارف کا ایک بحر بیکراں تھے ۔ ان کی سیرت اور شخصیت میں آسمانوں کی وسعت اور بلندی اور سمندروں کی بے پایاں گہرائی تھی ان کی بے داغ زندگی کا ہر گوشہ ان کے پاکیزہ کردار کا ہر پہلو، ان کے روشن فکر و عمل کا ہر باب ہمارے سامنے ایک اچھوتا معیار پیش کرتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت کے کمالات کا ایک معجزہ تھے ۔ فکر و ذہن اُن کی شخصیت کی عظمت و وسعت اور بلندی

"محسوس تو کرتا ہے لیکن ظاہر کرتے ہوئے تنہا نے الفاظ ذہنی کی تنگ دامانی قلم کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ بڑی بڑی نکتہ رس، دوررس اور معانی طراز نگاہوں کا یہ عالم ہے کہ جب وہ مولانا کے کمالات و صفات کا جائزہ لینے کے بعد پلٹتی ہیں تو اُن کے دامن میں حیرت و استعجاب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے صاحب قلم اور صاحب علم و فضل نے بھی جب قلم اُٹھایا تو الفاظ ساتھ نہیں دے سکے اور شخصیتوں کے اسماء کا سہارا لینا پڑا۔ فرماتے ہیں۔ "ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ گویا میں خود ابن تیمیہ یا ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی یا ابو رامیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں" بلاشبہ مولانا آزاد ائمہ سلف کی تمام اعلیٰ صفات و کمالات کا مجموعہ تھے۔

اس مجموعہ میں ابن رشد اور ابن سینا کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور امام غزالی اور ابن تیمیہ کے منور خد و خال بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی تعریف کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہمیں یہ بھی کہنے دیجئے کہ وہ دجلہ و فرات اور گنگا و جمنا کی مشترکہ تہذیبی و تاریخی و ثقافتی روایات کا ایک دلکش سنگم تھے۔ ان کی ذات ہندوستان کی قدیم پاکیزگی اور تقدس اور اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سالہ عظمت و شوکت کا مجموعہ تھی۔ وہ قرآن کے آفاقی اور ابدی پیغام کے داعی اور ترجمان تو تھے ہی لیکن اُن کی شخصیت مہاتما بدھ کے تقدس اشوک اعظم کی شوکت و عظمت اور جہانگیر کے تدبر و بصیرت کے جلوؤں سے معمور نظر آتی ہے۔ بقول شری نہرو "حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کی درخشاں شخصیت موجودہ زمانے اور گذرے ہوئے زمانہ کی تمام اچھائیوں کا مرقع تھی۔

یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت سیرت کردار اور افکار و خیالات کا واحد پس منظر مذہب اور خدا پرستی ہے لیکن وہ روایتی اور تقلیدی مذہب کے قائل نہ تھے ان کا دامن اس راہ میں مذہبوں کی اندھی تقلید سے کبھی آلودہ نہ ہوا ان کی سوچ اور فکر کا تمام تر سرمایہ خالص اجتہاد پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب نے اُن کے نظریات کو تعصب اور تنگ نظری کے بجائے آفاقیت اور عالمگیریت عطا کی۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ کٹر مسلمان تھے دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کے سب سے بڑے علمبردار اس نظریہ کو انھوں نے سیاسی ضرورت کے بجائے ذاتی عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ قومی اتحاد کے عقیدہ کے ساتھ جو بھی سلوک کیا اس سے قطع نظر ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے پر اس عقیدہ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اُن کی ملی ذہنی اور راسخ العقیدگی پر یہاں زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ نظریاتی اختلافات کے خوفناک اور تند و تیز طوفانوں میں بھی وہ اس عقیدے پر غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے اگر وہ اپنی طبیعت کا رُخ موڑ لیتے اور متحدہ قومیت کے عقیدے سے دستبردار ہو جاتے تو آج تاریخ کے اوراق سے اکثر افراد ناپید ہوتے لیکن انھوں نے ایسا کرنا تو درکنار اس کا تصور بھی گناہ سمجھا۔ درحقیقت مولانا پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرو مندانہ اور باوقار زندگی کے لئے متحدہ قومیت کا نظریہ ہی واحد ضمانت ہے۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ دو قوموں کا نظریہ غیر ملکی نو آبادکاروں نے صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ منزل آزادی کو دراز سے درازتر کر دیا جائے اور برصغیر ہندوستان زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اُن کے لئے اسباب عیش و راحت فراہم کرنے کا وسیلہ بنا رہے اُن پر یہ راز بھی منکشف تھا کہ دو قوموں کا نظریہ ظلمتوں کا سینچا ہوا زہر کا وہ پودا ہے جو اگر اس سرزمین میں برگ و بار لایا تو اس سے آہوں، آنسوؤں اور شراروں کے پھل پھول لگیں گے۔ اس کی شاخوں پر خیر و فلاح کی کوئی کلی کھل ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ انھوں نے ہلاکت و تباہی کے مقابلے میں خیر و فلاح کو منتخب کر لیا تھا جیسے موت کے مقابلے میں زندگی کو چن لیا جائے۔ تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں لیکن جب وقت کا طوفان تھم گیا۔ گرجتی برستی گھٹائیں چھٹ گئیں۔ جذبات کے چڑھے ہوئے دریا اُتر گئے اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کا آفتاب آزادی کا پیام لئے ہوئے افق ہند پر نمودار ہوا تو دنیا نے دیکھ لیا کہ خیر و فلاح اور حق و صداقت کدھر ہے اور نامرادی و ناکامرانی کس کے حصہ میں آئی۔

ہماری بدنصیبی کہ متحدہ قومیت کا وہ سالار قافلہ اور بزم علم و دانش کا ایک مسند نشین ہم سے ہمیشہ کے لئے دور ہو چکا ہے۔ وقت کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ نئی نئی شخصیتیں پردۂ عدم سے بساط ہستی پر جلوہ گر ہوتی رہیں گی لیکن اب دنیا دوسرا ابوالکلام شاید ہی پیدا کر سکے۔ صدیوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر زمانے کو ایسی شخصیتیں نصیب ہوتی ہیں۔ ہماری آنکھیں ہمیشہ اس کی یاد میں خونفشاں رہیں گی لیکن وہ آفتاب جو ڈوب گیا اب کبھی طلوع نہ ہوگا۔ وہ کائنات جو اُجڑ گئی اب کبھی نمودار نہ ہوگی لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مولانا آزاد ایک داعی اور رہنما تھے۔ خوابیدہ روحوں کو جگانے والے ایک پیغام تھے۔ مردہ قلوب میں زندگی کی روح پھونکنے والی صدائے جاں نواز تھے۔ اُن کا اسوہ اور ان کی دعوت ہماری رہنمائی کے لئے آج بھی موجود ہے۔ اُن کی صدائے دلنواز آج بھی ہمارے قلوب کو گرما رہی ہے۔ اُن کا پیغام بیداری آج بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ یہ دعوت ابدی اور لافانی ہے۔ مولانا آزاد جو چراغ روشن کر گئے ہیں حوادثات زمانہ اُسے کبھی نگل نہ سکیں گے اس چراغ کی روشنی ہمارے دلوں کو ہمیشہ تابانی بخشتی رہے گی اب اس روشنی کو پھیلانا اور بڑھانا اور ایک ایک گھر کو اس سے منور کرنا ان تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے جو مولانا آزاد کی زندگی میں انہیں اپنا رہنما قائد اور پیشوا مانتے تھے اور آج بھی جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اُن کے نقش قدم پر چلنے کو اپنی دینی و دنیاوی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اور سعادت تصور کرتے ہیں۔

روزنامہ انقلاب بمبئی

اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ قدرت نے ابوالکلام آزاد میں بہت سی ایسی صلاحیتیں بھر دی تھیں جو اپنے خاص بندوں کو عطا کرتی ہے۔ ان کی محرومی یہ تھی کہ انھوں نے ایک غلام ملک کو اپنا وطن بنایا۔ وہ ایک غلام ملک میں آکر بسے اور غلامی کے عہد میں آکر بسے۔ اس عہد میں ہندوستان اگر ایک آزاد ملک ہوتا، اس کے باشندوں میں اگر اتنی ذہنی گراوٹ اور اخلاقی پستی نہ ہوتی تو ابوالکلام کا مقام کچھ اور ہی ہوتا لیکن قدرت شاید یہ چاہتی تھی کہ ابوالکلام ہندوستان کو سیاسی اور ذہنی غلامی سے نجات دلانے میں حصہ لیں، ابوالکلام نے بھی اپنے اس فرض سے عہدہ برا ہونے میں کوئی کوتاہی نہ کی انھوں نے اپنا جہاد زندگی کی آخری سانس تک جاری رکھا سخت سے سخت جسمانی اور ذہنی مصائب بھی انھیں اُن کے راستے سے ہٹا نہ سکے، انھوں نے ایک بار اپنے ایک عقیدت مند کو لکھا تھا

"دریا میں اُترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیئے۔
لیکن جب اُتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے
اور کبھی بھی سُنا نہ جائے گا، ممکن ہے پہلے ہی
غوطہ میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے
لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے اسے نہنگوں
کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے"

زندگی کے سمندر میں ابوالکلام آزاد کی کشتی حیات بہت سے نہنگوں کا مقابلہ کرتی آخرکار کنارے جا لگی۔

روزنامہ اخوت کلکتہ

مولانا کی صاف گوئی، سچی باتیں، بے لاگ تنقید و تبصرہ مخلصانہ رائے، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو کبھی بھی فراموش نہ

کی جا سکیں گی۔ مولانا آزاد نے مدبر کانگریس کی حیثیت سے ملک اور قوم کی رہنمائی کی۔ عالم دین کی حیثیت سے مسلمانوں تک خدا اور اس کے رسول کا پیغام پہنچایا، اسلامی تعلیم کی اسپرٹ پیدا کی، اتحاد اور اتفاق کا سبق دیا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں محبت اور خلوص کا پیغام پہنچایا، ظالم کے آگے کبھی گردن نہ جھکائی۔ صبر و قناعت اور توکل سے کام لیا اور زندگی بھر قوم کے لئے ایک نمونہ نادر بنے رہے۔

ہندوستان میں گاندھی جی کے بعد مولانا کی شخصیت ہی واحد شخصیت تھی جن کی بالغ نظری اور سیاسی بصیرت سے ملک اور قوم کو فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ افسوس آج اس گوہر بے بہا، در نایاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے اس چشمۂ فیض و برکت، آفتاب علم و حکمت کے غروب ہو جانے سے ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مولانا کے اخلاق و عادات و خصائل کس کس چیز کا ذکر کیا جائے، جب ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل تڑپنے لگتا ہے۔

روزانہ ہند کلکتہ

مولانا آزاد کا ہم سے جدا کر لیا جانا بھی ایک ایسی دردناک حقیقت ہے کہ چاہے دل اُسے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو روح اس تصور سے لرزاں ہو اور دماغ اس کو بھیانک خیال کرے مگر حقیقت مجبوراً ماننا ہی پڑے گی کہ مولانا آزاد کا جسم خاکی ہم سے جدا ہو چکا ہے۔ ان کی روح عالم بالا کو پہونچ چکی ہے، ہم ان کے سایہ عاطفت اور فیض قیادت سے محروم ہو چکے ہیں۔ مولانا آزاد کی ہستی ایسی ہستی ہرگز نہ تھی کہ اس کے انتقال پر چند کلمات رنج و غم کہہ کر اس کے احسانات کا بدلہ اتار دیا جائے۔ ان کی ذات ایسی ذات بھی نہ تھی جس کی جدائی کا سرسری تذکرہ کر کے ذکر کا حق ادا کر دیا جائے وہ عالم تھے مجتہد تھے، مجاہد تھے، مفکر تھے، صاحب رائے تھے، صاحب کردار تھے، پختہ اور راسخ کردار کے انسان تھے، محب وطن تھے، قوم پرور تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے لئے وجہ نازش تھے۔ وہ ان کے سچے ہمدرد، دوست اور بہی خواہ تھے۔ ایسے بہی خواہ جو ان کی بھلائی کے لئے ان تھک کام کر کے ان سے کوئی صلہ بھی نہیں چاہتے تھے اور وہ مسلمان کج فہمی کی وجہ سے طعنوں، مذمت حتیٰ کہ گالیوں کی صورت میں ملتا تھا تو کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ وہ ایک روشنی کا مینار تھے جس کی بنیاد مضبوط چٹان پر تھی۔ سب اس سے رہنمائی حاصل کرتے تھے مگر اس پر دن

رات موجوں کی یورش رہتی تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ حکومت ہند اپنے دماغ سے محروم ہو گئی، کانگریس اپنی گتھیوں کو سلجھانے والے سے۔ ملک اپنے ایک با اعتماد لیڈر سے، قوم اپنے ایک سچے دوست سے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنا سب کچھ ہی کھو دیا ہے۔ اس ملک میں مولانا کے بغیر ان کی حالت ایسی ہی ہے جیسے ایک ایسے قافلہ کی جو گھٹا ٹوپ تاریکی میں ایک ہولناک جنگل سے گذر رہا ہو جس میں ہر طرف رہزنوں کی ٹولیاں ہوں اور وحشی جانوروں کے غول، اور اس حالت میں اس قافلہ کا سالار اس سے چھین لیا جائے۔

روزانہ ساتھی پٹنہ

مولانا آزاد نے ہمیں کیا کچھ دیا اور انھیں کھو کے ہم کس کس چیز سے محروم ہو گئے، اسے لکھنے کے لئے ایک تاریخ اور ایک عمر درکار ہوگی ہمارے لئے مولانا کی جدائی کے احساسات اور تاثرات کو ہی رقم کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ہم مولانا کی کس کس چیز کے لئے ماتم کریں اور روئیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجموعی طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے ایک آدرش، ایک آیڈیل اور ایک معیار تھے، اُن کی زندگی ایمانداری، حب الوطنی ایثار قربانی کی زندگی تھی۔ انھوں نے مذہب، سیاست اور ثقافت کے میدانوں میں اپنے لئے جو معیار مقرر کئے، جو راستے بنائے، جو طور طریقے اختیار کئے سب اُن کی اپنی تخلیق تھے۔ مولانا نے کہیں بھی زندگی کے ادنیٰ سے گوشے میں بھی تقلید نہیں کی۔ خطابت اور انشا پردازی کو لے لیجئے۔ ہماری دو نسلیں اس کے سایہ میں پروان چڑھی ہیں اور اُردو زبان کو انھوں نے ایسی شیرینی اور چاشنی دی جو ان سے پہلے کبھی اُردو کو نصیب نہیں ہوئی تھی ان کی عبارت میں ترشے ہوئے جملوں کی ایسی عمدہ نشست ہوتی ہے جیسے کوئی ماہر فن کار ہیرے کے ٹکڑے تراش کر انھیں ایسی ترتیب سے سجا دے کہ اس سے بہتر ترتیب ممکن ہی نہ ہو۔ سیاست کے میدان میں ہمیشہ ہی وہ صف اوّل میں رہے بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے۔ اس لئے کہ حصول آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی جب کوئی اہم مسئلہ آتا اور رہنماؤں کی پوری ٹولی اس مسئلہ سے بار مان لیتی تو مولانا کی مدد لی جاتی اور مولانا کے ناخن تدبیر اس پیچیدہ مسئلہ کو یوں چٹکیوں میں حل کر دیتے کہ جیسے اُن کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ معاملہ فہمی، نکتہ رسی مولانا کو خاص طور سے ودیعت کی گئی تھی اور اکثر مولانا کی معاملہ فہمی کا ایسا اعجاز دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ انگشت بدنداں ہو گئے ہیں

چٹان لاہور

ڈیٹی شب - ۲۲ رفروری - دو بجکر دس منٹ پر مرحوم دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد اللہ کو پیارے ہو گئے

انا للہ و انا الیہ راجعون

ان کی موت ایک عظیم انسان کی موت ہی نہیں، ایک فقید المثال ادارہ کی موت ہے۔ ایشیا کا سب سے بڑا مسلمان ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ ایک قافلہ جو نصف صدی سے بے راہ مسافروں کو گمشدہ منزلوں کا پتہ دیتا ہوا تاریخ کی شاہراہ پر چل رہا تھا ایکا ایکی موت کی وادی میں داخل ہو گیا۔ ہندستان میں ابن تیمیہؒ — مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے بعد فکر و نظر کا چشمۂ صافی جس کی سوتوں سے تشنہ دہانوں نے آب حیات کا مزہ پایا اور ویران زمینوں میں سبزہ پھوٹا۔

بے شبہ آج ابن تیمیہؒ، ابن قیم، شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبد العزیز اندلسی کی لا ثانی صفات کا مرقع اٹھ گیا۔ وہ اتنی دور چلا گیا کہ جو لوگ ان بستیوں میں چلے جاتے ہیں پھر لوٹتے نہیں — اور جو پیچھے رونے کے لئے رہ جاتے ہیں انھیں خود موت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہم آج اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی یاد میں دل کے پرچم جھکاتے ہیں۔

یہ ہندوستان ہی کا ماتم ایشیا کا ماتم ہے۔ مسلمانوں کا ماتم ہے۔ اسلام کا ماتم ہے۔ علم کا ماتم ہے۔ عمل کا ماتم ہے وقت کروٹیں لیتا رہے گا۔ انسان کتم عدم سے بساط ہستی پر جلوہ نما ہوتے رہیں گے، کائنات چلتی رہے گی، سورج معمول کے مطابق نکلے گا اور ڈوب جائے گا آسمان ہر شام شفق کی گلگوں قبا پہنے گا۔ تاروں کی محفل سجتی رہے گی۔ چاند اپنے طلوع و غروب کے ضابطے پورے کرے گا۔ غرض مظاہر فطرت ازل سے ابد کی طرف اسی طرح قدم اٹھائے بڑھتے رہیں گے — مگر...... آج

"جو سورج ڈوبا ہے، جو کائنات آج اُجڑی ہے، جو ستارہ آج ٹوٹا ہے اور جو چاند آج چھپا ہے وہ سورج پھر طلوع نہیں ہوگا، وہ کائنات ہمیشہ ویران رہے گی، اس ستارہ کا دوبارہ اُبھرنا ممکن نہیں اور وہ چاند آئندہ کبھی فلک کے دریچوں سے نہیں جھانکے گا -!

امروز کراچی

مولانا آزاد کا اُٹھ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے یہ ایک سانحۂ عظیم ہے اس لئے نہیں کہ دنیائے علم و کمال اُجڑ گئی

اس لئے نہیں کہ ملت اسلامیہ کا ایک عظیم فرزند اس سے چھن گیا اس لئے نہیں کہ ایک جید ادیب و صحافی رخصت ہوگیا بلکہ اس لئے کہ ایک ایسا دانائے راز ہم سے جدا ہوا ہے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی ایک فرد کی موت نہیں ہے بلکہ پورے ایک عہد کی موت ہے۔ ایسا عہد جو ہماری تاریخ کا روشن ترین عہد تھا اس عہد میں ہم کو اپنی منزل نظر آئی تھی، ہم نے اپنا مقام پہچانا تھا اور ہم نے اپنی راہیں استوار کرنے کا عزم کیا تھا۔ مگر یہ بغیر واسطہ کے نہیں ہوسکتا اور یہ واسطہ تھا مولانا آزاد کی ذات گرامی، جو اس پورے دور پر حاوی نظر آتی ہے اور یہ دور آزاد کا دور تھا۔ مولانا مرحوم صرف ایک جید عالم، جادو بیان مقرر، سحر انگیز نثار اور جنگ آزادی کے بے باک سپہ سالار ہی نہیں تھے۔ وہ ایک فلسفی اور مفکر بھی تھے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ اس کو سنجیدگی اور متانت سے روشناس کرایا۔ ملت اسلامیہ کو ایک نیا انداز فکر عطا کیا اور ظلمت و جہالت کے وہ غلاف چاک کرکے رکھ دیئے جس میں لپٹی ہوئی تھی۔ ان توہمات و تعصبات سے اس کے ذہن کو پاک کیا جن میں وہ مبتلا تھی۔ ایثار و قربانی تدبر و تحمل اور عقیدے کی مضبوطی کا جو معیار انھوں نے قائم کیا وہ رہتی دنیا تک مشعل ہدایت رہے گا۔

روزنامہ جنگ کراچی

مولانا آزاد برصغیر کے ان نخبۂ رجال میں شامل تھے جن کی ادب، صحافت، خطابت اور مذہب میں ایک ممتاز اور بے مثال حیثیت تھی اور جو ایک نئے انداز فکر، ایک نئی ادبی تحریک کے بانی تھے، مولانا سید احمد ابوالکلام آزاد برصغیر کے سیاست دانوں میں وہ واحد سیاسی شخصیت تھے جن کی ذات بے شمار سیاسی اختلاف نظر کی آماجگاہ آج [illegible] غیر [illegible] وں کے عظیم سیاسی و نظریاتی دباؤ کو [illegible] مولانا آزاد نے جو تاریخی کردار انجام دیا اس کی مثال [illegible] سیاسی افراد میں مل سکتی ہے سیاست کے علاوہ ادب، صحافت، تفسیر قرآن اور بحث و نظر مذہبی فکر پیدا کرنے میں مولانا مرحوم نے جو کارنامے انجام دیئے جو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھے جائیں گے، [illegible] ادب کی تاریخ میں مولانا آزاد کا نام ایک نئے [illegible] کے بانی کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہے گا۔

روزنامہ تسنیم لاہور

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی دینی اور سیاسی زندگی کے لئے گذشتہ پچاس برس سے سب سے زیادہ معروف اور معزز ہستی رہے ہیں، خصوصاً مسلمانوں کی بیداری میں انھوں نے جو حصہ لیا ہے اس میں کوئی مسلمان رہنما بھی اُن کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ انھوں نے اُس وقت یہاں دعوت حق کا نعرہ بلند کیا جبکہ مسلمان رہنماؤں کا ایک طبقہ انگریزوں کی اطاعت کو قرآن و سنت سے ثابت کرتا تھا اور غلامی پر قناعت کرنے کو فلاح دارین کا ذریعہ گردانتا تھا اور دوسرا طبقہ اس حقیقت ہی سے ناواقف تھا کہ اسلام نوع انسانی کے سامنے کیا پیغام پیش کرتا ہے اس کے نزدیک دین حق زیادہ سے زیادہ چند رسوم و عبادات کا نام تھا۔ خدمت دین کا سب سے بڑا اسلوب مدارس میں درس نظامی کی تعلیم دینا یا غیر مسلموں سے اسلام کی صداقت پر مناظرے کرلینا تھا۔

لیکن مولانا ابوالکلام نے اس وقت جبکہ ابھی ان کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے قول کے مطابق مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علماء کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اس کارِ اہم کے سرانجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو زبان اور قلم کی بے مثال صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، ان کی خطابت میں عربی خطابت کا جوش تھا۔ دریاؤں کی روانی، آبشاروں کا ترنم، رعد کی گرج اور طوفانوں کا خروش۔ اور ان کے قلم میں جادو اور اُن کے انداز نگارش میں سحر تھا جب مولانا نے "الہلال" کلکتہ سے جاری کیا ہے تو وہ معنوی اور صوری حسن و جمال کا ایک نادر پیکر تھا۔ اس نے مسلمانوں کے قلوب میں جوش و ولولہ کی ایک آگ لگا دی تھی، آج کی نسلیں جو اس بات کی عادی ہیں کہ علی الصبح ہاکر ان کے مکان پر اخبار پھینک جائے اور وہ سرسری نگاہ سے اس کا مطالعہ کرکے اُسے ردّی میں ڈال دیں، اندازہ نہیں کرسکتی ہیں کہ جس روز الہلال کے طلوع ہونے کا دن ہوتا تھا لوگ ڈاکئے کی آمد کا انتظار اسی طرح کرتے تھے جس طرح ہلال عید کا کیا جاتا ہے۔ اور پھر زبانیں بناکر اس کے مضامین اوّل سے آخر تک سنتے تھے اور اپنی رگ و پے میں ایک نیا جوش ایمانی اور جذبۂ عمل کا خون تازہ دوڑتے ہوئے محسوس کرتے تھے۔

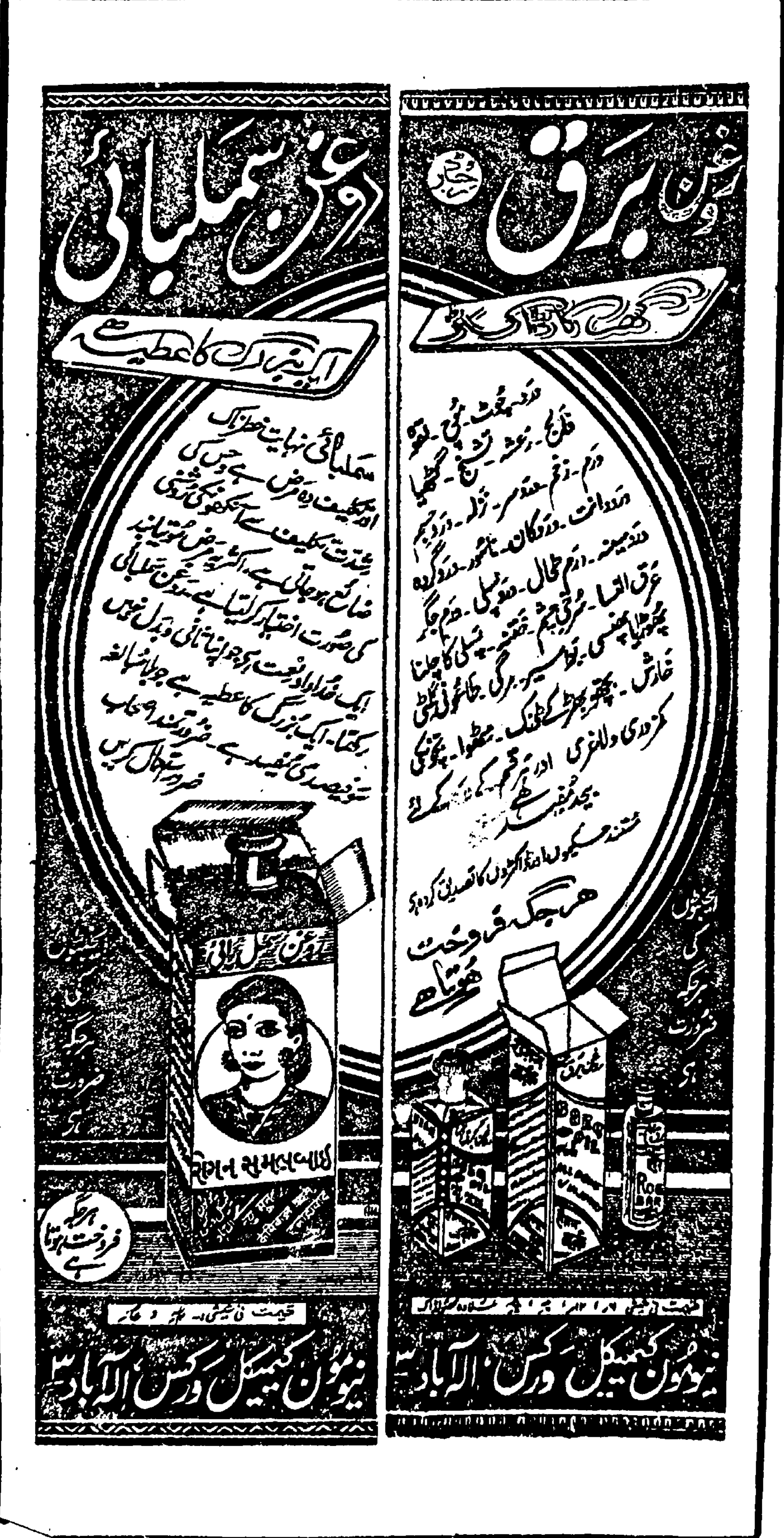
مولانا ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ہندوستان میں اسلامی قیادت کے مسند نشین تھے اور مسلمانوں نے اُن کو بجا طور پر امام الہند کا خطاب دیا تھا، دینی فکر و بصیرت سیاسی سوجھ بوجھ اور عزیمت دعوت کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے قافلے کے فی الواقع رہنما تھے اور انہی کا مسلک، مسلک احرار و ابرار تھا۔ مولانا ابوالکلام نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے دو پروگرام بنائے تھے، ان کی دعوت کے دو حصے تھے اوّل وہ مسلمانوں کو یہ پیغام دیتے تھے کہ اُن کی دنیوی و اُخروی فلاح و سعادت کا ضامن صرف اسلام ہے انھیں زندگی کا ہر مسئلہ اسلام ہی کی روشنی میں طے کرنا چاہیئے۔ اسلام اُن کی پوری زندگی کا دین ہے اس معاملہ میں ان کو کسی دوسرے نظریۂ حیات کی طرف دیکھنا چاہیئے اور نہ کسی دوسرے نظام یا مجموعۂ افکار سے رجوع کرنا چاہیئے اس غرض کے لئے مولانا نے حزب اللہ کی داغ بیل ڈالی اور ملک کے اہل علم جوانوں اور اور نوجوانوں کو دعوت دی اور اُن سے بیعت لی۔ الہلال اس دعوت کی زبان تھا۔

دوسرا حصہ مسلمانان ہند کی سیاسی رستگاری سے تعلق رکھتا تھا مولانا نے مسلمانوں کو بتایا کہ مسلمان غلام رہ کر زندہ رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔ غلامی اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں اور انگریزوں سے نجات حاصل کرنا ان کا محض قومی فرض ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ بھی ہے۔ آزادی کا صور مولانا نے اس وقت پھونکا جب پورا ہندوستان غلامی پر قناعت کی چادر تان کر آرام سے محو خواب تھا اور کانگریس بھی انگریزی حکومت سے صرف یہ چاہتی تھی کہ غلامی کے پاؤں کی بیڑیاں کچھ ہلکی ہوجائیں حصول آزادی کے لئے مولانا کے نزدیک مسلمانوں کو کانگریس میں غیر مشروط طور پر شامل ہوجانا چاہیئے اس معاملے میں اُن کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ انگریزوں سے آزادی کا مطالبہ "ہندوستان" کرسکتا ہے "مسلمان، ہندو، سکھ اور دوسری قومیں نہیں کرسکتیں"

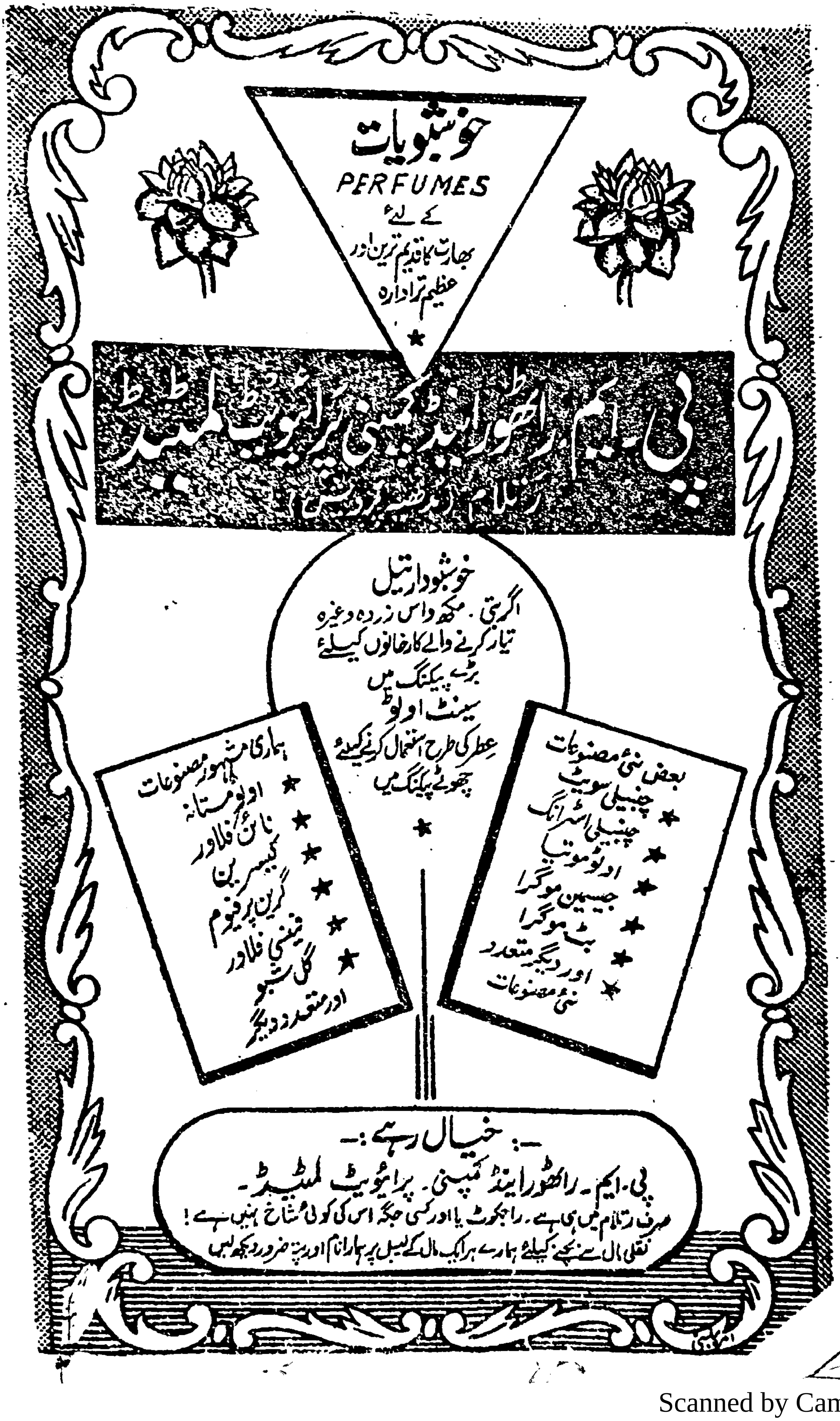
روزنامہ پرتاپ دہلی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

مولانا آزاد کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ابھی چند دن ہوئے مولانا حسین احمد مدنی ہم سے جدا ہوگئے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا کا جنم مکہ میں ہوا تھا۔ اُن کے والد بزرگوار ایک بہت بڑے مذہبی پیشوا تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں وہ عرب چلے گئے اور مدینہ میں اقامت گزیں ہوئے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" چھوٹی عمر میں ہی یہ نظر آگیا تھا کہ مولانا بڑے ہوکر کچھ بن کے رہیں گے پہلے انھوں نے مدینہ میں عربی کی تعلیم پائی اور چھوٹی عمر ہی میں مصر کی الازہر یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ چھوٹی عمر میں ہی انھوں نے عرب ممالک کی سیاحت کی اور ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ہندوستان آگئے۔ امرتسر کے اخبار "وکیل" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان دنوں وہ شعر بھی کہتے تھے



ان کی نظم پڑھ کر مولانا شبلی کو ان سے ملاقات کا شوق چرایا اور جب انھوں نے مولانا کو دیکھا تو یہ ماننے کو تیار نہ ہوئے کہ ایک نوجوان ایسی اعلیٰ نظم لکھ سکتا ہے۔ شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی دونوں اُن کے مداح تھے۔ مولانا شبلی نے تو انھیں ایک طرح سے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ بلقان کی پہلی جنگ نے مولانا کو پالیٹیکس کی طرف راغب کیا۔ برطانیہ کی ریشہ دوانیوں نے انھیں مستقل طور پر انگریز کے خلاف کر دیا ہندوستان آکر انھوں نے انگریز کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرا دیا ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ایک اخبار "الہلال" جاری کیا۔ میں اسے باقاعدہ پڑھتا رہا ہوں۔ اس اخبار کے مضامین نے ہندوستان بھر میں مولانا کی علمیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ یورپ چھڑی۔ اس وقت بھی "الہلال" شائع ہوتا تھا۔ اس کے بے باکانہ اور آزادانہ مضامین کو انگریز سرکار سہن نہ کر سکی۔ اخبار بند کر دیا گیا اور مولانا کو نظر بندی میں ڈال دیا گیا ۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی نے پہلی بار سول نافرمانی کا جھنڈا بلند کیا تو مولانا بھی گرفتار ہوئے۔ انھوں نے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ کی عدالت میں جو بیان دیا وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مضبوط دل گردہ رکھتے تھے۔ مولانا نے اپنے بیان میں کہا کہ "اگر اپنے وطن سے محبت جرم ہے تو میں اس جرم کا مرتکب ہوں۔ یا تو آپ مجھے زیادہ سے زیادہ سزا دیں یا پھر اس کرسی سے اٹھ جائیں جو آپ سے حریت پسندی کے جذبہ کو کچل دینے کا تقاضہ کرتی ہے" مہاتما گاندھی کسی نہ کسی مسلم لیڈر کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا۔ اس کے مشورہ پر عمل کرتے تھے۔ اپنے الفاظ میں وہ کسی نہ کسی مسلم لیڈر کی جیب میں رہتے تھے"۔ پہلے وہ علی برادران کی جیب میں تھے پھر حکیم اجمل خاں کی اور پھر ڈاکٹر انصاری کی۔ ان کی موت کے بعد انھوں نے مولانا آزاد کو اپنا مشیر بنایا اور آخری وقت تک ان کی رائے پر چلتے رہے۔ مولانا بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اتنی خوبیاں شاید ہی کسی ایک ذات میں پائی جائیں۔ وہ ایک زبردست عالم تھے۔ فلاسفر تھے اور مدبر جس کسی میدان کو اپنا لیتے اسی میں چمک اٹھتے۔ حالات نے انھیں پالٹکس میں دھکیل دیا اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ نہ صرف جدوجہد بلکہ قید و بند میں گذرا۔ وہ لگاتار سات سال تک کانگریس کے پردھان رہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔


خوشبویات
PERFUMES
کے لئے
بھارت کا قدیم ترین اور
عظیم تر ادارہ
پی۔ ایم راٹھور اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ
رتلام (مدھیہ پردیش)
خوشبودار تیل
اگربتی۔ مکھ واس زردہ وغیرہ
تیار کرنے والے کارخانوں کیلئے
بڑے پیکنگ میں
سینٹ اور لوڈ
عطر کی طرح استعمال کرنے کیلئے
چھوٹے پیکنگ میں
ہماری مشہور مصنوعات
او ڈی کولون
نائٹ فلاور
کیبسرین
گرین پرفیوم
نیتیئی فلاور
گل بہار
اور متعدد دیگر
بعض نئی مصنوعات
چنبیلی سویٹ
چنبیلی اسٹرانگ
او ڈی موتیا
جیسمین موگرا
بٹ موگرا
اور دیگر متعدد
نئی مصنوعات
:- خیال رہے :-
پی۔ ایم۔ راٹھور اینڈ کمپنی۔ پرائیویٹ لمیٹڈ۔
صرف رتلام میں ہی ہے۔ راجکوٹ یا اور کسی جگہ اس کی کوئی شاخ نہیں ہے!
نقلی مال سے بچنے کیلئے ہمارے ہر ایک مال کے لیبل پر ہمارا نام اور پتہ ضرور دیکھ لیں

ایک مردِ مومن و حق پرست کی مثالی زندگی

عزیز الحسن صدیقی، غازی پوری

ذیل میں جو مقالہ آپ کے پیش نظر ہے وہ کسی قدر طویل ضرور ہے لیکن جس صلاحیت و انہماک کے ساتھ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں مولانا آزادؒ کی سوانح پر تبصرہ کیا ہے، اس کے بعد ترمیم و اختصار کی جرأت، بے معنی ہو کر رہ گئی ہے، اس لئے ہم پورا مضمون ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں، امید کہ اس کی دلکشی و جامعیت سے ناظرین کرام بھی مستفید ہوں گے۔۔ (ادارہ)

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر مدیر محترم روزنامہ الجمعیۃ نے لکھا تھا کہ "دوسرا آزاد پیدا ہو جبھی مولانا آزاد پر کچھ لکھ سکتا ہے" ہم اس خیال سے متفق ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مولانا کی شخصیت اتنی بلند و رفیع ہے اور ان کی سیرت کے اتنے پہلو ہیں کہ ہماشما کا ان کو احاطۂ تحریر میں لانا ناممکن ہے، کوئی ایک خصوصیت ہو تو اس پر قلم اٹھانے کی جرأت بھی کی جائے ـــــ ہمارے ایک کرم فرما نے کہا بھی کہ مولانا پر کچھ لکھو، لیکن اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا احساس اتنے بڑے کام کے لئے آمادہ نہ ہونے دیتا۔ آج مہینوں کے بعد "الجمعیۃ" ہی کے شیخ الاسلام نمبر کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ صفحہ ۳۵ پر یکایک نگاہ آکر جم گئی۔ مولانا عابد الوجدی الحسینی نے اپنے مضمون میں حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کے مقدمۂ مکتوبات شیخ الاسلامؒ جلد دوم کا درج ذیل اقتباس نقل کیا ہے

"کسی صاحب کمالات ہستی کے کمالات و خصوصیات شخصیت، صفات کا تعارف کرانا اہل نظر کا کام ہے۔ لیکن کسی صاحب کمال شخصیت کے متعلق اپنے ذاتی مشاہدات نقوش و تاثرات کے اظہار کے لئے خود صاحب کمال اور صاحب نظر ہونا قطعاً ضروری نہیں ـــ"

انھیں الفاظ نے میری ڈھارس بندھائی اور بے اختیار جی چاہا کہ مولانا کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں، لکھ ڈالوں ـــ مولانا آزادؒ کون تھے اور کیسے تھے، ان کا کردار کیا تھا، کم از کم ہندوستان والوں کو بتلانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مولانا نے اپنی ساری زندگی اسی بدقسمت ملک میں گزار دی، کیوں کہ اس ملک کے باشندوں کی خدمت اور اس ملک میں امن و آزادی کا پرچم لہرانا ان کا بنیادی کام تھا جبکہ

"مولد و منشا و طفولیت "وادی غیر ذی زرع" عند بیت الحرم ہے یعنی مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و کرامۃ۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام کے (تذکرہ صفحہ ۲۸۹)

مولانا کی زندگی خود انھیں کے الفاظ میں ایک "کھلی ہوئی کتاب ہے" ـــ یہ کتاب ہر لکھا پڑھا پڑھ سکتا ہے ـــ یہ کتاب "کتاب بصیرت" ہے، اس لئے ہر ایک اس سے استفادہ کر سکتا ہے، مولانا نے معزز اور خوش حال گھرانے میں جنم لیا، ناز و نعم میں پلے بڑھے اور شاہانہ مزاج پایا، لیکن ہم نے دیکھا کہ ایسے ماحول میں پرورش پایا ہوا انسان "صراط المستقیم" سے نہیں بھٹکا، بلکہ دوسروں کے لئے "خضر راہ" بھی بنا حتی کہ راہِ حق میں دار و رسن کی آزمائش میں بھی پورا اترا۔

مولانا کی بلند شخصیت کی تعمیر قدرت کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اور ان کی قابلیت کسی یونیورسٹی اور کورس کی رہینِ منت ہرگز نہ تھی۔ وہ اپنی خصوصیات کے لئے پوری دنیا میں منفرد تھے، اور آج بھی ان کا ثانی دنیا میں نہیں، مولانا کی ذات مسلمانوں کے لئے، ہندوستان کے لئے، دنیا کے لئے اور بالخصوص ایشیا کے لئے ایک ایسا روشن مینار ہے جو ہمیشہ امن، انسانیت، آزادی اور مساوات کی شاہراہ دکھلاتا رہے گا۔ مولانا کی سیاست کوئی پیچ در پیچ سیاست نہ تھی اور نہ اس میں کہیں پیچ و خم تھا، بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت یا پاکیزہ چیز تھی، ان کا دین اور ان کی سیاست ایک ساتھ منسلک تھے، کیوں کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انھوں نے ایک جید عالم دین اور مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست سیاست داں کا پارٹ ادا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا دین ملکی سیاست اور وطن دوستی کی راہ میں حائل نہیں، بلکہ وہ قوموں کی آزادی اور ملکوں کی ترقی کا ضامن بھی ہے، مولانا کی زندگی کے تمام دور سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ کس دور میں کیسے کیسے انقلابات رونما ہوئے، کیسی کیسی عجیب و غریب شخصیتیں پردہ سیاست پر نمودار ہوئیں کتنی تحریکات سامنے آئیں اور پھر خود بخود ختم ہو کر رہ گئیں، مگر آزاد جس شان کے ساتھ دین و سیاست کی محفل میں آئے، اسی شان کے ساتھ زندگی کے اخیر لمحات تک رونق افروز رہے اور رشک و حسد کی ساری طاقتیں ان سے ان کا یہ مقام نہ چھین سکیں ـــ ان کی شخصیت میں دو متضاد چیزیں (دین و سیاست) اس طرح جمع ہو گئیں تھیں کہ بعض لوگ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے تھے کہ ان کی شخصیت میں کون سی چیز زیادہ نمایاں ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انھیں صرف میدانِ سیاست ہی کا شہسوار سمجھ بیٹھا تھا۔ لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ مولاناؒ نہ صرف مسند نشینِ علم تھے نہ سیاسی شہرت و وقار کے لئے گھٹیا قسم کی لیڈری ان کا شعار تھی، انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک عالم دین مدرسہ و خانقاہ کی رونق ہی نہیں، سیاسی رہنما اور کامیاب ایڈمنسٹریٹر بھی ہو سکتا ہے

مولانا کا علم، قوت اجتہاد، بالغ نظری، فہم و تدبر، سیاست اور ان کی ادبی صلاحیت کا حال ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جنھوں نے کم از کم مولانا کی دو چار تصنیفات ہی کا مطالعہ کر لیا ہے، مولانا کی قابل صد رشک قوت حافظہ، ذہانت، دوسروں کے مافی الضمیر کو سمجھ لینے کی مہارت اور ان کے علمی و تحقیقی ذوق کا اندازہ صرف ان کی ایک کتاب "تذکرہ" ہی سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے بلا کسی خاص کتاب کی مدد کے قلم برداشتہ لکھ ڈالی، نہ اس خیال سے لکھی کہ اسے چھپوانا ہے اور نہ دوسری تصنیفات کی طرح مسودات محفوظ رکھے، بلکہ ایک صاحب کے اصرار پر لکھتے چلے گئے اور نظر ثانی تک کی نوبت نہ آئی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب اس طرح لکھی گئی ہوگی اور لطف تو یہ ہے کہ یہ کتاب نہ صرف تاریخی اعتبار سے وقیع ہے بلکہ ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے ـــــــ پھر قلعہ احمد نگر میں بحالت قید مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے نام جو خطوط لکھے وہ غبار خاطر کی صورت میں ہم تک پہونچے ـ ہم دیکھتے ہیں کہ ان خطوط میں، جو برجستہ لکھے گئے اور نظر ثانی سے بھی محفوظ رہے، انداز بیان، واقعات اور معلومات کے اعتبار سے ان میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آتی اور اس میں جو ادبی اسلوب نظر آتا ہے وہ مولانا کو بے مثال انشاء پرداز کہنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے، مولانا کے خطبات جو سالہا سال قبل لکھے گئے، آج بھی پڑھئے تو ان میں وہی روح موجود ہے جو لکھنے کے وقت موجود تھی اور ان میں وہ کشش ہے کہ قاری دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر انھیں میں کھو جاتا ہے وہ خطبات پڑھ لیجئے تو کبھی ہنس سکتا ہے کبھی آنسو بہاتا ہے اور کبھی آہیں بھرتا ہے، کیونکہ مولانا کے خطبات میں ہنگامہ و دعوت، ماضی کی تلخیاں بھی ہیں، حال کی تباہ کاریاں بھی، اور مستقبل کی تاریکیاں بھی، کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کے "بیانات اور" الہلال و البلاغ" نے مسلمانانِ ہند کو شکوک و شبہات کی بھول بھلیاں سے

نکال کر شاہراہ ترقی پر نہیں لا کھڑا کیا؟ ہم اس حقیقت کے اظہار میں عذر کو راہ نہیں دے سکتے کہ مولانا کی صحافت و خطابت نہ ہوتی تو آزادی کے بے شمار متوالے بھی نہ ہوتے، علمائے امت کے اختلافات کا دائرہ بھی نہ سمٹتا اور نہ مجاہدین کی ایک جماعت حق کے ڈیفنس کے لئے سامنے آتی ــــ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو روشنی ملی تو اسی آزاد کی "شمع فروزاں" سے، ورنہ خدا ہی جانتا ہے کہ اگر اس طبقہ کی اصلاح نہ ہوتی اور کچھ قابل ذکر افراد نہ سدھر گئے ہوتے تو اصلاح کا کام جتنا کچھ بھی ہوا اتنی آسانی سے نہ ہوتا۔ مشر شوکت علی مرحوم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "ابو الکلام نے ہمکو ایمان کا راستہ بتلایا "

فضل الدین احمد صاحب جنھوں نے مولانا آزاد رح کو "تذکرہ" لکھنے پر مجبور کیا اور اس کے مسودات جمع کر کے کامل ذوق و انہماک کے ساتھ شائع بھی کیا، اسی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر اقبال رح کا مذہبی عقائد میں جو پچھلا حال سنا ہے اب ان کے مقابلہ میں ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں " (مقدمہ تذکرہ صف)

اندازہ تو کیجیے کہ مولانا کے کام کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور کس کس نہج پر انھوں نے خدمات انجام دی ہیں مولانا کے کتنے اوصاف بیان کئے جائیں اور کون سی خوبی نظر انداز کر دی جائے، یہ بہت مشکل ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے ــــ مولانا پر لکھنے کے لئے اگر مولانا کی خطابت، صحافت اور سیاست تینوں میں سے کسی ایک ہی عنوان کو لیا جائے اور اس پر لکھنے کے لئے کوئی قلم اٹھائے تو سینکڑوں صفحات سیاہ کر سکتا ہے پھر بھی داستان ادھوری ہی رہے گی۔ ہمیں مولانا کی زندگی میں یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ پوری شان سے جلوہ گر نظر آتی ہیں اور ان کی کتاب زندگی کے یہ تینوں باب اتنے اہم ہیں کہ اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو یہ کتاب نامکمل رہ جائے ــــ مولانا کی خطابت نے کتنے مردہ دلوں کو دھڑکن دی، کتنے مفلوج دماغوں کو غور و فکر سے آشنا کیا اور کتنے عیش پسندوں اور عشرت کدوں میں دادِ عیش دینے والوں کو ملت کی غمخواری کا سبق پڑھایا۔ مولانا کی صحافت نے تعلیم یافتہ طبقہ کو جس طرح سدھارا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ صرف ان کے "الہلال" ہی کے مطالعہ سے کتنے لوگ صاحب سیف و قلم بن گئے، کتنی زبانوں کو طاقت گویائی نصیب ہوئی۔ کتنے کان حق کا کلمہ سننے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور نہ جانے کتنے اہل قلم مولانا کی طرز تحریر اپنا کر آج بھی دنیائے علم و ادب میں چمک رہے ہیں

مولانا کی سیاست

آہ! اس کے بارے میں کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے، جبکہ اس کے سارے خط و خال تمہارے سامنے ہیں، پھر تم اس کی سیاست کی کارفرمائیں دیکھنے سے معذور ہو، کیونکہ تمہاری آنکھوں پر غفلت و تعصب کے تو بر تو پردے ڈال دیئے گئے ہیں اور تمہارے ہاتھوں میں وہ طاقت ہی نہیں رہی کہ تم انھیں نوچ کر پھینک دو، شاید آنے والا دور تمھیں مولانا کی سیاست کے مبادیات سمجھا سکے ــــــ ..... ہاں۔ اگر تم غفلت و نامرادی سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہو تو آؤ ہم تمھیں بتلائیں کہ ہمارے آزاد کی سیاست کیا ہے اور اس کے خد و خال کیا ہیں

دعوت الہلال

مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کے ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا۔

"ـــ آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ علماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں ابھی ۱۹۱۱ء سے ... واسفا علی یوسف کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لئے میں نے الہلال ... کو کبھی اپنے چشم خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سواد ... دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیئے ہیں ... خدائی کوئی صبح ... یہ ... [illegible] ... کی طلب ... بہادل خان ... اور کوئی شام

مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بیقراریاں کی کروٹیں نہ بدلی ہوں "

کیا مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ان کے افکار و عزائم کی نشان دہی نہیں کرتے اور کیا ان خیالات کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں؟ ماننا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ خطبہ تنظیم و استحکام جماعت پر زور دیتا ہے اور مذکورہ بالا الفاظ تو اس خطبہ کی جان ہیں ــــ

نظریہ متحدہ قومیت

ماضی میں اس نظریہ پر اس قدر کلام کیا جا چکا ہے کہ اب اس پر مزید روشنی ڈالنا تضیع اوقات ہی سمجھا جائے گا مگر مشکل یہ ہے کہ آج تک اس نظریہ کو اس کے صحیح روپ میں دیکھا ہی نہیں گیا اور اچھے خاصے علماء افراد تفریط کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے اور

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس نظریہ کی وضاحت کے سلسلہ میں اجلاس کانگریس منعقدہ رام گڑھ میں ۱۹۴۰ء میں مولانا نے فرمایا تھا کہ

" میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے ــــ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوینی (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔

کوئی ناعاقبت اندیش مولانا کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ کی محض اس لئے مخالفت کر سکتا ہے کہ یہ مولانا آزاد کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، لیکن آپ پاکستان میں اس نظریہ کی ترویج اور دستور کی تدوین کو کس چیز سے تعبیر کریں گے؟ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے جب فرمایا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں " تو اقبال مرحوم نے شدید تنقید ہی نہیں ان کی تذلیل بھی کی تھی اور اس خیال کی تردید میں بہت آگے نکل گئے تھے، کاش مرحوم آج حیات ہوتے اور اس نظریہ کی بنیاد پر (اپنے) پاکستان کے دستور کی تدوین کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انھیں یقین آ جاتا کہ شیخ وقت اور امام ہند کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نقش بر آب یا پا در ہوا نہیں تھے، بلکہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کو دنیا نے تسلیم کر لیا۔

اکثریت

اکثریت کے خوف نے مسلمانوں کو جتنا پریشان کیا، اتنا شاید ہی کسی چیز نے انھیں متاثر کیا ہو اور یہی ایک ایسا ڈراؤنا خواب تھا جس نے اس قوم کی نیند حرام کر دی، عافیت کی دولت چھین لی اور اس روگ نے گھن کی طرح ملت کو چاٹ لیا، حالاں کہ اس کا یہ خوف غلط تھا اور ہے۔ ان کے اس خوف بے معنی پر کتاب و سنت ماتم کناں ہیں ــــ کاش کہ آج بھی کوئی خدا کا بندہ ملت اسلامیہ میں آزاد کے اس پیغام کی روح کو سمجھنے کی استعداد پیدا کر دیتا جو انھوں نے بار بار سنایا

مگر افسوس کہ سننے والوں نے سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ تمسخر کے لئے سنا، بھلانے کے لئے سنا، دیکھئے اکثریت کے خوف سے مولانا کس انداز میں ہمیں بچلا رہے ہیں۔

"ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لئے دل سے نکال دیجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شئے قوموں کی معنوی قوت ہے جو اس کے اخلاق اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیۃ الٰہی اور اعمال حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔" (خطبات آزاد: صفحہ ۳۱۱)

صدائے دعوت

مولانا نے اپنی زندگی ایک سیدھے راستہ پر چل کر گذار دی اور ان کی یہی خواہش تھی کہ جس راستہ کو اپنی ذات کے لئے مفید سمجھتے تھے اسی پر باقی مسلمان چلیں اور بالآخر منزل فوز و فلاح تک پہونچیں لیکن جو قوم جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہو چکی ہو اسے خواب گراں سے کب فرصت ہے کہ وہ کسی حق گو کے پیچھے چل سکے؟ مولانا نے جو صحیح سمجھا اس کی طرف دعوت دی اور جس چیز کو غلط سمجھا اس سے بچنے کی تلقین کی۔ گویا ایک حقیقی معالج کا فرض ادا کیا۔ یہ نہیں کیا کہ مریض کی بے اعتدالی سے آنکھ بچالی یا مرض کی تشخیص غلط کی، یا تشخیص تو ٹھیک کی، مگر دوا غلط تجویز کر دی۔ بلکہ دنیا کے عروج و زوال کی تاریخ کو سامنے رکھ کر اپنے وسیع علم و تجربہ کی بنیاد پر ایک لائحہ عمل مرتب کیا۔ اور اپنے ضمیر کی آواز کو دبائے بغیر جو کچھ محسوس کیا، بلا کم و کاست صاف صاف کہہ دیا اور سچ پوچھو تو مولانا کا یہی جرم ہے جس نے قوم کی بارگاہ سے انھیں کبھی کافر کا خطاب دلوایا اور کبھی ہندوؤں کا زر خرید ٹھہرایا۔ مولانا نے اگر گناہ کیا ہے تو یہ کیا کہ حق کا گلا نہیں گھونٹا اور ظلم و ناانصافی سے کبھی جوڑ نہیں کیا۔۔۔ نہیں خوشی ہے کہ مولانا مرحوم نے ہمیں ظن و گمان اور خوش خیالیوں کی اندھیری دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچا لیا۔ ذرا دل کی کھڑکی کھول کر اور دماغ سے نفرت و بغض کے سنتری ہٹا کر سنو تو سہی کہ مولانا کس کرب و الم کے تڑپ تڑپ کر ہمیں سنا رہے ہیں

"تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی راہیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں لیکن میری طرف تو دیکھو! میں ایک انسان تم میں ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا اور ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر پکار رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہے۔۔۔ ولکن لا تحبون الناصحین افسوس! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں استقامت ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیزی کے ساتھ دوڑ کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لئے تم رو رہے ہو یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانہ میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلی تھیں، مگر تمہارے سینہ کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، یہ سب ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں"

مصنف کا تحفہ میں بودی ملت اسلامیہ کی تصویر اتاری ہے اور یہ ایک ایک لفظ اس ملت کی بد اعمالیوں سے ماہ روپوں کا شکی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کسی گم کردہ راہ فرقہ کے بارے میں اس سے زیادہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

نمود و نمائش سے نفرت

مولانا کی طبیعت اور مزاج میں ابتداء ہی سے متانت و سنجیدگی اور شور و غوغا کا کبھی مادہ نہیں تھا۔ انھوں نے نمود کی دنیا کبھی نہیں بسائی۔ بلکہ وہ ہمیشہ نمود و نمائش سے متنفر رہے۔ یہاں تک کہ ایک بار رانچی کی قید سے رہائی کے بعد انھیں صاف صاف یہ اعلان کرنا پڑا۔

"خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کن کاموں میں بسر ہوتی ہیں اور اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں لیکن تمہاری بھیڑ اور دھوم میں بھی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے، جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے اسٹیشنوں پر اتار دو اور ایسے پر جوش نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں متمدن قوموں کی طرح جھنڈیاں ہوں اور پھر تم اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے، مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، افسوس تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے وطن میں ایک بے یار و ناآشنا غریب الوطن ہوں"

کیا غضب کی بات کہہ گئے مولانا۔۔۔ "اس پورے وطن میں بے یار و ناآشنا غریب الوطن ہوں" یہ جملہ چند الفاظ کا مجموعہ نہ تھا، بلکہ یہ ایک بجلی تھی جو ہم پر گرائی گئی تھی، مگر افسوس کہ ہم اب بھی نہ چونکے۔۔۔ .... غور فرمائیے کون لیڈر ہے جو ان چیزوں کا کسی درجہ میں بھی خواہش مند نہیں جن سے مولانا بیزاری ظاہر فرما رہے ہیں، انھیں نہ پھول مالاؤں کی ضرورت ہے، نہ یہ تمنا کہ ہزاروں انسانوں کا ہجوم ان کے گرد اکٹھا ہو کر زندہ باد کے فلک شگاف اور زمین دوز نعرے بلند کرے اور پھر یہ نعرے فضا میں تحلیل ہو کر رہ جائیں، یا سوڈا واٹر والا معاملہ پیش آ جائے، وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ عوام کی خواہشات اور عوام کی منشا پر چلیں، وہ چاہتے تھے کہ عوام ان کے پیچھے چلیں تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے۔

دشمن دوست

جب انھیں حق گوئی اور بے باکی کے آئین پر عمل کرنے کا صلہ گالیوں بدتہذیبی اور شرافت سے گری ہوئی حرکات سے دیا گیا تو ان کا حساس قلب بے چین ہو گیا اور کتنے انسانوں کو بے چین کر دیا۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ اس دشمنی کو نبھایا کس شان سے جا رہا ہے۔۔۔ فرماتے ہیں "جب تک کوئی ہمارا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست نہیں بن سکتا" یقین کیجئے کہ اسی ایک جملے میں مولانا نے اپنے ہم مذہبوں کی جفا کیشیوں کا پورا مرقع پیش کر دیا ہے۔ ابو سعید بزمی نے اپنی کتاب "مولانا آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں" لکھا تھا کہ آج مسلمان مولانا کو نہیں پہچانتے، وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے ہیں، فرانس کی جون آف آرک کی طرح اگر آج مسلمان ان کی توہین و تذلیل کرتے ہیں تو مقام حیرت نہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ شاید شو بوائے کی پھبتی کس کر یا مولانا ہا ہا کا فقرہ چست کر کے ہم انھیں دبا سکتے ہیں، مگر کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کی مخالفت ایک "عبقری جوہر" کو اپنے عزم و ارادہ میں اور زیادہ پختہ کر دیتی ہے" صفحہ ۱۱

کتنا بڑا ظلم ہے مولانا کی شخصیت پر کہ انھیں "شو بوائے" کہا گیا اور مولانا کی شرافت نفس کا کتنا اونچا مظاہرہ ہے کہ مولانا نے اس سیاسی گالی کا جواب خاموشی اور برداشت سے دیا۔ گالی کا جواب گالی ہے اور اس سے گندی گالی سے دیا جا سکتا ہے۔ مگر گالی سن کر ٹال جانا جتنی اونچی بات ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، ذرا انصاف تو فرمائیے کہ اس شو بوائے نے ۱۹۳۷ء کے بعد کے ہندوستان میں بھی دس برس تک ان بدقسمت انسانوں کی رہنمائی کی، جنھوں نے اس کی رہنمائی کو رہزنی سمجھا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ رہنمائی کا جو معیار غلط کاروں نے بنایا تھا، وہ اس کے نزدیک ناقابل عمل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ وزارت کے عہدے پر فائز تھا اور تم اس کو جلسوں میں، اسٹیج پر اور سڑکوں پر جلوس میں نہیں دیکھتے تھے، لیکن پتہ سچ بتاؤ کہ اس نے کب ان ذرائع کو اپنایا تھا جو تم اس کی توقع کرتے تھے۔ اعتراف ہے کہ وہ تمہارے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا تھا، لیکن ایمان داری کے ساتھ بولو کیا اس عرصہ میں اس نے تمہارے کسی شہرازہ کو منتشر کیا یا اکٹھا کیا، تمہارا کون سا ایسا معاملہ تھا، جس میں اس نے تمھیں صحیح مشورہ نہیں دیا، تم جانتے ہیں کہ وہ تم سے دور سرکاری کوٹھی میں رہتا تھا، مگر تم یقین کرو کہ اس کا دل [illegible]

ساتھ تمہاری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تھا، مگر تم تھے کہ حقائق سے بے پروا ہو کر ان کے خلوص و محبت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ تمھیں شکوہ ہے کہ مولانا بولتے نہیں تھے، لیکن تمھیں کون یقین دلائے کہ ان کی ایک خاموشی پر ہزار تقریریں قربان کی جا سکتی ہیں ـــ ہم مان لیتے ہیں کہ انھوں نے حالات کے تحت خاموشی اختیار کر لی تھی، لیکن ان کا یہ سکوت بے معنی نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان کی خطابت زنگ آلود ہو گئی تھی کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ۱۹۵۸ء میں جب پارلیمنٹ میں ان کی وزارت کے بجٹ پر سیٹھ گوند داس اور پرشوتم داس ٹنڈن کی طرف سے اعتراضات کیے گئے تو انھوں نے اسی شان اور اسی طرز استدلال کے ساتھ ان کے اعتراضات کی قلعی کھول کر رکھ دی اور اپنی اس تقریر میں وہ انداز خطابت اختیار کیا کہ پورا ایوان پارلیمنٹ مولانا کا حامی بن گیا۔ اس تقریر میں اردو کے بارے میں وہ سب کچھ مولانا نے کہا جو کہنا چاہیے تھا۔ پر فریب تخیل کی ترکیب جس کے متعلق مشہور ہے کہ الاجی ایڈیٹر ہریجن نے کہا تھا کہ اگر ٹنڈن جی اینڈ کو مولانا کو نہ چھیڑتے، تو اردو زبان کو ایسی عمدہ ترکیب نہ ملتی، آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

مولانا کی گرج

بہر حال مولانا نے شروع سے آخر تک اپنی کل زندگی اس ملک کے عوام کی آزادی اور مسلمانوں کی فکری صلاحیتوں کے ابھارنے اور آنے والے دور میں اپنی زندگی کو بہتر طریقے پر گزارنے کا گر بتلانے پر صرف کر دی اور اس معرکہ میں اپنی عزیز ترین متاع لٹا ڈالی، اپنی جوانی، اپنا بڑھاپا، اپنا دل، اپنا دماغ سب کچھ ہمارے لئے تج دیا ـــــ اپنی خطابت جس کی مست کن کیفیتوں کے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ "الفاظ پیغمبر کا جامہ پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔" اپنا اسلوب بیان اور انشا پردازی جس کے متعلق شورش کاشمیری کو اعتراف کرنا پڑا کہ "یہ ولولہ، یہ ترنگ، یہ نشہ، یہ جوش، فرشتوں کا یہ خیر مقدم، یہ سرور، یہ بے خوفی، استقامت، قلم و زبان کی جسارت اور بے نیازی کے کوہ وقار حوصلے، یہ سب کچھ جو انھوں نے حاصل کیا ہے ابوالکلام کے طرز بیان کا عطیہ ہے" یہ سب کچھ قربان کر دیا لیکن جب ہم نے ان سب چیزوں کو ٹھکرایا اور اس عظیم رہنما کی تکذیب و تذلیل کو اپنا قومی شعار بنا لیا اور اس کی ہر بات کی نفی کی تو وہ بیقراری کے ساتھ چیخ چیخ کر تڑپ تڑپ کر ہم سے خطاب کرنے لگا۔

"آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت مل جاتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کہ اب تمہارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے! پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات اور زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے ـــ"

آہ! صد آہ! کہ ہم نے سوتے رہنے کا تہیہ کر لیا تھا، اس لئے ابوالکلام رح کی گرج ہمیں نہ جگا سکی۔ حسین احمد مدنی رح کی دعوت حق ہمارے بگڑے ہوئے مزاج کو نہ اپیل کر سکی اور نہ ہی ہوا جو مقدر ہو چکا تھا اور جو کچھ ان بزرگوں نے کہہ دیا تھا، وہ عالم تھے اس لئے نائب رسول تھے اور نیابت کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی مبارک زندگی ان کے سامنے ہو۔ رسول کا عمل ان کے پیش نظر ہو اور اسی کی تبلیغ میں وہ اپنی زندگی صرف کر دیں۔ نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم محسن انسانیت تھے، اس لئے ان نائبین رسول نے بھی انسانیت ہی کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیا اور محدود دائروں میں رہنا پسند نہ کیا، اور ان کا یہی گناہ تھا جس نے قوم کی نگاہ میں انھیں معتوب و مغضوب ٹھیرایا، لیکن خدا گواہ کہ ان کا یہی گناہ ہمارے انکے اور سب کے خدا کے نزدیک سب سے بڑا اجر اور سب سے بڑا ثواب ہے۔

ترجمان

ایک مختصر سی صحبت میں ایک صاحب مولانا سے الجھ رہے تھے لیکن جب بحث میں بس نہ چلا تو بولے "کراچی صورت میں ہندوستانی جملہ بڑا سخت تھا جو دوسرے سننے والوں کو بھی ناگوار گزرا۔ مگر مولانا کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ پڑی بڑی خوش مذاقی کے ساتھ برجستہ بولے:۔

"ـــ سچ کہتے ہیں آپ۔ میں خود بھی اپنے کو مسلمانوں کا نہیں اسلام کا ترجمان سمجھتا ہوں۔ ـــ"

(مولانا آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں صـ۸۲)

مولانا کا مسلک

ملاحظہ فرمایئے، مولانا نے اپنے مزاج اور انداز کو ان چند جملوں میں کس خوبی کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔

"ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی شورش یا شمع کی خاموشی و سوزش، اور تجربہ کاران طریق جانتے ہیں کہ دوسری راہ پہلی سے کہیں زیادہ نازک اور کٹھن ہے۔ اس میں بے قیدی و بے وضعی کی آزادی ہے۔ اس میں ضبط و انضباط کی پابندی اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑک اٹھنا آسان ہے، مگر تنور کی طرح اندر اندر ہی سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔" (تذکرہ صـ۳)

مولانا نے شعلہ اور تنور کی مثال دے کر اپنا سارا راز کھول کر رکھ دیا ہے۔ مولانا بھڑکے نہیں، سلگتے رہے، سلگتے رہے، یہاں تک کہ ان کی صحت جس کے متعلق غبار خاطر میں بار بار کہہ رہے ہیں کہ

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے

ان سے روٹھ گئی اور آخری لمحات تک وہ اس سرمایہ سے محروم ہی رہے۔ صحت کی بات نکلی تو سن لیجئے کہ زیادہ دن نہیں گذرے، جب ہمارے ملک میں جدید حد بندی ہوئی اور ملک کا نیا نقشہ بنا گویا کہ ایک انقلاب آیا تو اس سلسلہ میں مولانا نے اتنے انہماک اور تندہی کے ساتھ کام کیا کہ اس کے پایہ تکمیل تک پہونچنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکا کہ مولانا کی صحت کو کس قدر نقصان پہونچا، بلڈ پریشر میں اضافہ ہوا اور وزن گھٹ گیا۔ کیا آپ ذہن پر زور دے کر بتلا سکتے ہیں کہ کسی وزیر یا سفیر کے متعلق اس قسم کی خبر پہلے بھی سنی تھی؟

کہاں تک مرد آزاد کے اوصاف و محامد بیان کئے جائیں اور ہماری تنگ دامانی کب ان چیزوں کو سمیٹ سکتی ہے؟

آخری پیغام

مولانا نے ہمیشہ ہماری رہنمائی فرمائی حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے بحرانی دور میں جبکہ قدرت کے انتقام کا بگل بج چکا تھا اور ملک کے طول و عرض میں آگ اور خون کا بیوپار ہو رہا تھا، مسلمان سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ عین اسی عالم میں مولانا دہلی کی شاہجہانی مسجد میں ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ کہ

"جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا، اسی طرح آج تمھارا خوف و ہراس بے جا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے، نہ کوئی ڈرا سکتا ہے، چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عجیب بات نہیں ـــ یہ دیکھو کہ دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے، ابھی تک دل تمھارے پاس ہیں تو ان کو اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے رسول امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معرفت فرمایا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

جنھوں نے کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر اس پر جم گئے، تو ان کو نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔"

عزیز! ان تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

اور پھر ہندی مسلمان کے قدم اس سرزمین پر جم گئے اور ایسے جمے کہ فرقہ داریت کے کتنے ہی زلزلے بھی آج تک اس میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔

مولانا آزادؔ نے مسئلہ قومیت، اکثریت و اقلیت، اسلام، مسلمان، اردو غرضکہ جتنے عنوانات ہوسکتے ہیں ان سب پر ہزاروں صفحات لکھ ڈالے ہیں اور جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے اور زمانہ کی کوئی گردش ان نقوش کو مٹا نہیں سکتی، ہاں خطرہ اگر ہے تو یہ کہ ہم اپنے ذہن سے انہیں کہیں محو نہ کردیں، زمانہ آئے گا کہ ہم تہیدستانِ قسمت مولانا مرحوم کی کتاب زندگی کے اوراق پلٹ پلٹ کر دیکھیں گے اور اپنی حرماں نصیبی پر ماتم کریں گے لیکن افسوس کہ یہ ماتم ہمارے درد کا درماں نہ بن سکے گا اور ہمارے ان آنسوؤں کی قیمت مگرمچھ کے آنسوؤں سے زیادہ نہ ہوگی۔ اتہام و الزام کا دور نامسعود ختم ہوا اور جانے والا جا چکا —— اب ہمارے لئے ذلت و نامرادی اور غم و یاس کے سوا رہ بھی کیا گیا ہے؟

مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے اور طویل اقتباسات بھی صفحات پر صفحات گھیرتے چلے جا رہے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ

بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جن لوگوں کو اکابر سے خدا واسطہ کا بیر ہوتا ہے انہیں دلائل و براہین مطمئن نہیں کرسکتے اور جن دلوں میں خدا کا خوف جاگزیں ہوتا ہے وہ ضرور اصلاح پذیر ہوتے ہیں۔ صرف غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے مولانا سے متعلق بعض اہم باتیں ہم گوش گذار کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں

مذہبی زندگی

بعض بزرگوں کو مولانا کی مذہبی زندگی مشکوک سی نظر آتی ہے اور وہ ان کو ایک غیر مذہبی انسان ہمیشہ تصور کرتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایک زبردست موحد، حق گو اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے کٹر مذہبی انسان تھے، البتہ مکر و ریا، ظاہر داری اور تصنع سے پاک تھے اور اپنے گرد و پیش تقویٰ و بزرگی کا مصنوعی ماحول پیدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا فرماتے ہیں "جو کچھ پایا ہے، صرف بارگاہ عشق سے پایا ہے جتنی رہنمائیاں ملی ہیں صرف اسی مرشد فیض و ہادیٔ طریق سے"، یہاں مرشدِ فیض اور ہادیٔ طریق خداوند عالم کو کہا گیا ہے —— غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا یہاں کیا کہنا چاہتے ہیں۔

تذکرہ صد ۳۱۱ پر مولانا یوں رقمطراز ہیں:۔

"اسی اثنا میں (قیام رانچی ۱۹۱۶ء) میں رمضان المبارک کے برکات و نعائم کا ورود ہوا۔ اگرچہ نماز جماعت کی کیفیت انجمن طرازی اور جماعت تراویح و سماع، تلاوت کی لذتِ دل نوازی سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محرومی رہی اور اس لئے ابتدا کے دو چار دن یک گونہ انقباض و دل گرفتگی میں بسر ہوئے لیکن اس کے بعد ہی مقام خلوت کی کیفیتوں اور انجمن و خلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ دنیا جہان کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پروا ہوگیا۔ علی الخصوص عشرۂ اخیر کی شبہائے تمنا اور رندہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دلنشینیاں لوٹیں، نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کرسکتی ہے نہ سامعہ استعداد سماع رکھتا ہے، البتہ حسرت دل کی [illegible]

کاش پوری زندگی کی وسعت کسی طرح ان دس راتوں میں آجاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر ہو جاتی ..."

میں نے اتنی طویل عبارت اس لئے نقل کی ہے کہ ہمارا دعویٰ بے دلیل نہ رہ جائے اور آپ اندازہ کرسکیں کہ یہ باتیں کون کہہ سکتا ہے، کوئی دین و شریعت سے بے پروا بے گانہ یا دین کی راہ پر چلنے والا؟ خط کشیدہ الفاظ پر خاص طور پر غور کیجئے اور بتلایئے کہ ان باتوں کی تمنا کون کرسکتا ہے؟ تراویح و سماع تلاوت کی لذتِ دل نواز سے محرومی پر افسوس اور دل گرفتگی اسی کو ہوسکتی ہے جو پابند جماعت ہو اور پھر مقام خلوت کی کیفیتوں کے مقابلہ میں انجمنوں اور صحبتوں سے بے پروائی بھی اسی کو ہوسکتی ہے جس کے دل میں عشق خداوندی اور خشیتہ الٰہی نے جگہ بنائی ہو۔

مولانا اور تصویر کشی

مولانا کی ذات پر ایک بڑا الزام اور ہے، وہ یہ کہ مولانا تصویر کھنچواتے ہیں، یا کوئی ان کی تصویر لیتا ہے تو نظر انداز کر جاتے ہیں ——

کاش ان معترضین اور معاندین کو ذرا بھی تحقیق و تفتیش کی توفیق ہوتی تو پتہ چلتا کہ مولانا کا نظریہ اس باب میں کیا ہے، فضل الدین احمد صاحب مرتب تذکرہ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

"موجودہ زمانہ میں کسی شخص کی سوانح عمری کا بغیر فوٹو کے شائع کرنا ایک ایسی بدمذاقی ہے جس کو کوئی خوش مذاق آدمی گوارا نہیں کرسکتا، علاوہ بریں مولانا کے ہزاروں ارادت مند ہیں، جن کو بڑی مایوسی ہوتی، اگر کتاب ان کے فوٹو سے خالی ہوتی، اس لئے میں نے کوشش کی کہ مولانا کا فوٹو حاصل کرکے درج تذکرہ کردوں، مجھے معلوم ہے کہ انہوں (مولانا آزاد مرحوم) نے اپنی تصویری اشاعت کی ہمیشہ مخالفت کی "الہلال" میں دنیا جہان کی تصویریں نکلتی رہیں، مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی انہوں نے اپنا فوٹو نہیں شائع کیا، اخبار "جمہور" کلکتہ میں ان کے فوٹو کا اعلان شائع ہوا تو اس پر وہ سخت برہم ہوئے، پھر مجھے لکھا کہ جس قدر کاپیاں تیار کی گئی ہوں، میری طرف سے خرید کر کے رکھ لو اور شائع نہ ہونے دو، جب میں نے تصویر کی نسبت کہا، تو انہوں نے لکھا کہ تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا، سب ناجائز ہے —— یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی اور "الہلال" کو باتصویر نکالا، میں اب تائب ہوچکا ہوں، میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہئے نہ کہ ازسرنو تشہیر کرنی چاہئے۔"

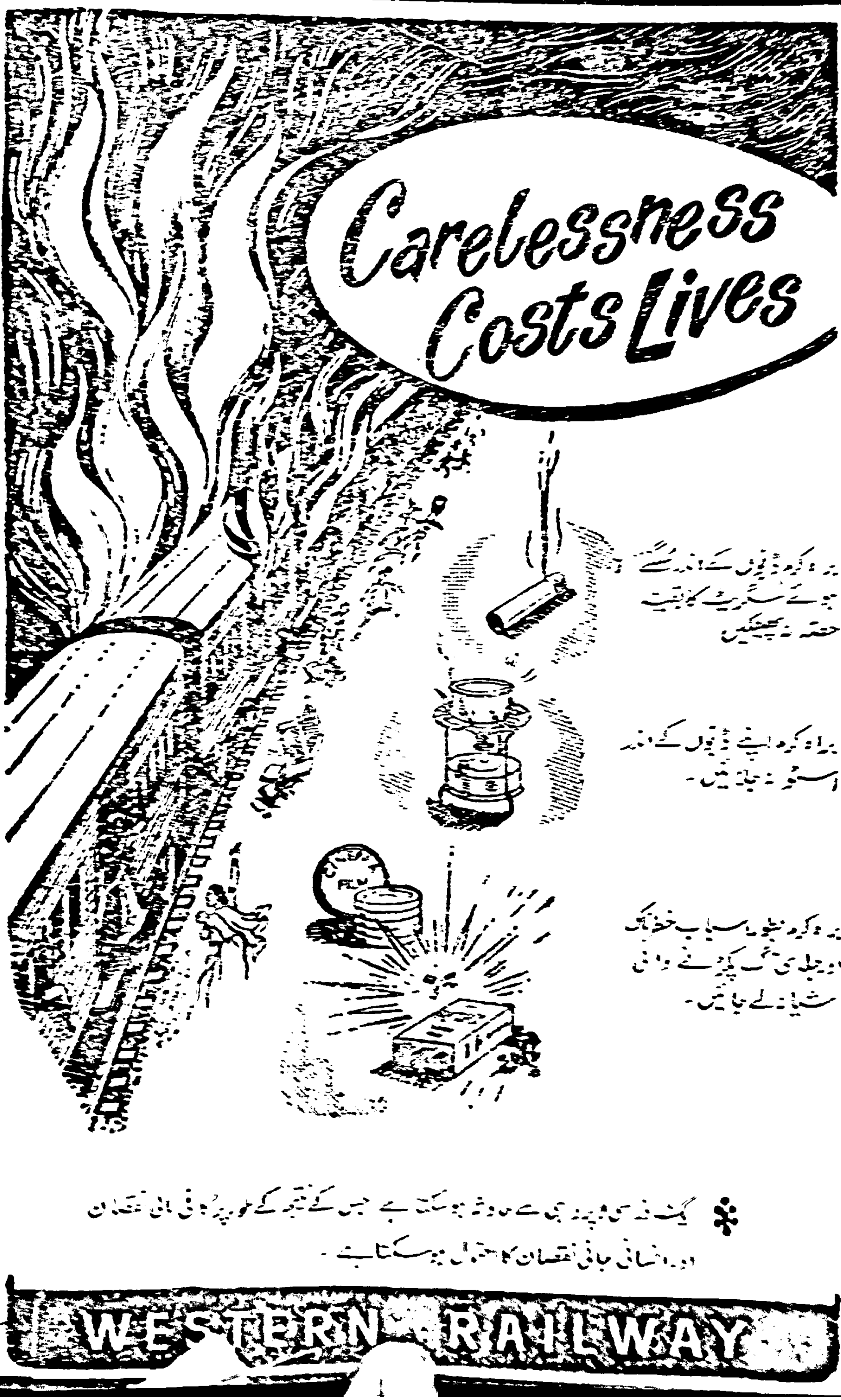
اس کے بعد مرتب موصوف لکھتے ہیں کہ "بہرحال میں مولانا کے اس حکم کی تعمیل نہ کرسکا اور کتاب کے ساتھ ان کا فوٹو شائع کر رہا ہوں، یہ فوٹو رانچی میں لیا گیا ہے اور مولانا کی براءت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ کم از کم اس کے کھنچوانے میں مولانا کے ارادہ کو کچھ دخل نہ تھا، وہ بالکل مجبور تھے ——"

لطف یہ کہ مولانا "تذکرہ" کی اشاعت کے ہی مخالف تھے، ورنہ ان کے سامنے اس کی کمپوز شدہ کاپی آتی، تو یہ تصویر کبھی بھی منظر عام پر نہ آتی۔

یہ داستان خوں نابہ فشاں ختم کرتے ہوئے خدا سے یہی دعا ہے کہ مولانا آزاد مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہمیں چلنے کی توفیق دے۔ آمین

غمگین سب کو کرکے خوش خوش گئے جہاں سے
آزاد ہوگئے اس دنیا کے بندِ غم سے

۱۳ ھ ۷۷


Carelessness
Costs Lives
براہ کرم ڈبوں کے اندر جلتے
ہوئے سگریٹ کا بقیہ
حصہ نہ پھینکیں
براہ کرم اپنے ڈبوں کے اندر
اسٹوو نہ جلائیں۔
براہ کرم خطرناک
اور جلدی آگ پکڑنے والی
اشیاء نہ لے جائیں۔
ذرا سی لاپرواہی سے حادثہ ہو سکتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر مالی نقصان
اور انسانی جانی نقصان کا احتمال ہو سکتا ہے۔
WESTERN RAILWAY